مجلہ عثمانیہ

طلبۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مہتمم مدیر و مدیر حصۂ اردو

سید اشفاق حسین

متعلم ام۔ اے

شریک مدیر

محمد شہاب الدین

متعلم ام۔ اے

مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

مجلس انتظامی

جلد (۱۰) — سال تعلیمی سنہ ۱۳۴۶ف — شمارہ ۱-اور ۲

(صدر)

قاضی محمد حسین صاحب

ام۔اے ال ال۔بی (کینٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصہ اُردو)

مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے
پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام۔اے پی۔ایچ۔ڈی (لندن)
مددگار پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصہ انگریزی)

مسٹر ای۔ ای۔ اسپیٹ بی۔اے (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی حمید الرحمان صاحب بی ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

سید اشفاق حسین بی۔اے (عثمانیہ) مہتمم مدیر و مدیر حصہ اُردو مجلہ عثمانیہ

(اراکین)

مرزا ظفر الحسن صدر انجمن اتحاد — سید محمد احسن مدیر حصہ انگریزی

محمد شہاب الدین شریک مدیر حصہ اُردو — آر۔ جی۔ نند پورکر نائب مدیر حصہ انگریزی

مجلہ عثمانیہ

جلد ۱۰ شمارہ (۱) اور (۲)

چندہ سالانہ پیشگی

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ	عـہ۱۲ روپیہ
(۲) ارباب جامعہ، اصحاب مقتدر اور اداروں سے	شہ ر ؍؍
(۳) عام خریداروں سے	۶ لـہ ر ؍؍
(۴) طلبائے قدیم، رفاہیہ انجمنوں اور دارالمطالعوں سے	ھہ ر ؍؍
(۵) طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	للعہ ر ؍؍
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ ؍؍
(۸) فی رسالہ	۲ عـا ر روپیہ

ملنے کا پتہ

دفتر مجلہ عثمانیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین مجلّہ عثمانیہ

جلد ۱۰ شمارہ ۱ - اور (۲)

نطقِ ہمایونی



لفٹننٹ جنرل ہزاکزالٹیڈ ہائینس، رستم دوران، ارسطوے زمان، سپہ سالار،
آصفجاہ، مظفرالملک والممالک، نظام الملک، نظام الدولہ، نواب سرمیر عثمان علی خان
بہادر، فتح جنگ، سلطان العلوم، جی، سی، ایس، آئی۔ جی، بی، اِی،
یار وفادار سلطنت برطانیہ، نظام حیدر آباد و برار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیام منجانب آصفجاہ سابع ساعی خدمت خلق

بنام

باشندگان وخیر طلبان سلطنت آصفیہ

آج کا دن میں اپنے حق میں مبارک و مسعود خیال کرتا ہوں کہ الحمد للہ والمنۃ از روئے سنہ ۱۸۸۶ع میں اپنی عمر کے (۵۰) منازل طے کرچکا ہوں جس میں سے کامل (۲۵) سال میرے دور حکومت کے بہتم باشان واقع ہوئے ہیں اور اس عرصہ مدت میں، میں نے اپنے فرائض منصبی کو جو کہ ایک والئی ملک سے تعلق رکھتے ہیں اپنی بساط کے موافق انجام دیا ہے۔ چنانچہ جو مسرت و بہجت اس سلسلہ میں ہر طرف دکھائی دے رہی ہے یہ خاص اُسی کا سبب ہے۔ دوسری طرف میری عزیز رعایا و برایا نے اس خاص مدت میں جو غیر متزلزل طریقہ پر بہی خواہی وخیر سگالی کا ثبوت دیا ہے وہ بلا شک آپ اپنی نظیر ہے جس کو نہ میں صرف قدر کی نظر سے دیکھتا ہوں بلکہ تمام عمر فراموش نہیں کرسکتا۔ اَللّٰھم زِد فزِد۔

الحال درگاہ مجیب الدعوات سے ملتجی ہوں کہ وہ جب تک اس بارگراں کو میرے کمزور دوش پر رکھنا پسند کرے گا تو اس کے ساتھ ہی مجھ کو اس کا متحمل بنانے میں فراخدلی سے بھی کام لیتا رہے گا تاکہ میں مخلوق خدا کی خدمت کا حقہ ادا کرکے اپنے بعد اپنے ملک و خاندان کے لئے ایسی یادگار چھوڑ جاؤں جو کہ میرے آیندہ آنے والی نسلوں کے لئے باعث صد فخر و نازش و قابل تقلید بن سکے۔

زیادہ ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم والسلام علیکم بالمجد والتکریم

یکم ذیحجہ ۱۳۵۵ھ

شرحہ تخط مبارک اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہم العالی



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جواب اڈریس سرکار دام ظلہ

جس کو کہ مہاراجہ ستر یمین السلطنتہ نے عام رعایا کی طرف سے پڑھا تھا

بمقام جوبلی ہال یکم ذی حجہ

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر کرتا ہوں کہ میری تخت نشینی کے پچیس سال جو ختم ہوئے ہیں تو اس مدت میں مجھے اپنی عزیز رعایا کی فلاح و بہبود میں کوشاں رہنے کی توفیق بخشی گئی لہٰذا میں حضار محفل کو یقین دلاتا ہوں کہ میری بقیہ زندگی اپنی عزیز رعایا کی آسائش کے لئے وقف ہے اور خادم خلق اللہ ہونا میرا سب بڑا طرۂ امتیاز ہے اور از منہ گذشتہ سے میرے خانوادہ کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ رئیس وقت اپنی رعایا کا دل سے خیر خواہ اور بلا تخصیص قوم و ملت ان کی فلاح و بہبودی کو اپنی زندگی کا بہترین مقصد سمجھنے والا ہوتا ہے۔ میں بھی اپنے آبائی نقش قدم پر گامزن ہوں اور اگر میرے زمانہ میں ترقی کی رفتار مقابلتاً کچھ تیز رہی ہے تو یہ بھی خدا کا

فضل ہے اور مجھے اگر تھوڑی بہت خدمت ملک کی حاصل ہوئی ہے تو اس کا سب سے بہتر صلہ میری رعایا کی قناعت اور خوش حالی ہے اور مجھ کو کسی بات سے اتنی دلی مسرت اور خوشی حاصل نہیں ہوسکتی جتنی یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ آج کے دن سپاسنامے اور تہنیت نامے پیش کرنے میں میری رعایا کے ہر طبقہ کے لوگ بلا استثنار مذہب وملت اور بغیر امتیاز شریک ہیں۔ یہ وہ نعمت ہے جو ہر ایک فرمانروا کو کم نصیب ہوتی ہے۔

اب میں اپنی عزیز رعایا کے اڈریس کا جواب دیتا ہوں۔

فوج کی کارگذاری اور میرے عساکر کا جدید اسلحہ سے مسلح اور باقاعدہ تربیت یافتہ ہونا اور اُن میں سپاہیانہ جوش اور ولولے کا پیدا ہونا یہ سب ملک کے اطمینان اور استحکام کا باعث ہیں اور یہ میرے فرزند اکبر کی خوش قسمتی ہے کہ اُن کو اس طرح سے اپنے ملک اور والد کی خدمتگذاری کا موقع ملا ہے۔ فوج نے جواُن کے تحت ترقی کی ہے یہ امر بھی باعث مسرت ہے بارکسوں کی تعمیر اور سپاہیوں کی آسایش کا دوسرا سامان مہیا ہونے سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہے گی۔

اس کے ساتھ فوج بے قاعدہ بھی جس کے اکثر سپاہی ایک جری اور جنگ آزما قوم کی نسل سے ہیں اپنی جانبازی اور فرض شناسی میں ممتاز رہے ہیں جن کو میں قدر کی نظر سے دیکھتا ہوں۔

سررشتہ آرایش کی کارگزاری سے بھی میں خوش ہوں جس نے شہر کے غربا کے آرام کے لئے ارزاں کرایہ پر صحت بخش طرز کے مکانات تعمیر کئے اور میرے دارالخلافہ کو خوشنما بنایا یہ کام میرے

فرزند خورد کو جو ولی عہد کے حقیقی بھائی ہیں اپنے مذاق کے مطابق ملا ہے۔ مجھے اس امر کو محسوس کرکے کہ غربا کی آسائش کا کام خود میرے ایک فرزند سے متعلق کیا گیا ہے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

کوتوالی اضلاع اور کوتوالی بلدہ دونوں میں اصلاحات عمل میں آرہی ہیں جو ملک کے امن اور رعایا کے جان ومال کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں۔

سررشتہ آبکاری کی جدید تنظیم جو عمل میں آرہی ہے اس میں یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے جس کو میں بھی پسند کرتا ہوں کہ حتی الامکان شراب خواری اور نشہ بازی کو ملک میں بڑھنے سے روکا جائے۔

تعلیم ہر ملک کی روح ہے اس کے بغیر ملک ایک بے جان قالب ہے۔ گو کہ میرے زمانے میں اس نے ترقی کی ہے تاہم ابھی بہت کچھ گنجایش باقی ہے۔ میری خواہش بالخصوص یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم عام ہو۔ تحتانیہ مدارس اور ان کی عمارتیں زیادہ ہوں اور لوکل فنڈ کی مجالس کے ذریعہ سے عوام کی ابتدائی تعلیم میں دلچسپی لینے اور اس کی ترقی میں کوشش کرنے کا زیادہ موقع دیا جائے۔

جامعہ عثمانیہ مجھ کو بہت عزیز ہے اس کی ترقیاں سن کر میں محظوظ ہوا اگر میں چاہتا ہوں کہ نئی علمی تحقیقات اس کا نشان امتیاز ہو۔ نیز یہ کہ مردانہ کھیلوں اور اسپورٹس میں یہ زیادہ ترقی کرے۔

نظام ساگر اور دوسرے بڑے کارہائے تعمیر مثلاً پل وغیرہ اور وہ عالی شان عمارتیں جو اس شہر میں تعمیر ہوئی ہیں آنے والی نسلوں کے لئے میرے عہد کی مادی ترقی کی یادگار بنے رہیں گی۔ اسی طرح مجھے امید ہے کہ آب رسانی اور ڈرینج کے انتظامات سے یہ ملک آیندہ قرنوں میں بھی مستفید ہوتا رہے گا کہ ملک کو

ان کا رہا سے رفاہی پر ناز ہے۔

ریلوے کے حسن انتظام سے میں خوش ہوں کہ اب سب ریلیں سرکاری ہوگئیں ہیں اس سے ملک کو نفع اور اہل ملک کو روزی کا ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ براڈ گیج لائن کا سلسلہ اورنگ آباد تک پہونچانے کا مسئلہ محتاج غور ہے۔

ٹیلیفون جس حد تک قایم ہے گو موجب سہولت ہے مگر مجھے اُمید ہے کہ جس طرح ہندوستان کے بعض دوسرے شہروں میں یوروپ سے اور دیگر دور دراز کے مقامات سے گفتگو کرنا ممکن ہوگیا ہے یہ سہولت حیدر آباد میں بھی جلد سے جلد بہم پہنچائی جائے گی تاکہ یہ شہر اس ذریعۂ تار برقی میں پیچھے نہ رہے مجھے اُمید ہے کہ لاسلکی کا بڑا مرکز جلد قایم ہوگا اور میدان پرواز میں بھی ہمارا ایرو کلب جلد ترقی کرے گا سررشتہ طبابت اور حفظان صحت کی کارگزاری سے میں خوش ہوں مگر میں اُمید کرتا ہوں کہ دواخانہ مریضان شُشش۔ دواخانہ اطفال اور دارالمجانین جدید اصول پر جلد وجود میں آئے گا۔

مشرقی طب سے مجھ کو ہمیشہ شغف رہا ہے کیونکہ یہ طریقہ علاج عوام الناس کو مرغوب اور بہت مفید ہے اور مجھے اُمید ہے کہ خاص دواؤں کے تیار کرنے اور اس قدیم فن کو از سر نو زندہ کرنے اور حاذق حکما کو جمع کرنے کی طرف صیغہ متعلقہ خاص توجہ کرے گا کہ اس کی اس وقت یہاں سخت ضرورت ہے۔

عدالت کے صیغے میں انفصال مقدمات میں پہلے کے مقابل میں تیزی سے کام ہوتا ہے اس سے نیز عدالتوں کے معائنہ کے انتظام سے میں خوش ہوں اور مجھے عہدہ داران عدالت کی فرض شناسی سے

یقین ہے کہ میری عزیز رعایا کی سہولتوں کے لئے آیندہ سرعت سے کام چلتا رہے گا۔

سررشتہ تجارت وحرفت کو بیرونی نمائشوں میں جو انعامات ملے ہیں وہ قابل مبارکباد ہیں تاہم میں چاہتا ہوں کہ یہ سررشتہ صنعت کی طرف زیادہ متوجہ ہو تاکہ جس جس قسم کی صنعت ملک کے اندر ممکن ہو قایم کی جائے۔ جدید نظیم تعلیم میں جو صنعت سکھائی جائے گی تو اس اسکیم کی کامیابی بڑی حد تک ملک میں مختلف قسم کی صنعتوں کے قایم ہونے اور فروغ پانے پر منحصر ہے۔

امداد باہمی رعایا کو قرض اور زیر باری سے بچانے کا بہترین ذریعہ ہے مجھے اس تحریک کی ترقی دیکھ کر مسرت ہوئی ہے اور اُمید ہے کہ دیہی صنعتوں اور زرعی ترقیات میں تحریک امداد باہمی کا فیض ہر حصۂ ملک میں پھیلے گا۔

مزارعین کے سود و بہبود اور ان کے مشکلات کا مجھے پورا احساس ہے اس طبقہ کی معاشی اور معاشرتی ترقی کا میری گورنمنٹ اور مجھے خاص طور پر خیال اور اس طبقہ سے مجھے گہری دلچسپی ہے۔ اس تقریب کے موقع پر جملہ بقایا مالگزاری و تقاوی فحط چالیس لاکھ روپیے کی حد تک اور ۴۲ ف کے ختم تک باستثنار بقایا پیش کش و تقاوی مال و متفرقات و بعض مدات بقایائے وجوہاتی کے معافی کا اعلان کرتا ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ ملک کی مالی حالت باوجود اس عام کساد بازاری کے جو گذشتہ چند سال سے تمام عالم میں پھیلی ہوئی ہے بہت تشفی بخش ہے اور باوجود ان کثیر مصارف کے جو ہر ایک صیغہ میں

... ہیں اور جو ملک کی ترقی کے لئے ناگزیر ہے ریاست کا خزانہ معمور اور اس کا ساکھ بڑھا ہوا ہے اور یہ صدر المہام فینانس سر اکبر حیدری کی ان تھک کوشش اور ملک و مالک کی خیر سگالی کا نتیجہ ہے جس میں کہ انھوں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ بغیر مالی استحکام کے کسی قسم کی ترقی کسی ملک میں ممکن نہیں ہو سکتی۔ لہذا میں محکمہ متعلقہ کی اس کارگزاری کو بہت قابل قدر سمجھتا ہوں اور ریاست کی مالی حالت سے مطمئن ہوں جس کی وجہ سے ترقیاں ہر شعبہ میں ممکن الوجود ثابت ہوئی ہیں۔

برار کے مسئلہ کا جو تصفیہ ہوا ہے اور سیاسی تغیرات کے سلسلہ میں جو گفت و شنید ہو رہی ہے اس میں حیدرآباد کے موجودہ اصول حکومت کی برقراری اور اس ملک کی دوسری خصوصیات کے تحفظ کی جو کوشش کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے اس سے میں مطمئن ہوں اور یہ کام External Relation Committee کے سپرد ہے جس کے پریسیڈنٹ سر حیدر نواز جنگ ہیں جن کے خدمات سے ملک ناواقف نہیں ہے۔

بالفعل اب میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاتا بلکہ ریاست کے ان سب چھوٹے اور بڑے عہدہ داروں کی کارگزاری کی قدر کرتا ہوں جنھوں نے اپنے اپنے سررشتوں میں محنت اور جانفشانی سے کام لے کر ترقی دکھائی ہے۔

کونسل کے صدر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنتہ ملک کے قدیم خاندان اور بہی خواہ ریاست

امیر ہیں جو پرانی روایات کے حامل اور قدیم وضع کے پابند ہیں جن کے دیرینہ اور خیر خواہانہ خدمات کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔

کونسل کی کارگزاری سے میں خوش ہوں اور اپنے جملہ وزراء پر اعتماد رکھتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ کونسل دیہی اصلاح اور دیہاتی زندگی کو خوشگوار بنانے کی جلد تر کوشش کرے گی لیکن جو کچھ ترقیاں ہوئی ہیں اُن سے ابھی بہت زیادہ ہونا باقی ہے۔ پس مجھے اُمید ہے کہ میرے سب عہدہ دار میری خواہش اور ہدایت کے مطابق اپنے اپنے صیغوں کی حد تک ترقیوں کے عمل میں لانے کی کوشش کریں گے اور ملک کی خدمت کرنے میں مجھ کو اپنی حد تک مدد دیں گے۔

بالآخر میری عزیز رعایا ر برایا نے جوبلی کی تقریب منانے کے لئے ایک معتدبہ رقم جو بطور چندہ جمع کی ہے یہ اس کے خلوص و عقیدت کا بیّن ثبوت ہے جسے میں بہ نظر استحسان دیکھتا ہوں۔ چنانچہ یہ طے کیا گیا ہے کہ رقم مجتمعہ میں سے ایک حصہ ایسے کام میں صرف کیا جائے جس سے تمام رعایا ر ممالک محروسہ مساوی طور پر مستفید ہو سکے اس لئے اس رقم پر پہلا بار مرضا ر امراض شُش کے لئے ایک قیام گاہ اور شفا خانہ کا ہوگا جس کی نگہداشت اور سالانہ مصارف کے لئے سرکار عالی گنجائش مہیا کرے گی۔

الحاصل جس جوش عقیدت اور فرط مسرت سے میری رعایا کے مختلف طبقوں نے میری جوبلی کی تقاریب میں حصہ لیا ہے اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ اس وفاشعاری اور

جاں نثاری سے مجھ کو اپنے فرائض کی ادائی میں تقویت ہوگی اور میرے اہل ملک کی ترقی اور فلاح وبہبودی کی مزید کوششوں میں شغف پیدا کرے گی اور خدا سے مجھے اُمید ہے کہ میری عزیز رعایا امن اور آسودگی سے زندگی بسر کرے گی اور یہ ریاست جو مجھ تک میرے اسلاف سے ورثتاً پہونچی ہے حق تعالیٰ کی مہربانی اور بہی خواہان ریاست کی دُعا اور اشتراک عمل سے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہے گی جس سے بڑھ کر کسی والئی ملک کو دوسرے قسم کی نعمت حاصل نہیں ہوسکتی جس کی پاسبانی کے لئے جب کہ قدرت نے خود اُس کا انتخاب کیا ہو،

بقول حدیث شریف

کُلُّ رَاعٍ مَسئُولٌ عَن رَعِیَّتِہٖ یَومَ القِیَامَۃِ

پیام

ہز ہائی نس پرنس آف برار والا شان



هز هائی نس جنرل والاشان نواب اعظم جاہ بہادر
پرنس آف برار

ہز ہائی نس پرنس آف برار والاشان کا پیام

نوجوانان حیدرآباد کے نام

اعلیحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی
کی سلور جوبلی کے مبارک اور مسعود موقع پر

نوجوانان حیدرآباد کو میرا یہ پیام ہے کہ سب سے پہلے ہم سب کو خداوند عالم کی بارگاہ میں سر بسجود ہوکر باری تعالیٰ جل شانہٗ کے اس بے پایاں فضل وکرم کا شکر بجالانا چاہیے کہ اس نے حضرت ظل سبحانی خسرو دکن آصف جاہ سابع کے عہد میمنت مہد کے پہلے بست و پنج ۲۵ سال ایسی خیر و خوبی اور افضال و برکات سے گزارے جس کی نظیر اس پر آشوب زمانہ میں دوسرے ممالک میں کم ہے۔ اور اس زرین عہد میں ایسی ایسی ترقیوں کے ذرائع عطا فرمائے جن سے حیدرآباد کا نام نہ صرف ہندوستان میں بلکہ اقطاع عالم میں مشہور ہوا اس کے بعد میں نوجوانان ملک کو مخاطب کرکے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خواہ وہ سپاہی ہوں یا سیویلین ملازم سرکار ہوں یا آزاد پیشہ غرض جو کچھ ان کا ذریعہ معاش ہو ان میں ہر ایک کو یہ تصور کرنا چاہیے کہ وہ

اس معنی میں ایک سپاہی ہے کہ ہر وقت اور ہر لحظہ وہ اپنے ملک اور مالک کی خدمت (جس طریق سے بھی اُس سے ممکن ہو) بجالانے کو آمادہ ہے۔ اور اگر ضرورت ہو تو جان و مال بھی اپنے ملک و مالک پر قربان کرنے کو تیار ہے۔ کیونکہ اس عہد میں جو آسودگی۔ آسایش اور خوش حالی رعایا کو حاصل ہے اور جو علمی تمدنی اور معاشرتی ترقیاں اہل ملک کو نصیب ہوئی ہیں ان کا عملی شکریہ یہی ہو سکتا ہے کہ جس طرح سپاہی کسی مہم میں کام آتا ہے اسی طرح ہر شخص اس ریاست ابد مدت کی حفاظت اور اس کے قدیم روایات کی بقا کے لئے اپنے جان و مال سے کام آنے میں دریغ نہ کرے۔ آخر میں میرا پیام یہ ہے کہ باہمی اتفاق اور اتحاد فراخدلی اور رواداری ایسے انسانی جوہر ہیں جن کے بغیر خواہ کتنی ہی کوشش کی جائے کوئی ملک کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔ نہ مالی نہ تمدنی۔ اور نہ سیاسی۔ لہذا سب نوجوانوں کو لازم ہے کہ وہ اتحاد و اتفاق اور باہمی رواداری سے کام لے کر اپنے بادشاہ کی مثال پر ملک کی فلاح اور ترقی کی بے لوث اور مخلصانہ کوشش کریں کہ اس میں خود ان کی فلاح اور بہبودی متصور ہے فقط

پیامات

عثمانی نوجوانان دکن!

عثمانی نوجوان ہمارے ملک کے شصت سالہ تعلیمی خواب کی تعبیر ہیں۔ انھوں نے مادری زبان میں تعلیم پاکر اپنی ماں کا دودھ پیا ہے اس لئے ان کی دماغی و جسمانی صحت، طاقت، اور قوت کا پورا یقین ہے اور چند ہی برسوں کے تجربہ میں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ہمارے تعلیمی طبیبوں کا خیال ہر طرح درست ثابت ہوا۔

عثمانی نوجوانو! اٹھو اور عثمانی علم کے زیر سایہ آگے بڑھتے چلو، مستقبل تمہارا منتظر ہے، تم سارے ملک کو ایک زبان، ایک قومیت اور علم و فن کا یکساں خزانہ بخشو۔ جہاں تک آصفی سلطنت کے سیاسی حدود ہیں۔ اس کے علمی و تعلیمی حدود کو وہاں سے آگے بڑھا کر ہمالیہ کی چوٹیوں اور بحر ہند کے کناروں تک پہنچا دو!

والسلام

سید سلیمان ندوی

(ناظم دار المصنفین و مدیر رسالہ معارف)

پیغام بہ فرزندان جامعہ عثمانیہ

عزیزو!

اگر سعادت چاہتے ہو تو علم و فن کی خدمت اور اپنے مربی اعلیٰ و اقدس حضرت سلطان العلوم مدظلہ العالی کی ارادت و عقیدت کو اپنا شعار بناؤ۔

عبدالستار صدیقی

(صدر شعبہ عربی و فارسی جامعہ الہ آباد)

مجھے آپ کے خط سے یہ معلوم کرکے بہت خوشی ہوئی کہ آپ "مجلۂ عثمانیہ" کا جشن سیمیں نمبر نکال رہے ہیں میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے ۔

جامعۂ عثمانیہ جن شاندار روایات کی علمبردار رہے ان کی حفاظت وصیانت کا کام طلبا ہی کی محنت اور توجہ سے ہو سکتا ہے ۔ "مجلۂ عثمانیہ" اس محنت و توجہ کا قابل تحسین مظاہرہ ہے

بشیر احمد

بیرسٹر ایٹ لا

مدیر "ہمایوں"

(سکرٹری انجمن اردو پنجاب)

طلبۂ جامعہ عثمانیہ کے نام

اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے جشن سیمیں کی مبارک تقریب میں نہ صرف اہل حیدر آباد بلکہ تمام اہل ہند خلوص قلب سے شریک ہیں کیونکہ اعلیحضرت کے عہد حکومت کی برکات اور فیوض صرف ریاست حیدر آباد ہی کے لئے مخصوص ہی نہیں رہے بلکہ تمام ہندوستان اور بیرون ہند میں بھی گوہر بار رہے ہیں ۔ یہ وسعت قلب اسلامی تہذیب اور تمدن کی روایات کے عین مطابق ہے کیونکہ اسلام کسی قسم کی تنگ نظری اور نسلی یا جغرافی حدود کا قائل نہیں ۔

اس موقع پر مختلف جماعتیں اور ادارے اپنے اپنے طور پر اس جشن میں شریک ہوں گے اور حضور نظام کے عہد حکومت کے مختلف کارناموں پر تبصرہ کیا جائے گا ۔ میری رائے میں اس دور کا سب سے پائدار اور زبردست کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی کی تحریک اور اس کی کامیاب تنظیم ہے جو ہند جدید کی تعلیمی تاریخ کا سب سے اہم اور معنی خیز

واقعہ ہے۔ ایک طرف تو تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت واضح ہے۔ کیونکہ جب تک مادری زبان کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا
جائے طلبہ میں تفکر اور تخلیق کے سوتے نہیں پھوٹتے سوائے ان مخصوص اور شاذ افراد کے جن میں زبانیں سیکھنے
کی غیر معمولی قابلیت ہوتی ہے باقی تمام طلبہ کی تعلیم محض طوطوں کی سی تعلیم بن جاتی ہے جس کا انحصار الفاظ کے رٹنے
پر ہوتا ہے اور بس۔ لہٰذا تعلیم میں اثر اور واقعیت پیدا کرنے اور طلبہ کو الفاظ کے بجائے علوم اور حافظے کے بجائے
غور و فکر کا استعمال سکھانے کے لئے یہ قطعی تبدیلی لازم ہے دیر یا سویر اس کا ہونا ناگزیر تھا مگر عہد عثمانی کو اس بارے
میں شرف تقدم حاصل ہے جو اس کے لئے باعث فخر اور ہم سب کے لئے باعث برکت ہے۔

لیکن تمدنی نقطۂ نظر سے عثمانیہ یونیورسٹی کی تحریک اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ جب تک تعلیم ایک
غیر زبان کے ذریعہ دی جاتی ہے اس کا تعلق قومی زندگی اور قومی تہذیب و تمدن کے سرچشمے سے قایم نہیں ہو سکتا۔
ابتدائی تعلیم سطحی اور ناقص رہتی ہے اور اعلیٰ تعلیم طلبہ کو قومی مفاد اور مسائل سے بے تعلق اور بے نیاز کر دیتی ہے۔
وہ ایک خاص جماعت میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور بہت سے ذہین اور ہونہار لڑکے جن میں دماغی اعتبار سے
اس سے مستفید ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس روشن خیال تعلیمی اقدام کا سب سے
زبردست اثر یہ ہونا چاہیئے کہ کم از کم تعلیم کے میدان میں وہ انسانی مساوات بھی قایم ہو جائے جس کی آرزو اور تلقین
دنیا کے بہترین مصلح اور مفکر کرتے آئے ہیں۔ اس کی وجہ سے حیدرآباد کے عوام کے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے
کھل گئے ہیں تاکہ ان کی اپنی زبان کی وساطت سے علم کی روشنی ان کی تاریک اور محدود زندگی میں راہ پا جائے
اور وہ اپنی صدیوں کی محرومیوں کا علاج کر سکیں۔ ہر ملک اور قوم کی ترقی اور تہذیب کا صحیح ترین اندازہ اسی بات
سے ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے غریب اور بد نصیب افراد کی خدمت اور بہبود کے لئے کیا وسائل بہم پہنچائے ہیں
اس اعتبار سے بھی میں عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کو ایک نیک فال سمجھتا ہوں اور اس کے خوش نصیب طلبہ کو

دو امور کی توجہ دلاتا ہوں یعنی یہ کہ ایک طرف وہ اس اعلیٰ اور صحیح تعلیمی ماحول سے فائدہ اُٹھا کر اپنی ذہنی اور علمی ترقی میں کاوش کریں اور دوسری طرف ان تربیت یافتہ قوتوں کو عوام کی خدمت کے لئے استعمال کریں۔ یہ بہترین شکریہ ہوگا اس احسان کا جو حضور نظام نے اس یونیورسٹی کو قایم کر کے موجودہ نسلوں پر کیا ہے۔

خواجہ غلام السیدین
پرنسپل ٹریننگ کالج۔ علی گڑھ

جامعہ عثمانیہ اعلیٰ حضرت نظام دکن کے بہترین کارناموں میں سے ہے اس یونیورسٹی کی ممتاز حیثیت یہ ہے کہ یہ ہندوستانی زبان کی یونیورسٹی ہے میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستانی زبان کے معین و مددگار اپنے ملک کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ہندوستانی زبان کو فارسی اور عربی کی باندی نہ خیال کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ ان کی زبان بجائے خود ایک مستقل زبان ہے اور اپنی شاعری اپنے ادب اپنے صرف و نحو اور اپنے عروض پر خود مختارانہ قدرت رکھتی ہے میں اُمید کرتا ہوں کہ " جامعہ عثمانیہ کے طلبہ اس نکتہ کو اپنے ذہن میں رکھ کر ہندوستان اور ہندوستانی زبان کی ایسی سچی اور صحیح خدمت کریں گے کہ جس سے ہر ہندوستانی کو خوشی حاصل ہوگی اور ہم وطنی کے رشتہ سے ان کی کامیابی پر فخر کرنے کا موقع حاصل ہوگا۔

منوہر لال زُتشی

اداریہ

جشن سیمیں کے مبارک و مسعود موقع پر ہمیں یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ مجلّہ کا جشن سیمیں نمبر پیش کر سکیں۔ مادر علمی بہجت و سرور کے جذبات میں ڈوب کر تہنیت و مبارکباد کے گیت گا رہی ہے۔ جس گلشن علم کا پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا اسی ابر گہر بار (ظل اللہ) کی گہر باری سے پروان چڑھا۔ اسی آفتاب کی کرنیں اس کی حیات و نمو کا باعث ہوئیں تو ایسی مسعود تقریب پر اس کی مسرت و خوشی کا اندازہ ہو سکتا ہے: اس کی مسرت بھری تانوں میں فخر و ناز کے سُر ملے ہیں۔ اسے فخر ہے کہ ۲۵ سالہ درخشاں عہد عثمانی کے ایک سبھ گھڑی میں دست شاہانہ نے اس کی تخلیق فرمائی اور جب وہ اپنے مالک کے چرنوں میں پل کر اٹھلانے لگی تو اس کی رعنائیوں کو پھلنے پھولنے کے لئے الطاف شاہی نے اُسے اس طرح نوازا کہ وہ جنت نظر بن گئی۔ ابھی دیکھنے والے اس کی دید سے متحیر ہی تھے کہ نطق ہمایونی کے ان الفاظ نے "جامعہ عثمانیہ مجھے بہت عزیز ہے" اسے سربلند کر دیا۔ ان شاہانہ الطاف و عنایات کے لئے مادر علمی کے سینہ میں فخر و ناز کے ساتھ ہمیشہ اپنے فرض کا عزم انہیں بھی پوشیدہ رہا ہے۔

اپنی پیدائش سے لے کر ابھی تک وہ اپنے فرزندوں کے دلوں میں اپنے آقا اور مالک سے وفاداری اور ذات ہمایونی پر سے قربان ہونے کے جذبات کو پرورش دیتی رہی ہے اور اب اس تقریب مسعود نے تو ان جذبات کو اور لہرا دیا ہے۔

اعلیٰ حضرت ظل سبحانی کا یہ ۲۵ سالہ درخشاں عہد حکومت ایک ایسی قوم کی تخلیق کا باعث ہوا جو اپنے مالک کے لئے جذبات

عقیدت و جاں نثاری کا سمندر اپنے سینوں میں موجزن رکھتی ہے اور اپنے ملک کے لئے ایک "حیات نو" کی پیامبر ہے۔ یہ قوم جامعہ عثمانیہ کے آغوش میں پل کر جوان ہو رہی ہے۔ ذات ہمایونی کے نام کا تعلق ہی اس کی مستقبل کی برتری اور ترقی کا ضامن ہے۔ اور اس مبارک نام کی عظمت و وقار کی بدولت وہ ایک درخشاں ماضی اپنے پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

نہ ختم ہونے والے عہد عثمانی کے اس جشن مسعود میں حیدرآباد نے شاہ پرستی اور رعایا نوازی کا ایسا نظارہ دیکھا جس کو وہ کبھی بھول نہ سکے گا۔

وہ سپاسنامے جو حضرت اقدس و اعلیٰ کی بارگاہ میں پیش کئے گئے ارادت و عقیدت، جاں نثاری و وفاداری کی یادگاریں ہیں۔ اور ان کا جواب شاہانہ، اپنی غریب رعایا سے محبت، اپنے ملک کی ترقی اور رفعت کا خیال اور ہر طبقہ اور ہر فرقے سے تعلق خاطر کی ایسی سند ہے جس پر زمانہ ہمیشہ فخر کرے گا۔ اس جشن مسعود کی تقریب میں دور دور سے معزز مہمان تہنیت اور مبارکباد عرض کرنے آئے تھے مگر سب سے زیادہ متاثر کن اجتماع اس مخلوق کا تھا جو جوق در جوق اور پروانہ دیہاتوں سے اپنے پریمی بادشاہ کا درشن کرنے اور جذبات عقیدت و جاں نثاری کی نذر گذراننے یہاں آئی تھی۔ اس کے جواب میں ذات شاہانہ کے، رعایا کے درد دکھ پر تڑپ اٹھنے والے دل نے انھیں اس طرح نوازا کہ بار بار ظل سبحانی کی زبان مبارک پر "میری عزیز رعایا" کا محبت بھرا کلمہ تھا اور یہی نہیں بلکہ چالیس لاکھ کا لگان علاقہ دیوانی کے لئے اور ۲۴ لاکھ علاقہ صرف خاص کے لئے معاف فرما کر ظل اللہ نے انھیں نہال کر دیا اور جب وہ اپنے دیہاتوں کو لوٹ رہے تھے تو اُن کے دلوں کا ذرّہ ذرّہ عقیدت و جاں نثاری کے جذبات سے معمور تھا اور ان کی دعائیں، جشن طلائی دیکھنے کی آرزو پر ختم ہو رہی تھیں۔

طلبائے جامعۂ عثمانیہ کی مودبانہ استدعا پر پیشگاہ خسروی سے بذریعہ فرمان مبارک مورخہ ۵ ذی الحجہ الحرام ۱۳۵۵ھ جو ارشاد شرف صدور لایا ہے اور ہز ہائی نس جنرل والاشان حضرت پرنس آف برار نے جو پیام "مجلہ عثمانیہ" کی اشاعت جشن سیمیں کے لئے سرفراز فرمایا ہے اس پر جامعہ عثمانیہ کے طلبا جس قدر فخر و ناز کریں کم ہے۔

حسب ارشاد ہمایونی مجلہ عثمانیہ میں اعلیٰ حضرت ظل سبحانی کا پیام جو یکم ذی الحجہ کے جریدہ غیر معمولی میں طبع ہوا ہے نیز باغ عامہ کے پبلک ایڈریس کے جواب میں جو نطق ہمایونی شرف صدور لایا تھا، اس کو مجلہ عثمانیہ کی اشاعت جشن سیمیں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے اس کے ساتھ ہی طلبا نوازی اور نوجوانان ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ہمارے ہر دلعزیز ہز ہائی نس جنرل والاشان حضرت پرنس آف برار کا روح پرور پیام جو بعد منظوری اشاعت کے لئے سرفراز فرمایا گیا ہے اس کو بھی اعلیٰ حضرت اقدس کے

لطف ہمایونی کے بعد شائع کرنے کی سعادت حاصل کی جارہی ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ ان بیانات شاہانہ کے شرف مطالعہ سے نوجوانان ملک عموماً اور فرزندان جامعہ خصوصاً بہرہ مند ہوں گے مجلہ اور طلبائے جامعہ اس امتیاز پر ہمیشہ نازاں رہیں گے کہ ان کی استدعا پر حضرت والاشان ولی عہد بہادر نے ایک ایسا پیام مرحمت فرمایا ہے جو اس سرزمین کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

اس سے پہلے بھی ایک ایسی ہی سعادت ہمیں نصیب ہوئی تھی جب عثمانیین نے اپنا ایک ڈرامہ "مرشد" اسمبلی میں اسٹیج کیا تھا تو اعلیٰحضرت ظل سبحانی اور شہزادگان والاشان نے اپنی تشریف آوری سے ہمارے دل کے گوشہ گوشہ کو نہال کردیا تھا۔

ہزرائل ہائی نس ولی عہد بہادر کا پیام حروف زر سے لکھنے کے قابل ہے جس کو جملہ نوجوانان ملک اپنے دلوں پر کندہ کرلیں گے یعنی "سب نوجوانوں کو لازم ہے کہ وہ اتحاد و اتفاق اور باہمی رواداری سے کام لے کر اپنے بادشاہ کی مثال پر ملک کی فلاح و ترقی کی بے لوث اور مخلصانہ کوشش کریں کہ اس میں خود ان کی فلاح و بہبودی متصور ہے"۔

اس روح پرور پیام نے ہمارے قلوب کو وفاداری سپاس گزاری اور ملک و مالک کی خدمت اور اپنے آقا پر سے قربان ہوجانے کے جذبات میں ایک تازہ روح پھونک دی ہے اور یقین ہے کہ جس طرح ہم میں اس کے مطالعہ سے باہمی اتفاق و اتحاد فراخدلی اور رواداری کے جذبات مستحکم ہوگئے ہیں، سارے نوجوانان ملک بھی اسی طرح بہرہ مند ہوں گے اور ہمارے ساتھ اس دُعا میں شریک رہیں گے۔ کہ الٰہی اس سلطنت ابدمدت پر آقائے نامدار اعلیٰحضرت ظل سبحانی حضور پرنور بندگان عالی سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا نیر اقبال ہمیشہ تاباں رہے اور آپ کے سایہ عاطفت میں شہزادگان بلند اقبال اور شہزادیان فرخ فال خوش و خرم و باعظمت و جلال اور اہل ملک آسودہ و خوش حال رہیں۔ آمین ثم آمین

جشن سیمیں کی مسعود تقریب میں جامعۂ عثمانیہ کی فضا بھی عقیدت و جذبات وفاداری کے تانوں سے گونج اٹھی۔ ۱۹ ار فروردی ۱۳۴۶ف کو ٹیگور ہال میں طلبا اور ارکان جامعہ کا عقیدت مندانہ اجتماع ہوا جس میں طالبات عثمانیہ زنانہ کالج بھی اپنے شاہ ذیجاہ کے لئے عقیدت و جاں نثاری کے ہار لے کر آئی تھیں۔ ہمارے محترم نائب معین امیر جامعہ قاضی محمد حسین صاحب نے پرجوش انداز بیان میں اپنے آقائے ولی نعمت سے جذبات عقیدت و ارادت کا اظہار کیا اور فرمایا "علم ابھی تک نامانوس زبانوں میں مقید تھا۔ ذات شاہانہ کے الطاف سے وہ اس سرزمین میں آزاد کردیا گیا"، طلباء کے وفاشعارانہ جذبات کی نمائندگی محمد بن عمر حسن رضا متعلم سال چہارم نے کی۔

عثمانیہ طبیہ کالج انجینئرنگ کالج زنانہ کالج اور سررشتہ تالیف وترجمہ کی طرف سے بھی اظہار عقیدت کیا گیا۔ معزز مہمانوں میں ڈاکٹر ضیاء الدین معین امیر جامعہ علی گڑھ، نواب حیدر یار جنگ اور ڈاکٹر ہادی حسن نے تقریریں کیں۔ رات میں اقامت خانوں کی جانب سے عثمانیہ ترتیب دیا گیا اور روشنی کی گئی۔ غرض یہ تقریب مسعود جس کے لئے مادر جامعہ اپنے دامن میں عقیدت وارادت کے پھول لئے ظل اللہ کے حضور میں نذر کرنے کے لئے بے چین تھی۔ شاہ ذیجاہ کے عمر واقبال کی دعاؤں پر ختم ہوئی۔

مجلہ کے عمر عزیز کے ۹ سال بیت گئے، اب یہ دسویں سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ اس کا دسواں سال جشن سیمیں کے مسرت بھرے نغموں سے شروع ہو رہا ہے۔ ان ۹ سالوں میں مجلہ نے علم وادب کی جس قدر خدمت کی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں شاندار ماضی کی طرح مجلہ کا مستقبل بھی تابناک ہے۔

جشن سیمیں کی یہ اشاعت بہت ہی تھوڑی مدت میں پیش کی جارہی ہے اگر ہمارے محترم نائب معین امیر جامعہ کی شفقتیں ہمارے شامل حال نہ ہوتیں تو یہ شمارہ اس قدر جلد شائع نہ ہو سکتا۔ ہم اپنے محترم اساتذہ مولوی عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور مشیر حصہ اردو اور پروفیسر ای۔ ای اسپیٹ مشیر حصہ انگریزی کے بھی ممنون ہیں جن کی رہبری نے ہمارے شوق کو تیز کر دیا۔ انتظامی معاملات میں جناب پروفیسر وحید الرحمن صاحب (خازن اعزازی مجلہ) کی نوازشات ہمارے لئے باعث تشکر ہیں۔

معاشیات کے سارے مضامین ہمیں جناب پروفیسر حبیب الرحمان صاحب صدر شعبہ معاشیات و عمرانیات نے عنایت فرمائے ہیں جس کے لئے ہم ان کے مشکور ہیں۔

مولوی الیاس برنی صاحب ناظم سررشتہ تالیف وترجمہ مولوی ابوبکر خان صاحب خویشگی مہتمم دارالطبع جامعہ اور عصمت اللہ بیگ صاحب نے بلاکس اور سرورق کے بنانے میں ہماری مدد کر کے ہمیں ممنون کیا ہے۔

سید اشفاق حسین



ہز اکسلنسی مہا راجہ سر کشن پرشاد بہادر شاد یمین السلطنت صدر اعظم ساطنت آصفیہ
امیر جامعہ۔

حیدرآباد کی تعلیم اور اُردو

بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اُردو یا ہندستانی زبان اپنے تولد سے میلوں دور دکن میں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں آج سے چار پانچسو سال پہلے کس طرح اس آسانی کے ساتھ رائج ہوسکی اور نشو ونما پا سکی کہ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر یہاں کے رہنے والوں کی رگ و پے میں جذب ہوگئی۔ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قریب ہی زمانہ میں زبان کے نہ صرف بولنے والے سمجھنے والے دکن کے طول و عرض میں موجود تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے مصنف اور شاعر بھی پیدا ہوگئے تھے۔

زبانوں کے رائج ہونے اور نشو ونما پانے کا درحقیقت یہ ایک آسان اور عام فہم اصول ہے۔ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ زبان ہندستان کی دو عظیم الشان مگر مختلف اللسان جماعتوں کے مابین تبادلۂ خیال کے آلۂ کار کی ناگزیر مجبوری سے وجود پذیر ہوئی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ یہ عوام کی زبان تھی اور اس کے سب سے پہلے معمار عوام ہی ہیں۔

دکن میں جب مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور یہاں ان کی حکومتیں بھی قایم ہوگئیں تو حکومت کے عہدہ داروں اور رعایا میں تبادلۂ خیال کی بڑی دقت تھی مسلمانوں کی مادری زبان فارسی تھی اور ان کے تمام کار دبار مملکت اسی زبان کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔ سالہا سال سے ہندوستان کے ملکی اور مالی دفاتر میں اس زبان کے رائج ہونے کے سبب اس میں دفتر کی تمام اصطلاحات موجود تھیں لیکن ظاہر ہے کہ دکن کے وسیع خطے میں فارسی کو اس طرح رائج کرنا کہ وہ عوام کی ثانوی زبان بن جائے مشکل اور طوالت طلب کام تھا۔ ان دقتوں نے مسلمانوں کو اپنی مادری زبان چھوڑ کر عامتہ الناس کی اس زبان کو اختیار کرنے پر آمادہ کردیا جس کے رواج پانے کے یقیناً زیادہ امکانات تھے اور جس کو مسلمان مصنفین اپنی زبان کے مقابلہ میں ہندی یا ہندوی یعنی ہندوؤں کی زبان کہتے تھے۔ اور چونکہ اس کا ادب اور شاعری ابتدائی

زمانے میں یہیں پیدا ہوئی اسلئے اس کو دکھنی بھی کہتے تھے ۔

اس میں شبہ نہیں مسلمان فاتح شمال کی طرح کچھ عرصے کی کوشش کے بعد دکن کی علمی زبان فارسی بنا سکتے تھے چنانچہ ابتدائی سنین میں انھوں نے سرکاری دفاتر میں فارسی استعمال کرکے اس کی کوشش بھی کی کیونکہ جس سرزمین میں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں وہاں نو وارد فاتحین کے لئے یہ تصفیہ کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ سرکاری دفاتر کے لئے کونسی زبان اختیار کی جائے ۔ عموماً ہر جگہ یہی ہوتا آیا ہے کہ فاتح اپنی زبان ہی کو اختیار کرتے ہیں لیکن جب نو واردوں کے تعلقات ملک سے قایم ہوجاتے ہیں اور وہ اس کے قدیم باشندوں کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں تو عموماً دونوں کی زبانوں کے خلط ملط سے نئی زبانیں تعمیر پاتی رہی ہیں چنانچہ سیکسن قوم کی فتح انگلستان کے بعد اینگلو سیکسن زبان کا پیدا ہونا اور آریوں کی فتح ہندوستان کے بعد پراکرتوں کا نشوونما پانا اس حقیقت کا نتیجہ ہے ۔ حکومت نے تو اپنی حد تک فارسی کو اختیار کرلیا تھا لیکن نو وارد مسلمان دکن کے باشندوں کے ساتھ رہنے بسنے اور لین دین کی ناگزیر ضرورتوں کے باعث رفتہ رفتہ وہ فارسی کو ترک کرتے گئے اور اس دیسی زبان کی طرف راغب ہوتے گئے جسے وہ ہندوؤں کی زبان سمجھتے تھے ۔ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر یہ زبان عوام کی بول چال سے بڑھ کر تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری میں بھی استعمال ہونے لگی ۔ جب اس زبان نے ترقی کے آثار ظاہر کئے تو فاتحین بھی رواداری سے کام لے کر اس کی سرپرستی کرنے پر آمادہ ہوگئے چنانچہ بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کے چند بادشاہوں نے اس زبان کو سرکاری دفاتر میں رائج کردیا تھا جب ضرورت کسی امر کا تصفیہ کردیتی ہے تو پھر اس کو اٹل سمجھنا چاہئے ۔ دکن میں اس زبان کے جلد ہی ادبی و علمی بن جانے کا بھی یہی سبب ہے ۔ شمال سے ان کے تعلقات منقطع ہوجانے کے سبب وہ فارسی کی بجائے ہندوستانی زبان کو ترقی دینے اور اس میں تصنیف و تالیف کرنے لگے ۔ مصنف کے لئے پڑھنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر فارسی بولنے والے فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کرتے تو ان کے مخاطب صرف وہی لوگ ہوتے جو ان کے ہمراہ آئے تھے یہ عیسیٰ لکھے موسیٰ پڑھے کے مصداق ہوتا ۔ مصنف کی لازمی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تصنیف زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے اور وسیع سے وسیع حلقوں میں گشت لگائے ۔ فارسی بولنے والوں کا ہندوستانی میں تصنیف و تالیف کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں پڑھنے والوں کا وسیع تر حلقہ اس زبان میں میسر آسکتا تھا ۔ اس کے علاوہ ابتدائی اردو کارنامے جو زیادہ تر مذہبی موضوعات پر مشتمل ہیں اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے نہیں بلکہ زیادہ تر ان نومسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لئے لکھے گئے تھے جن کے لئے وہ اپنے مذہب کی حقانیت اس کے اصول قوانین اور احکام پیش کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے ۔

تصنیف و تالیف کے بعد دوسرا درجہ تعلیم و تدریس کا ہے ظاہر ہے کہ کوئی چین میں عبرانی بائبل شائع کرنے کی جرات نہیں کرسکتا ۔

جو کتابیں عام طور پر ملک میں لکھی جائیں گی وہی مدارس میں پڑھائی بھی جانی چاہئیں لیکن ہندوستان کی تعلیم گذشتہ صدی کے وسط تک زیادہ تر دینیات کے حلقہ کے کتابوں تک محدود تھی انگریزوں کی سلطنت کے قیام تک بھی ہندوستانی تعلیم کا یہی حال تھا۔ حیدرآباد میں جس وقت سے تعلیم کی تنظیم شروع ہوئی اور عام تعلیم کے لئے مدارس قایم ہونے لگے ان کی ترقی میں ہندوستانی زبان نے جو حصہ لیا وہ دوسری تمام زبانوں سے بڑھ کر ہے۔ اس زبان کا تعلق حیدرآباد کی تعلیم سے بھی ایسا ہی قدیم ہے جیسا کہ زبان کے ادبی اور شعری کارنامے اولیں ہیں۔

حکومت کی طرف سے تنظیم تعلیم کی مساعی کے آغاز ہونے سے پہلے جو مدارس ہمارے حد علم میں آسکے ہیں ان میں قدیم ترین مدرسہ جامع مسجد کا ہے جو مسجد کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ بعد میں جب مولانا حافظ شجاع الدین نے اس مسجد کی خانقاہ میں سکونت اختیار کی تو ان کی کوشش سے یہ مدرسہ از سر نو زندہ ہوا۔ اس مدرسہ میں زیادہ تر دینیات کی تعلیم ہوتی تھی اور ملک کے طول و عرض سے طالبانِ علم حصول علم کے شوق میں آتے تھے۔ تعلیم کے ساتھ طلبا کے رہنے کا بھی انتظام تھا اور کھانا وغیرہ بھی اوقات مسجد سے ملتا تھا۔ اس مدرسہ میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اس میں شک نہیں کہ فارسی اور عربی کی قدیم درسی کتابیں تھیں لیکن ان کی تعلیم اور تفہیم کا ذریعہ زیادہ تر یہی زبان تھی، چنانچہ اس کا بڑا ثبوت مولانا کی مشہور کتاب "کشف الخلاصہ ہندی" سے ملتا ہے جو مسائل فقہ پر نظم میں لکھی گئی ہے اور مدرسہ کے طلبا ر کے لئے مقصود تھی لیکن یہ ایسی مقبول ہوئی کہ حیدرآباد کے تمام مدارس میں زمانہ حال تک بھی پڑھائی جاتی تھی۔

دوسرا مدرسہ اس کے کچھ عرصہ بعد کا ہے جو پائیگاہ کے امیر کبیر اور سلطنت کے علم دوست وزیر نواب فخرالدین شمس الامرا ثانی نے ۱۲۵۸ھ میں اپنی ڈیوڑھی میں قایم کیا تھا۔ یہ مدرسہ فخریہ کے نام سے موسوم تھا اور اس میں درس دینے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض سے علما بلائے گئے تھے۔ سارے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا یہ واحد مدرسہ تھا جہاں مروجہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ حکمی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ خود نواب فخرالدین خاں کو حکمی علوم سے غیر معمولی شغف تھا چنانچہ اس دلچسپی کی بہ سرپرستی میں انھوں نے ایک ادارہ قایم کیا تھا جس میں حکمی علوم کی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اردو میں کئے جاتے تھے۔ ضرورتاً اصطلاحیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں ستہ شمسیہ بہت مشہور رہی۔ ہیئت کی تعلیم میں اجرام فلکی کے مشاہدات کی غرض سے جہاں نما کی رسدگاہ بھی تعمیر کرائی گئی تھی جو آج تک باقی ہے۔

یہ کتابیں دراصل مدرسہ فخریہ کے طلبا کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن مولانا امام خاں تاریخ خورشید جاہی کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے طول و عرض کے طلبا میں یہ ایسی مقبول ہوئیں کہ ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

حضرت غفران منزل نواب ناصرالدولہ کی سربرآرائی کے آخر زمانے سے تنظیم تعلیم کی سعی شروع ہوئی اور عجیب بات ہے کہ سب سے پہلے جو مدرسہ قایم کیا گیا وہ ڈاکٹری کی تعلیم کا تھا۔ اس مدرسے کے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں مغربی طب کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی۔ یہ

اُردو میں طلب کی تعلیم دینے کی اولین کوشش تھی اپنے نتائج کے لحاظ سے یہ مدرسہ کس قدر کامیاب رہا اس کے متعلق صرف یہ معلوم کرنا کافی ہوگا کہ نواب لقمان الدولہ مرحوم اور ہمارے زمانے کے ہر دلعزیز اور قابل قدر ڈاکٹر عبدالحسین ارسطو یار جنگ بہادر اس مدرسہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس تربیت کا اثر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نسخے آج تک اُردو میں لکھے جاتے ہیں۔

ہمارے قریبی زمانے کے مدارس میں سب سے زیادہ قابل ذکر مدرسہ دارالعلوم ہے جس کی بنیاد ۱۲۷۲ھ میں نواب مختار الملک سالار جنگ کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس مدرسہ کا نظام ونصاب پہلے پہل قدیم درس نظامیہ پر مبنی تھا بعد کو اس میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں لیکن اس میں تفہیم وتدریس کا ذریعہ اُردو زبان تھی۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ سالار جنگ مرحوم کا نقطۂ نظر زبان کے معاملہ میں انگریز مدبروں سے ملتا جلتا تھا وہ فارسی کے سخت طرفدار تھے اور اس زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو دفاتر میں رائج کرنے کے خیال سے جزبز ہوتے تھے۔ لیکن واقعات کی رفتار کچھ اور ہی چیز ہے۔ کسی ایک شخص یا گروہ کی کوشش سے یہ رک نہیں سکتی۔ چنانچہ سلطنت آصفیہ کے دفاتر میں بھی یہ زبان رائج ہوگئی۔ مدرسہ دارالعلوم میں اگر قصداً اُردو زبان رائج کرنے کی کوشش کی جاتی تو سر سالار جنگ شاید اس کو پسند نہ کرتے لیکن یہ چیز بغیر جانے اور بغیر کوشش کے صرف اس لئے رائج ہوگئی کہ معلمین اور متعلمین دونوں کی زبان یہی تھی دارالعلوم کی توسیع کے بعد قدیم مدرسہ فخریہ بھی اس سے متعلق ہوگیا تھا اور دارالعلوم ہی کے نصاب کی یہاں تکمیل کرائی جاتی تھی۔

۱۸۸۳ء میں حیدرآباد کے ایک ہمدرد عالم مولوی امیرالدین نے مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی۔ دارالعلوم کے موجود ہوتے ہوئے اس مدرسہ کا قایم ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اس وقت تک مدرسہ دارالعلوم میں دینیات کے علاوہ بہت سے دنیاوی علوم بھی داخل ہوگئے تھے۔ اس لئے ایک ایسے مدرسے کی ضرورت محسوس کی گئی جو محض دینیات کی تعلیم کے لئے مختص رہے۔ اس مدرسہ میں بھی عربی زبان اور دینیات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں لیکن درس کا ذریعہ اُردو زبان ہی تھی۔

غرض یہ ایک سرسری خاکہ ہے اس حقیقت کا کہ جس وقت سے حیدرآباد میں عام تعلیم کا چرچا شروع ہوا اور سرکاری طور پر یا خانگی جو مدارس بھی قایم ہوئے وہ معلمین اور متعلمین کی سہولت اور ضرورت کے مدنظر درس کی تفہیم اردو زبان کے ذریعہ ہی کرتے تھے بہ الفاظ دیگر حیدرآباد کی عام تعلیم کی شروعات ہی سے یہ زبان بطور ذریعۂ تفہیم کے حیدرآباد کے اکثر چھوٹے بڑے مدارس میں رائج رہی ہے لیکن ملکی ضروریات نے جب سے سرکاری دفاتر میں بھی اس زبان کا رواج ناگزیر کردیا۔ اس کا حلقۂ اثر اور بھی وسیع اور مستحکم ہوگیا چنانچہ رفتہ رفتہ ملکی مالی پتہ حساب کتاب ریاستی کاروبار اور رسل ورسائل کی اصطلاحات کا ایک بڑا ذخیرہ اس زبان میں پیدا ہوتا گیا جس سے اس کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

عدالتوں میں اس کے رواج نے اس زبان کو علمی اور جامعی بنانے میں بھی ایک قدم آگے بڑھایا کیونکہ عدالتوں کے کاروبار کے دو رُخ ہیں جن میں سے ایک میں قانون سازی بالکل علمی اور جامعی طرز کا کام ہے اس کے شروع ہو جانے سے ملک کا قانونی علم، شعور اور احساس رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کر گیا کہ قانون کی اکثر و بیشتر اصطلاحات اس زبان میں فراہم ہوگئیں مختلف زبانوں کے بولنے والے ایسے قدیم وکلا کی ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں ہے جو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے لیکن قانونی علم میں وہ درک رکھتے ہیں جو شاید کم انگریزداں بھی رکھتے ہونگے ایسے وکلانے ملک کی بڑی بڑی ذمہ دارانہ خدمات بھی انجام دی ہیں حیدرآباد کے لئے جس وقت اعلیٰ تعلیم کے راستے پنجاب کی جامعہ کی طرف سے بند کردیئے گئے تو ملک میں جامعہ کے قیام کا احساس فطرتاً شدت کے ساتھ پیدا ہو گیا۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علی خان بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے سریرآرا ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے ملک کی شدید ضرورت کو محسوس فرمایا اور جو شغف آپ کو علم سے ہے اس کی بیش رفت میں اپنی تخت نشینی کی یادگار کے طور پر جامعہ عثمانیہ کے قیام کا حکم صادر فرمایا لیکن ملک کے خاص حالات ضروریات اور قدیم روایات کے احترام میں جامعہ کا ذریعہ تعلیم اُردو ہی قرار دیا۔

یہ اہل ملک کے لئے ایک مانوس چیز تھی اس لئے یہ ملک کے قلوب اور دماغوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی اور ایک قلیل مدت کے اندر اندر ملک کی علمی جدوجہد کا پورا نقشہ بدل گیا۔ ایک صاحب بصیرت بزرگ کے الفاظ میں گویا، علم نامانوس زبانوں میں مقید تھا وہ اس سرزمین میں آزاد کردیا گیا۔

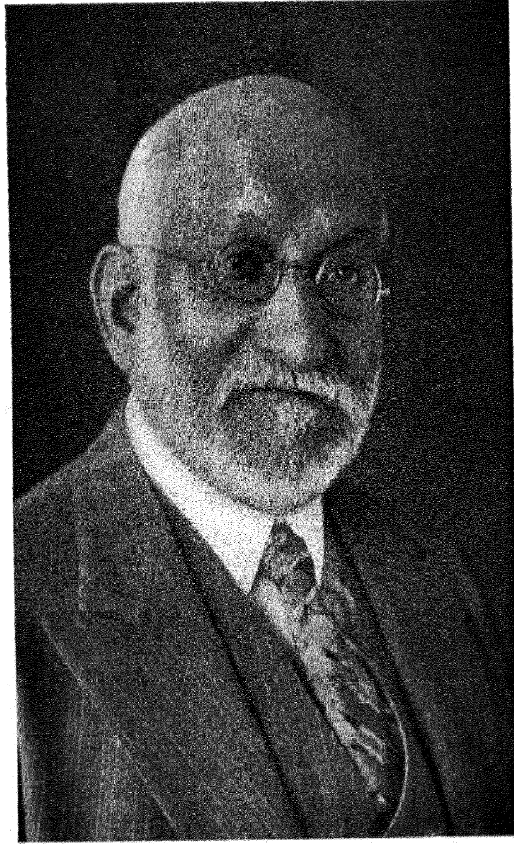
وہ حضرات جن کو حیدرآباد کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا جامعہ کے قیام اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد یہاں مستند پایہ کی علمی اور ادبی تصانیف کی کثرت کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تاریخی اور تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ واقعات کی رفتار اور سیلاب کے بہاؤ کے رُخ کو حضرت سلطان العلوم سے بڑھ کر کسی نے نہیں پہچانا۔ آپ نے ملک کو اپنی تخت نشینی کی یادگار میں وہ تحفہ عطا کیا جس کو آپ کی بصیرت افروز نظر نے ملک و قوم کی حقیقی ضرورت سمجھا اور اس تصفیہ ہی میں ملک کی موجودہ علمی چہل پہل اور ترقیوں کا راز پوشیدہ ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری ام۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

عہدِ عثمانی میں حیدرآباد کی اُردو مطبوعات

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم حضرت آصفجاہ سابع شہریارِ دکن و برار خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کے عہد حکومت میں حیدرآباد میں ایک نئی چہل پہل پیدا ہوگئی ہے۔ ملک کی جملہ خوابیدہ اور افسردہ قوتیں از سر نو بیدار اور شگفتہ ہوگئی ہیں اور اقصائے ملک میں نوجوانوں کی علمی و ادبی ترنگوں کا ذکر ہی کیا بوڑھوں کے قلوب میں بھی سرگرمیوں کی امنگیں موجزن ہوگئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گذشتہ ربع صدی کے اندر تین چار ہزار کتابیں صرف اُردو زبان ہی میں لکھی اور چھاپی گئیں۔ ان سب پر تبصرہ ایک جداگانہ کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔ چنانچہ اس مبارک عہد کے جملہ خدمت گذاران اُردو پر ایک مستقل کتاب ”عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی“ میں راقم الحروف نے نہایت اجمال کے ساتھ تبصرہ کیا ہے اور گذشتہ تین سال سے مجلہ عثمانیہ کے ہر شمارہ میں التزام کے ساتھ حیدرآباد کی ”جدید اُردو مطبوعات“ کے عنوان کے تحت ملک کی علمی و ادبی فتوحات کو روشناس کرنے کی کوشش جاری ہے اور اگرچہ جملہ کتابوں پر لکھنا دشوار ہے تاہم جو بھی نظر سے گذرتی گئیں اور کسی نہ کسی نقطۂ نظر سے اہم یا قابل ذکر معلوم ہوئیں ان سب پر تبصرہ کیا جاچکا ہے۔

خوش قسمتی سے ہم آجکل ایک ایسے عہد آفریں دور سے گذر رہے ہیں جو تصنیف و تالیف کے لحاظ سے دنیائے اُردو کا عہد زریں سمجھا جاسکتا ہے۔ اس عہد مسعود میں علم و فضل اور شعر و سخن کی جتنی اُردو کتابیں شائع ہوئی ہیں شاید ہی تاریخ ادبیات اُردو کا کوئی اور دور اس کی نظیر پیش کرسکے۔ ان میں سے بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جو اُردو زبان کی ادبیات عالیہ قرار دی جاسکتی ہیں



رائٹ انریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر
صدرالمہام فنیانس و صدر ریلوے کمیٹی.

ان سب کتابوں پر کسی ایک وقت تنقید و تبصرہ لکھنا مشکل ہے۔ اس لحاظ سے ہماری یہ کوشش آیندہ کے لئے سہولت کا باعث ہو گی کہ ہم مجلہ کے ہر شمارہ میں حیدرآباد کی چند جدید مطبوعات کو پیش کر رہے ہیں۔ اگر یہی کوشش جاری رہی تو چند سال کے عرصہ میں یہ چیز اس قابل ہو جائے گی کہ بجائے خود اس کا مجموعہ عہد عثمانی کی اُردو مطبوعات کے ایک مکمل اور مفید تذکرہ کا کام دے گا۔ اس وقت تک اس سلسلہ میں حسب ذیل کتابوں پر تبصرہ کیا جا چکا ہے

سنہ ۱۳۴۳ف:۔

(۱) پیت کی ریت — نواب صادق جنگ حلم کی ٹھمریوں اور ہندی طرز کے کلام کا مجموعہ

(۲) رباعیات جذب — پنڈت رگھویندر راؤ صاحب جذب وکیل کی اُردو رباعیوں کا مجموعہ

(۳) حضرت امجد کی شاعری — از مولوی نعیم الدین صاحب ہاشمی

(۴) حکایات امجد — حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی کی نثر کا اعلیٰ نمونہ

(۵) خیالات آزاد — مولوی محمد حسین صاحب آزاد حیدرآبادی کی نظموں کا مجموعہ

سنہ ۱۳۴۴ف

(۶) بندہ سے خطاب — مولوی رضا حسین خاں صاحب رشید ترابی، بی۔اے (عثمانیہ) کا قومی مسدس

(۷) معلمان تعلیم — از مولوی نفیس محمد صاحب صدیقی بی۔اے ڈپ ایڈ (عثمانیہ)

(۸) ہوش کے ناخن — ایک سماجی ڈرامہ۔ از مخدوم محی الدین ایم۔اے (عثمانیہ) و میر حسن صاحبان ایم اے (عثمانیہ)

(۹) عصر جدید — عہد عثمانی میں حیدرآباد کی ترقیاں۔ از جناب جانکی پرشاد صاحب

(۱۰) مثنوی رموز العارفین — مرتبہ مولوی سید احمد اللہ صاحب قادری

(۱۱) مختصر تاریخ دکن — مولفہ پروفیسر ہارون خاں شروانی ام۔اے

(۱۲) نظام علیخان حصہ دوم — مولفہ مولوی سراج الدین صاحب طالب

(۱۳) ابطال مادیت — مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ام۔اے پی اچ ڈی

(۱۴) حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی — از پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ام۔اے ال ال بی (عثمانیہ)

سنہ ۱۳۴۵ ف

(۱۵) شمیم وفا	مولوی محمد حبیب اللہ صاحب وفا کی نظموں کا مجموعہ
(۱۶) باغ فردوس	مولوی سید اعظم اللہ حسینی صاحب اطہر کے نعتیہ کلام
(۱۷) ذکر نبی	مولفہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
(۱۸) خواص مادہ	مولفہ مولوی سید محمد علیخان صاحب و مولوی سید عبدالرحمان صاحب پروفیسران جامعہ
(۱۹) چمن زار حکایات	مولفہ مولوی عبدالسلام صاحب ذکی بی۔اے
(۲۰) اسباق الاشیار	مولفہ مولوی ابوالمحاسن محمد محسن خان صاحب متین
(۲۱) فلسفۂ جسم	مترجمہ میر حسن الدین صاحب بی اے ال ال بی (عثمانیہ)
(۲۲) فلسفۂ یاس	مولفہ ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ام۔اے پی اچ ڈی
(۲۳) لاسلکی نشر	مولفہ مولوی حبیب اللہ صاحب فاروقی بی۔اے ڈپ اڈ
(۲۴) رفتار خیال	جہاں بانو بیگم صاحبہ نقوی بی۔اے (عثمانیہ) کے افسانوں کا مجموعہ
(۲۵) امور خانہ داری	مولفہ ج نقوی صاحبہ بی۔اے (عثمانیہ)
(۲۶) ابن سعود	مولفہ فیض محمد صاحب صدیقی بی۔اے ڈپ اڈ (عثمانیہ)
(۲۷) یورپ کی ڈاک	شہید یار جنگ بہادر شہید کے خطوط یورپ کا مجموعہ
(۲۸) مکتوبات امجد	حکیم الشعرا سید احمد حسین صاحب امجد کے خطوط کا مجموعہ
(۲۹) فطرت انسانی	مولفہ مولوی سید اسد اللہ صاحب بی اے
(۳۰) تمدن عتیق	مولفہ ابوظفر عبدالواحد صاحب ام اے و عطار الرحمن صاحب بی۔اے
(۳۱) آصف نامہ جلد ہفتم	مولفہ مولوی محمد حبیب اللہ صاحب وفا
(۳۲) رموز کائنات	مولفہ مولوی سید ہادی صاحب جعفری
(۳۳) عشق و محبت	مرتبہ مولوی تصدق حسین صاحب تاج
(۳۴) شہاب ماہوار	مدیر مولوی عبدالرزاق صاحب بسمل

(۳۵) الموسی سہ ماہی زیرنگرانی مولوی سید محمد اعظم صاحب، مولوی ابوظفر صاحب۔ مولوی سید محمد صاحب

(۳۶) آئینہ ادب ماہوار مدیر مونس احمد صاحب فرزند فصاحت جنگ جلیل

(۳۷) ارشاد ماہوار مدیر سید شاہ یوسف الدین صاحب قادری

(۳۸) خلیق ماہوار مدیر مرزا امام بیگ صاحب رونق قادری

ان کتابوں اور رسائل کے علاوہ آئندہ صفحات میں اور پانچ کتابوں یعنی خواتین عہد عثمانی، میری شاعری، سیاحت نامہ، داغ دہلوی، اور سراج سخن پر تبصرہ کیا جائے گا۔ اس طرح صرف گذشتہ تین سال کی ترتالیس (۴۳) کتابوں پر تو مجلہ عثمانیہ ہی میں تبصرہ شائع ہو رہا ہے ان کے علاوہ بیسیوں ایسی کتابیں ہیں جو قابل تبصرہ ہیں، مگر قلت فرصت کے باعث ان سب پر ایک ساتھ تبصرہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ ترتالیس[۴۳] کتابیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ انہی سے اہل ذوق اندازہ کرسکتے ہیں کہ عہد عثمانی میں حیدرآباد کی فضا علم وفضل اور شعر وسخن کے لئے کس قدر ساز گار ہوگئی ہے۔

خواتین عہد عثمانی

مولفہ مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی مددگار ناظم دفتر دیوانی ومال وغیرہ
چھوٹی کراؤن تقطیع ۸ × ۱۹۸ صفحات

یہ کتاب سلسلۂ اصلاح العشیرہ کی چھٹی کڑی ہے اس سے پہلے اس سلسلہ نے جو کتابیں شائع کی ہیں ان میں زیادہ تر مذہبی ہیں مثلاً تحفتہ الخلان مولفہ مولوی خلیل اللہ خلف قاضی بدرالدولہ، فوائد بدریہ، اور ریاض النسواں مولفہ قاضی بدرالدولہ وغیرہ۔ غیر مذہبی کتابوں میں عہد سلف مولفہ محمد مرتضیٰ مرحوم قابل ذکر ہے جس میں اسلام کے نشو ونما اور دکن میں اسلامی سلطنت کے قیام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ سلسلہ اصل میں اُس خاندان کی "انجمن اصلاح العشیرہ"، کا ترجمان ہے جو ستر سال سے حیدرآباد میں توطن پذیر ہے اور جس کے افراد میں منشی محمد سعید خان، مولوی حسین عطاء اللہ، مولوی عبدالقادر، مولوی صفی الدین، اور مولوی محمد مرتضیٰ وغیرہ نے حیدرآباد میں علم وفضل کی قابل ذکر خدمت کی ہے۔ اسی خاندان کے ایک رکن نصیرالدین ہاشمی صاحب عہد حاضر میں اُردو ادب کی خدمت میں سرگرم ہیں اور اگرچہ ملازمت و دفتر کی مشغولیتوں سے انھیں کم موقع ملتا ہوگا تاہم ان کی ہمت قابل ستایش ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن وبرار کے پچیس سالہ جشن سیمیں کی تقریب میں ملک کے اہل ذوق ارباب علم نے ملک کی ہمہ جہتی ترقیوں سے متعلق گذشتہ سال ڈیڑھ سال کے عرصہ میں بعض اہم اور پُر از معلومات کتابیں شائع کی ہیں جن میں سے چار پانچ مثلاً عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی، حیدرآباد کی تعلیمی ترقی، عصر جدید، ماڈرن حیدرآباد وغیرہ مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی وملکی

کی دلچسپی اور توجہ کا نتیجہ ہیں یہ کتابیں اتنی مقبول ہوئیں کہ انہی کے انداز میں اور اصحاب نے بھی کتابیں لکھی ہیں جن میں زیر نظر کتاب خاص کر قابل توجہ ہے۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جس پر ہمارے ملک میں عرصہ سے کام ہو رہا ہے اور ضرورت تھی کہ اس کے متعلق اب کوئی تفصیلی کتاب شائع کی جائے۔ حیدرآباد میں ابھی اس موضوع پر کتاب لکھنے والے کے لئے سہولتیں پیدا نہیں ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہاشمی صاحب کی کتاب کے لئے کافی مواد دستیاب نہ ہوسکا۔ یہاں کے اکثر اصحاب اپنی خواتین کے نام تک ظاہر نہیں کرنا چاہتے اس صورت حال کے لحاظ سے مولوی محمد غوث صاحب نے اس کتاب میں عرض حال کے تحت میں جو لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے کہ

"یہ کتاب ایک ابتدائی کوشش ہے اس امر کی کہ اس مسئلہ پر تعصب اور تنگ نظری سے علیحدہ ہو کر غور کرنے والے اصحاب کے لئے مسالہ اور مواد مہیا ہو جاتا ہے"

ہمیں توقع ہے کہ اگر مولوی ہاشمی صاحب اس موضوع پر اور مواد جمع کرتے رہیں گے تو اس کا دوسرا اڈیشن ہر طرح تشفی بخش ثابت ہوگا۔ موجودہ حالت میں بعض عنوانات کے تحت وہ خواتین کی صرف فہرستیں پیش کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں اور اگر وہ کوشش جاری رکھیں تو آیندہ ہر شعبۂ زندگی میں خواتین کی خدمات کے نمونے فراہم ہوسکیں گے۔ یہ موضوع ایسا نہیں ہے کہ روا روی اور عجلت میں اس کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔

اسباب بیداری کے بیان میں بھی ذرا تفصیل کی ضرورت تھی۔ مولوی محب حسین مرحوم اور مولوی خورشید علی صاحب کی خدمات اور کوششوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہئے تاکہ آیندہ کام کرنے والوں کو معلوم ہوسکے کہ اس میدان میں ہم سے پہلے کیا کیا کام ہو چکے ہیں اور اب کس نقطۂ نظر سے کام کرنے کی ضرورت ہے یہ کام مولوی ہاشمی صاحب سے بہتر کوئی اور نہیں کرسکتا۔ وہ اس تحریک اور اس کے بانیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان کے کارہائے نمایاں کے متعلق نہایت تحقیق سے لکھ سکتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک خدمت ہوگی جس کے لئے ملک اور اس موضوع کا ذوق رکھنے والے ہاشمی صاحب کے شکر گذار ہوں گے۔

سیاحت نامہ نواب محمد ظہیر الدین خاں بی۔اے (عثمانیہ) ڈبل کراؤن تقطیع ۱۰ + ۳۵۵ صفحات۔ تقریباً سو تصاویر۔ نستعلیق ٹائپ دارالطبع سرکار عالی۔ قیمت ۵ روپیے

یہ بلند پایہ ضخیم کتاب ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں کے لحاظ سے عہد حاضر کے بہترین اردو شہ کاروں میں قرار دی جاسکتی ہے

اس کی اشاعت پر حیدرآباد جس قدر ناز کرے کم ہے۔ نہایت اعلیٰ پایہ کاغذ پر سرکار عالی کے ایجاد کردہ ٹائپ میں باتصویر چھپی ہے اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اُردو زبان اور رسم الخط میں ترقی اور زندگی کی قطعی اہلیت ہے۔ جو اصحاب اپنی زبان کی طباعت کے صرف نقائص پر نظر رکھتے ہوں اگر اس کتاب کو ایک دفعہ دیکھ لیں تو ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

یہ خوشنما کتاب جامعہ عثمانیہ کے ایک لائق سپوت نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب بی۔ اے خلف اکبر نواب معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ کے حالات سفر یورپ و امریکہ پر مشتمل ہے جو دوران سفر میں بطور روزنامچہ کے تحریر کئے گئے تھے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس نوجوان اہل ذوق نے یورپ اور امریکہ جیسے ہوش ربا ماحول میں بھی اپنا روزنامچہ لکھنا ترک نہیں کیا۔ اس کے سرسری مطالعہ ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مولف نے کتنے بسیط واقعات و حالات روز کے روز قلمبند کر لئے ہوں گے اور یہ کہ حیدرآباد کے امرائے عظام کے خاندانوں میں اب بھی ایسے افراد موجود ہیں جو اپنے اسلاف کے ذوق علم و فضل سے بے بہرہ نہیں ہیں۔

یہ سیاحت نامہ نواب محمد ظہیر الدین خاں کے فطری ذوق ادب کا بہترین ثبوت ہے اور یقین دلاتا ہے کہ اگر ان کا یہی شغف علمی اور دلچسپی جاری رہی تو ان کی ذات اُردو کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ ملک کی بہت سی توقعات ان سے وابستہ ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ اپنے نامور اسلاف کے سچے جانشین ثابت ہوں۔

سیاحت نامہ نو ابواب پر منقسم ہے جن میں ۸ رمئی ۱۹۳۳ء سے ۸ راکٹوبر ۱۹۳۳ء تک (یعنی کل پانچ ماہ) کے حالات سفر درج ہیں۔ ۸ رمئی کو مولف نے حیدرآباد سے کوچ کیا اور ۸ راکٹوبر کو یہیں واپس ہو گئے۔ اس مختصر سی مدت میں اُنھوں نے جو کچھ دیکھا اس کو اس خوبی سے قلمبند کیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سفرنامہ شروع سے آخر تک دلچسپ ہے اور پر از معلومات۔

مولف نے اپنے موروثی عقیدہ کی بنا پر اس عظیم الشان کتاب کو ہز ہائی نس پرنس آف برار کے نام نامی پر حسب ذیل الفاظ میں معنون کیا ہے۔

> میں اپنے حقیقی جذبہ وفاداری اور پُرخلوص عقیدت مندی کی بنا پر اپنے اس ناچیز سفرنامہ یورپ و امریکہ کو میجر جنرل شہزادہ والا شان حضرت نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد و سپہ سالار دولت آصفیہ کے نام نامی سے معنون کرنے کی عزت حاصل کرتا ہوں۔"

اس سیاحت نامہ کی اہمیت اور اس سے متعلقہ دیگر امور کی وضاحت اس کے دیباچہ کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہو گی

"جب میں یورپ و امریکہ کے سفر کے ارادے سے نکلا تو یہ خیال بھی نہ تھا کہ میرے اس سفر کے حالات شائع ہوں گے۔ میں نے

روزانہ کے حالات و واقعات کو صرف اپنی ذاتی یادداشت کے لئے قلمبند کرنا شروع کر دیا تھا اور اتفاق کی بات ہے کہ یہ کام مستقل طور پر اختتام سفر تک برابر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ان سے دو تین ضخیم یادداشتیں تیار ہوگئیں۔

جب میں حیدرآباد واپس ہوا تو اُن کو احباب واعزا اور حضرت والد صاحب قبلہ (مدظلہ) کو دکھلانے کا موقع ملا۔ سبھوں کو یہ یادداشتیں اتنی دلچسپ معلوم ہوئیں کہ ان میں سے اکثروں نے ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ میں ابھی پس و پیش ہی میں تھا کہ میرے رفقائے کالج نے مجلہ عثمانیہ میں میرے حالات سفر کے تذکرہ کے ساتھ میری ان یادداشتوں میں سے ایک حصہ اشاعت کے لئے طلب کیا اور اس قدر متقاضی ہوئے کہ مجھے "ہالی وڈ کی سیر" کے عنوان سے اس کا ایک ٹکڑا بھیجنا ہی پڑا جو مجلہ جلد ۱، شمارہ دوم بابتہ ۱۳۴۳ف میں شائع ہوا۔ اس کا چھپنا ہی تھا کہ چاروں طرف سے مجھ پر تقاضوں کی بوچھار شروع ہوگئی۔ دوسرے رسائل والوں نے خط بھی لکھے اور اکثر محفلوں میں دوست احباب نے سفرنامہ کی اشاعت کی طرف توجہ دلانی شروع کی۔

میرے کالج کے ساتھیوں نے مجھے پھر مجبور کیا اور آخر کار ایک اور حصہ "شکاگو کی صدسالہ نمائش"، حاصل کر لیا جو مجلہ عثمانیہ کے بعد کے نمبر میں شائع ہوا۔ بالآخر میں نے اس بارے میں اپنے محترم اُستاد ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ پروفیسر اُردو سے مشورہ لیا تو موصوف نے ان یادداشتوں کو دیکھ کر بے حد اظہار پسندیدگی فرمایا اور ان کو قابل اشاعت قرار دے کر میرے پس و پیش کو دور کرنے کے لئے وعدہ فرمایا کہ چھپتے وقت ضرور ان پر نظر ثانی کریں گے۔

بہرحال میں اپنی یادداشتوں کو بعینہٖ شائع کر رہا ہوں۔ میں کوئی مورخ نہیں کہ ہر مقام کی تاریخ اور دیگر تفصیلی حالات و واقعات بیان کرتا جاتا۔ اور نہ شاعر کہ مناظر قدرت و دیگر دلچسپیوں کے مبالغہ آمیز مرقعے پیش کرتا۔ میں نے جن جن چیزوں کو جس جس طرح دیکھا اور سمجھا ہے یا ان کی نسبت مقامی لوگوں سے جو روایتیں سُنی ہیں اُنھیں کو بعینہٖ اپنی زبان میں سادہ طریقہ سے قلمبند کر لیا ہے۔ اگر جغرافیہ یا تاریخ سے متعلق اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو میں قابل درگذر ہوں کیونکہ مجھے دوران سفر میں اس قسم کی علمی یا تاریخی تحقیقات کی ضرورت نہ تھی اسی طرح ممکن ہے کہ غیر زبانوں کے بعض غلط طریقے پر لکھ دیئے گئے ہوں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مجھے لسانیات دانی پر کوئی گھمنڈ بھی نہیں۔ اس کتاب کی زبان و بیان کے متعلق بھی یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ اس میں انشا پردازانہ کمال کے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ کسی قسم کے تکلف یا آورد سے کام لیا گیا ہے۔"

مولف کے اس اظہار انکسار کے باوجود یہ سیاحت نامہ دلچسپ انشا پردازی کا بھی ایک اچھا نمونہ ہے اور اس میں جو معلومات پیش کی گئی ہیں وہ بھی نہایت مفید اور کارآمد ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے ہر فیض یافتہ کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

داغ نور اللہ محمد نوری (عثمانیہ) چھوٹی کراؤن تقطیع - ۲۴ × ۲۱۰ صفحات ۸ تصاویر
قیمت عاہر

مولوی نور اللہ محمد صاحب نوری جامعہ عثمانیہ کے ان فیض یافتوں میں سے ہیں جن کو شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق ہے اور جو اپنی بسا کے مطابق اپنی زبان اور ملک کی خدمت گذاری میں خلوص اور ایثار کے ساتھ سرگرم عمل ہیں شعر و سخن سے متعلق ان کے متعدد مضامین مجلہ عثمانیہ اور آئینہ ادب میں شائع ہو چکے ہیں۔ خود بھی ایک رسالہ "شاعرہ" شائع کیا کرتے تھے جو نا موافق ماحول میں چل نہ سکا۔ نیز اُنھوں نے انتخاب کلام غالب مع شرح کے شایع کیا ہے جو ادب کے طلبہ کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے نظم طبا طبائی مرحوم اور حضرت جلیل استاد السلطان پر ان کے جو مضامین مجلہ عثمانیہ میں شایع ہوئے ہیں نہایت دلچسپ اور اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اُنھوں نے داغ پر بھی لکھنا شروع کیا تھا۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ "سلسلۂ ادبیات اردو" کی طرف سے اُن بلند پایہ اساتذۂ سخن کا ایک تذکرہ شائع کیا جائے جنھوں نے دہلی اور لکھنؤ سے ہجرت کر کے حیدرآباد کو اپنا وطن بنا لیا اور آخر کار یہیں کے ہو رہے۔

اثنائے کار میں حضرت جہاں استاد کے متعلق نوری صاحب کو اتنا مواد ہاتھ آ گیا کہ بجائے مضمون کے ایک کتاب تیار ہو گئی جو دلچسپی اور معلومات دونوں نقاط نظر سے قابل قدر ہے۔ حضرت داغ دہلوی کی ہستی اتنی رفیع الشان ہے کہ ان پر ابھی اور لکھنے کی گنجائش ہے اور کیا تعجب ہے کہ خود نوری صاحب اس موضوع پر کام جاری رکھیں اور کسی وقت اسی زیر نظر کتاب کا دوسرا مکمل ایڈیشن شائع کریں جو فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ کی مکمل سوانح حیات کا کام دے سکے۔

بحالت موجودہ بھی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب بے حد غنیمت ہے اور اہل اُردو کو نوری صاحب کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کی طرف توجہ کی جو ابھی بہت تشنہ ہے اور ضرورت تھی کہ اس پر قلم اُٹھایا جاتا۔

اس کتاب کو دس فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں داغ کے حالات زندگی، ان کا ماحول، ان کی شاعری کے محرکات، ان کا مقصد اور فلسفہ زندگی، مقامی عناصر، اسلوب بیان، اور تلامذہ وغیرہ پر وضاحت سے بحثیں کی ہیں۔ ان سب میں دو عنوانات کے تحت یعنی داغ کی شاعری کا مقصد اور فلسفہ زندگی اور داغ کا ہندوستانی زبان میں تعمیری حصہ ضروری اور نئی معلومات خوبی سے پیش کی گئی ہیں حالات زندگی کا حصہ ابھی تشنہ ہے ان کے والد اصل میں رئیس فیروز پور جھرکہ تھے۔ لوہارو کے رئیس اُن کے چچا نواب امین الدین احمد خاں تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں لوہارو کے رئیس کبھی نہ رہے۔ اس سلسلہ میں اس امر کی ضرورت تھی کہ داغ کے آبا و اجداد کا ذکر وضاحت سے کیا جاتا اور مرزا غالب سے ان کو جو قریبی رشتہ تھا وہ بھی بتلایا جاتا کیونکہ عام طور پر داغ کے خاندان کے متعلق غلط فہمیاں اور بدگمانیاں

پھیلی ہوئی ہیں۔

مولوی نوری صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں بعض ایسے امور کا تذکرہ کیا ہے جو اس موضوع اور کتاب کے شایان شان نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے متن کتاب میں داغ کی جو کچھ خوبیاں بیان کی ہیں اور ان کی شخصیت کو جس قدر عظیم الشان ثابت کیا ہے۔ دیباچہ میں اُن سب کا تخلیہ کیا ہے گویا ایک ہی کتاب میں دو مختلف موضوعوں پر مباحثہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا موضوع تو یہ ہے کہ ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر اپنی زبان اور ملک و قوم کی کس خوبی سے خدمت کر سکتا ہے۔ لیکن دیباچہ میں یہ لکھا ہے کہ بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلہ میں ایک معمولی سپاہی کو بھی ادب کی خدمت میں فضلیت حاصل ہوتی ہے۔ نوری صاحب فردوسی اور سلطان محمود غزنوی کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں:-

"اُس کا (محمود غزنوی کا) ایک ادنیٰ سپاہی بھی ادب کی خدمت کرنے میں فردوسی سے چار قدم آگے تھا"۔ اس عجیب و غریب بحث کو جاری رکھتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ

"اگر عہدہ دار اور اس کے ماتحتین عمدگی سے اپنے فرایض کو بجا لا رہے ہیں تو وہ اپنے ادب اور زبان کی بنیادوں کو مستحکم کر رہے ہیں"

غرض کتاب کا پورا مقدمہ یعنی تقریباً بیس صفحات اسی عجیب و غریب ذہنیت اور انتشار خیال کے نذر کر دئے گئے ہیں اسکو پڑھنے کے بعد کتاب کے متعلق بڑی خراب رائے قایم کرنی پڑتی ہے حالانکہ اصل کتاب نہایت سنجیدہ دماغی اور صحیح نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس قابل ہے کہ اُردو شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے اس کے مطالعہ سے مستفید ہوں۔ ہمیں توقع ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں موجودہ خامیوں کو دور کر کے اصل موضوع کی طرف زیادہ توجہ کی جائے گی۔

سراج سخن یعنی انتخاب کلام سیّد شاہ سراج الدین اورنگ آبادی:-

مرتبہ:- پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ایم اے ال ال بی
۱۵۲ صفحات چھوٹی کراؤن تقطیع۔ قیمت ۱۲ ار

سلسلہ انتخابات شعرائے دکن کے لئے مولوی عبدالقادر سروری صاحب نے حضرت سراج اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت دلچسپ اور معیاری انتخاب کیا ہے اور ساتھ ہی دکن کے اس عظیم الشان شاعر کے حالات زندگی اور طرز سخنوری پر نہایت محققانہ اور پُر از معلومات مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ مولوی سروری صاحب کو شعر و سخن کا بڑا اچھا ذوق ہے اور ہم چشموں میں وہ اپنی سخن فہمی کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں ان کی کتاب جدید اُردو شاعری تمام دنیائے اُردو سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اور توقع ہے کہ ان کا انتخاب کلام سراج بھی خاص دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

سلسلہ انتخابات شعرائے دکن کی طرف سے سراج کے علاوہ اس وقت تک اور تین شاعروں ڈاکٹر احمد حسین مائل بسید ضیاء الدین حسن کیفی، اور نواب عزیز یار جنگ عزیز کے کلام کے معیاری مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور تین شعرا یعنی میر شمس الدین فیض، میر احمد علی عصر اور شیر محمد خاں ایمان، کے انتخابات کلام اس وقت زیر طبع ہیں۔ موخر الذکر دو شعراء کے کلام پر ایک اور صاحب ذوق مولوی سید محمد صاحب ایم اے نے کام کیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتابیں بھی جلد شائع ہو جائیں گی۔ اس طرح چند سال کے عرصہ میں اس سلسلہ کی طرف سے دکن کے بارہ اساتذۂ سخن کے انتخابات منظر عام پر آجائیں گے جن کی وجہ سے اُردو ادب میں اضافہ ہوگا اور اُردو کا ذوق رکھنے والے نوجوان اُن کے مطالعہ سے اپنے ذوق سخن میں ترقی کرسکیں گے۔

اس سلسلہ کی ہر کتاب میں ابتدائے دکن کی اردو شاعری سے متعلق ۱۶ صفحات کا ایک دیباچہ عمومی شامل رہتا ہے جس سے اس سرزمین کی خدمات شعر و سخن اور مختلف ادوار کی نسبت ضروری معلومات حاصل ہوسکتی ہیں بعد کے ۱۶ صفحات میں پیش نظر شاعر کے حالات زندگی پر نظر ڈالی جاتی ہے مگر بعض دفعہ صفحات کی یہ تحدید مضرت بخش ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ سراج سخن میں اس التزام کی بنا پر مولوی سروری صاحب کو بہت اختصار سے کام لینا پڑا اور نہ سراج اورنگ آبادی کی شاعری پر اس سے زیادہ لکھنے کی گنجائش ہے۔

کتاب میں حضرت سراج کی تحریر کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ انتخابات کی خوش قسمتی ہے کہ اس کو سراج کے اہم دیوان دستیاب ہوگئے۔ جن میں سے ایک پر خود شاعر کے قلم سے چار جگہ حاشیہ پر غزلیں لکھی ہوئی مل گئیں۔ یہ دیوان جو نواب عنایت جنگ بہادر کی ملک تھا سلسلہ کے ایک محسن پروفیسر حسین علی خاں صاحب کے توسط سے مولوی سروری صاحب کو حاصل ہوا۔ اس کی اہمیت کے متعلق خود مرتب نے اپنے مقدمہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔ اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

سید محی الدین قادری زور

عہدِ عثمانی میں علوم عربیہ کی خدمات

ملٹن نے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ ،، جنگ سے زیادہ فائدے امن میں پنہاں ہیں " تاریخ عالم کے صفحات پر نظر ڈالنے سے اس مقولے پر ہمارا ایقان ہر ہر قدم پر پختہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ جنگ و جدل کی وجہ سے جہاں آئے دن دنیا کے اکثر ممالک میں انقلابات عظیم ہونے کے تذکرے ہماری نظروں سے گزرتے ہیں وہیں ہم امن و امان کے دامن میں ترقی اور رفعت کی اُچھی موجوں کی کارفرمائی کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔ امن ہی نے قوموں اور ملکوں کی تاریخ میں وہ سنہرے واقعات چھوڑے ہیں جن کی وجہ سے دنیا میں ہر طرف تہذیب و تمدن کی ترقی ہوئی۔ اسی کی وجہ سے بڑی بڑی سلطنتوں نے انسانیت اور بنی نوع انسان کی حقیقی خدمات انجام دیں۔ اس میں شک نہیں کہ قیام امن کے لئے جنگ ناگزیر ہے لیکن دنیا کو ہمیشہ جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت رہی ہے اور رہے گی وہ امن کی ہے جنگ کی نہیں۔

قوموں کے عروج و زوال میں علوم و فنون کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ گویا کسی ملک یا قوم کی تاریخ وہاں کے علوم فنون کی بھی تاریخ ہے اسی لئے احیاء علوم میں سب سے زیادہ وہی قومیں حصہ لیتی رہی ہیں جن کی تواریخ



نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام سیا سیاست و تعلیمات
معین امیر جامعہ

صفحات انقلابات، سورشوں، ہنگاموں اور خانہ جنگیوں سے بالکل نہیں تو بڑی حد تک خالی ضرور ہیں۔
مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کے لئے ہم تاریخی شواہد پیش کرسکتے ہیں جن کے دیکھنے سے یہ بات بالکل ذہن نشین ہوسکتی ہے کہ امن میں وہ قوتیں مضمر ہیں جو جنگ میں نہیں۔ مثلاً سلطنت مغلیہ ہی کو لیجئے۔ ظہیرالدین محمد بابر نے اپنی انتہائی جدوجہد کے بعد اپنی زندگی کے آخری ایام میں صرف اس حد تک کامیابی حاصل کی کہ ایک نئی سلطنت کا بانی کہلائے۔ موقعہ شناس، مردم شناس، اور دور اندیش بابر کی عمر بھر کی کمائی کو ناعاقبت اندیش ہمایوں نے تھوڑے ہی عرصے میں غیروں کے حوالے کیا...... لیکن اسی خاندان کی قسمت میں علوم و فنون کی وہ بیش بہا خدمات لکھی تھیں جو آگے چل کر پایۂ تکمیل کو پہونچنے والی تھیں۔
جلال الدین محمد اکبر کے طویل اور پرامن عہد حکومت میں اصلاحات عمل میں آئیں قوانین مرتب ہوئے اور فنون لطیفہ کی ترقی کی جانب پہلا قدم اُٹھایا گیا۔ شاعری میں فیضی، عرفی اور تلسی داس جیسے شیریں سخن ترنم ریزی میں مصروف تھے تو موسیقی میں تان سین جیسا شہرۂ آفاق مغنی نغمہ سنجیوں میں غرق تھا اصلاحات اور ترتیب قوانین میں وزیر اعظم ابوالفضل اور ٹوڈرمل جیسے مدبر مصروف تھے تو سپہ سالاروں میں مان سنگھ اور شہزادہ سلیم اور مراد داد شجاعت دے رہے تھے۔
اس کے بعد جہانگیر کے زمانے میں فنون لطیفہ کی طرف نسبتاً کم توجہ کی گئی۔ پھر شاہ جہاں کا عہد زریں آتا ہے جبکہ ملک کا ہر ایک فرد راہ ترقی پر گامزن ہے۔ ہر شخص کے دل میں اپج اور رفعت کی امنگ خواہش پنہاں ہے۔ فنون لطیفہ کے انتہائی عروج کا یہی زمانہ ہے تاج محل، لال قلعہ، موتی مسجد، دیوان عام اور دیوان خاص! فن تعمیر کے اعلیٰ ترین نمونے تیار کئے جاتے ہیں کلیم جیسا شاعر بزم سخن کی روح رواں بنا ہوا ہے۔
دفعتہً محی الدین اورنگ زیب عالمگیر سا عظیم المرتبت شہنشاہ سریر آرائے سلطنت ہوتا ہے۔ مدرسہ نظامیہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ بڑے بڑے علما اساتذہ مقرر کئے جاتے ہیں اس عظیم الشان کارنامے کی سارے مشرق میں دھوم ہوتی ہے دور دراز سے شائقین علم اس سے مستفید ہونے کے لئے کھنچے کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے علمی کارنامے تاریخ کے صفحات پر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ لیکن یہ سب داستان ہے ایک طویل اور پرامن زمانے کی۔ اسی امن کی بدولت ہندوستان نے اورنگ زیب کے زمانے میں جتنی ترقی کی اس کی ہمسری شاید ہی کسی

زمانے میں ہو۔

یہی حال دنیا کے ہر ملک اور دنیا کی ہر قوم کا ہے۔ ترقی علوم کی مثالوں میں ہسپانیہ کی تاریخ دیکھیے۔ عہد عباسیہ کی علم پروری کا مطالعہ کیجئے یا مصر، عراق، حجاز، شام، فلسطین اور بصرے و کوفے کی علمی مجالس اور ادبی کارناموں کے تذکرے دیکھئے۔ ہر جگہ آپ کو دو امور ہی کارفرما نظر آئیں گے۔ آسودہ حالی اور فیاض سلاطین کی علم پروری !!

مذکورہ بالا بیان سے ہمیں صرف یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ کسی ملک و قوم میں علوم و فنون اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے جب تک کہ وہاں کامل امن اور آسودہ حالی نہ ہو اور جہاں سلاطین اور امراء عالموں اور ادیبوں کی ہمت افزائی اور قدر نہ کریں۔ اب انھیں امور کی روشنی میں ہم یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ ہمارے بادشاہ **سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر** کے عہد زریں میں حیدرآباد نے علوم عربیہ کی کونسی حقیقی خدمات بجالائیں۔

تقریباً نصف صدی ہوتی ہے کہ ہندوستان اس عرصے میں ہر قسم کی خانہ جنگیوں اور انقلاب انگیز ہنگاموں کو بھلا چکا ہے۔ اس زمانے میں قابل ذکر بیرونی خدشات بھی نہ رہے جس کی وجہ سے ملک ایک اضطرابی دور سے گزر سکتا بلکہ یہ نصف صدی رعایا کے حق میں مجموعی طور پر خوشحالی کا زمانہ ثابت ہوئی۔ ہر طرف علوم و فنون کے چرچے ہونے لگے۔ رعایا میں حصول علم کی زبردست خواہش پیدا ہوئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر متعدد یونیورسٹیاں اور کالج، سینکڑوں علمی ادارے اور کتب خانے اور ہزارہا مدارس جاری کئے جن سے تشنگان علم اپنے علم کی پیاس بجھانے لگے اور اسی سے مدد لے کر اپنے مقاصد حیات میں پوری کامیابی حاصل کرنے لگے۔

اسی مبارک دور میں ہمارے ملک حیدرآباد نے بھی ایک کروٹ لی۔ جیسا کہ میں نے ابتدا میں کہا ہے قابل اور فیاض فرمانرواؤں کا وجود ملک کی ہر جہتی ترقی کے لئے از حد ضروری ہے۔ اس خوش نصیب دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ یہاں روشن خیال اور علم پرور بادشاہ تخت سلطنت پر جلوہ فرما رہے غفران مکان **نواب میر محبوب علیخان بہادر** کے عہد میمنت مانوس میں احیاء علوم و فنون کی جانب قدم اٹھایا گیا۔ شاہ موصوف نے اپنے آباء و اجداد کی طرح تعلیمی ضرورتوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا اور اسی میں بعض ایسے مدارس کی بنیاد ریاست حیدرآباد میں پڑی جو یہاں کے مشاہیر کی سوانح عمریوں میں ایک ج

لائینفک کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً مدرسۂ نظامیہ، مدرسۂ فخریہ، مدرسۂ محمدیہ، مدرسہ دارالعلوم اور آخری عہد میں مدرسۂ عالیہ وغیرہ
نواب میر محبوب علیخان بہادر کے بعد علمی سرپرستی کے لئے ہماری خوش بختی سے نواب میر عثمان علیخان بہادر جیسی علم پرور ہستی ہمیں میسر آئی۔ ملک کی ہر جہتی ترقی سے قطع نظر آپ کے عہد زریں کا لازوال کارنامہ "عثمانیہ یونیورسٹی" کا قیام ہے جو اس قابل ہے کہ آپ کے نام نامی کو علم پرور مشاہیر عالم کی صف اوّل میں جگہ دے اسی کے ساتھ ساتھ ظل اللہ نے اور بہت سے ایسے سرکاری علمی اداروں کو جاری کیا اور خانگی مجلسوں اور انجمنوں کی امداد و سرپرستی فرمائی جس کی وجہ سے آپ کی حقیقی عظمت اہل علم کے قلوب پر مرتسم ہوگئی۔

اس کے ماسوا شاہ ذیجاہ نے ہندوستان اور حیدرآباد کے علاوہ دیگر ممالک کے مشہور عالموں اور قابل ادیبوں کی وقتاً فوقتاً اعانت فرمائی (براہ راست نہ بھی ہو تو جامعہ عثمانیہ کی جانب سے) اور ان کی علمیت اور تبحر سے اہل ملک کو فائدہ اٹھانے کا پورا موقعہ عنایت فرمایا۔ یہی وہ کارنامے ہیں جن کی وجہ سے چند سال پہلے علمار ہند کی جانب سے آپ کی خدمت میں بجا طور پر "سلطان العلوم" کا خطاب پیش کیا گیا۔

اب ہم حیدرآباد کے ان مولفین اور مصنفین کا ذکر کریں گے جنھوں نے اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے عہد حکومت میں عربی علوم کی حقیقی خدمات میں اپنی عمریں بسر کیں اور جنھوں نے اپنے پیچھے ایسی قابل یادگاریں چھوڑی ہیں جو صحیح معنوں میں اہل علم کے لئے کارآمد اور نفع بخش ثابت ہوسکتی ہیں۔ اس کے بعد ہم ان اداروں کا ذکر کریں گے جن میں ظل اللہ کی سرپرستی میں علوم و فنون عربیہ کی وہ خدمات جلیلہ انجام پائیں جن کا شہرہ نہ صرف مشرق میں ہے بلکہ جنھوں نے یورپ کے طبقۂ مصنفین میں ایک ہلچل ڈال دی ہے۔

اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر صاحبین کا ذکر کریں گے جنھوں نے باوجود درس و تدریس کی کش مکش پیہم کے امور علمی میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا۔

مولوی سید ابراہیم صاحب مددگار پروفیسر عربی نے، جو اس زبان کے بہترین شاعر ہیں، ابوالعلاء المعری کی طرح ایک رسالہ موسوم بہ "رسالۃ الغفران" لکھا ہے۔ انھوں نے اس کی ایک شرح بھی تیار کی ہے جس کو انھوں نے ابھی منظر عام پر لانا پسند نہیں کیا۔ دائرہ تصنیف و تالیف سے ہٹ کر بھی ان کی شخصیت ہر طرح قابل تقلید ہے ان کی علمیت اور تبحر کی شہرت نہ صرف دکن اور ہندوستان تک محدود ہے۔ بلکہ دیگر ممالک مصر، عرب وغیرہ

میں بھی ان کا نام پہونچ چکا ہے۔ طرز تعلیم اور اصول تفہیم میں یہ مشرقی انداز کے قائل ہیں۔ یہ نہ صرف عربی ادب ہی کے ماہر ہیں بلکہ اسلامی قوانین، فقہ، اصول، حدیث، کلام اور تفسیر وغیرہ پر بھی کافی عبور رکھتے ہیں اور ان کا نام ان اشخاص کی فہرست میں پیش پیش رہنے کے قابل ہے جنھوں نے اپنی زندگی کا مقصد درس و تدریس قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر عبدالحق صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بی۔ لٹ۔ ڈی فل موجودہ صدر شعبۂ عربی نے دیوان ابوتمام پر ایک بسیط تنقید کی ہے اور اس کی ایک شرح بھی لکھی ہے جو زیور طباعت سے ابھی آراستہ نہیں ہوئی۔ آپ علوم عربیہ کے لئے جدید طریقۂ تعلیم کو مفید تصور کرتے ہیں۔ آپ طلبا رشعبہ عربی کی ترقی کے سرگرم ممد اور جامعہ میں جدید عربی ادب کے علمبردار ہیں۔

مولوی سیف بن سلطان حسین صاحب ایم۔ اے ایل۔ بی (عثمانیہ) لکچرر عربی جامعہ عثمانیہ نے دو کتابیں تیار کی ہیں جو عنقریب شائع کی جائیں گی۔ ایک علم نحو سے متعلق ہے جس کا نام "جامع النحو" ہے اور دوسری کا نام "فوح المدام عن رباعیات الخیام" ہے۔ یہ حکیم عمر خیام نیشاپوری کی رباعیات کا منظوم ترجمہ ہے۔ انھوں نے عربی رباعیات میں بھی اسی خوبی، سلاست پاکیزگی اور ندرت خیال کو قایم رکھا ہے جو خیام کی رباعیات میں ہے۔

مولوی عبدالقدیر صاحب صدیقی سابق پروفیسر دینیات جامعہ عثمانیہ نے بھی عربی زبان کی کچھ کم خدمات انجام نہیں دیں۔ تیس پینتیس (۳۵) سال تک نیازمندان علم کو اس کے حقایق سے آگاہ کرتے رہے۔ دن اور رات شغل علم ہی میں کٹتے۔ کلیہ کے علاوہ گھر پر بھی شائقین علم و ادب کی رہبری کرتے، آپ نے دو کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں ایک کا نام "الدین" ہے جو حدیث سے متعلق ہے اور دوسری کا نام "التعلیم الطبعی فی اللسان العربی" ہے آپ اس زبان کے شاعر بھی ہیں اور حال ہی میں ایک دیوان بھی شائع کیا ہے جس کا نام "زفرات الاشواق" ہے۔

مولوی غلام نبی صاحب سابق مددگار پروفیسر عربی جنھوں نے اسی سال وظیفہ پر علیحدگی اختیار کی، حقیقتاً بے حد قابل اور ہر دلعزیز اساتذہ میں سے تھے۔ عربی نظم کو آپ اس خوش اسلوبی سے ذہن نشین کرادیتے تھے کہ مدتوں وہ نکات طالب علم کے ذہن کا عزیز ذخیرہ بن جاتی تھی۔ فارسی اور عربی شاعری پر یکساں عبور ہونے کی وجہ سے آپ مطالب کے سمجھانے میں دونوں کے امتزاج سے وہ دلچسپی پیدا کرتے کہ بس لطف اٹھایا کیجیے!!

سابق پروفیسر صاحبین میں مولوی سید اشرف صاحب شمسی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کی کینت

بوشریف ہے بہ سنہ ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ فرقہ مہدویہ سے تعلق تھا۔ ابتدا ہی سے حصول علم کا چسکا لگ چکا تھا۔ مدرسہ محمدیہ میں تعلیم پائی جس کو مولوی انوار الاصفیہ صاحب نے اپنے فرزند علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر کی تعلیم کے لئے قائم کیا تھا اور سنہ ۱۳۰۴ھ میں مکہ مسجد میں علماء کے ایک جلسہ میں دستار فضیلت آپ کے سر باندھی گئی۔ آپ کے اساتذہ میں مولوی محمد عباس علیخان صاحب علی پوری، خان علامہ اور مولانا عبدالصمد صاحب قندھاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں

آپ کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

نام تصنیف و تالیف	مضمون تصنیف	زبان جس میں کتاب لکھی گئی	کیفیت
مقدمہ تفسیر لوامع البیان	تفسیر	عربی	یہ ان کی زبردست تفسیر کا مقدمہ ہے
لوامع البیان فی تفسیر القرآن	"	"	یہ معرکۃ الآرا تصنیف چار جلدوں میں ہے اور ہر جلد ہزار ہزار صفحات کی ہے۔
تلخیص النحو	نحو عربی	اردو	جو کافیہ مفصل اور مغنی کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے
رسالۃ المعراج	متعلق بہ معراج	"	×
العقائد	مذہب سے متعلق ہے	عربی	یہ بھی چار ضخیم جلدوں میں ہے اس میں عقائد کو نہایت وضاحت اور تفصیل سے قلمبند کیا گیا ہے
توضیح الکلام	علم کلام سے متعلق ہے	"	×
القول المختصر فی رکعتی الفجر	فقہ	اردو	چھوٹا سا رسالہ ہے
اللوامع المشرقہ فی کشف شرح الواحدۃ المطلقہ	تصوف " "	عربی	×
القول الاظہر فی شرح الفقہ الاکبر	کلام " "	"	×
کتاب الشہادۃ	×	اردو	×
خلاصہ اصول الشاشی	اصول فقہ	"	×
خلاصہ شمسیہ	منطق	"	×

نام تصنیف و تالیف	مضمون تصنیف	زبان جس میں کتاب لکھی گئی	کیفیت
رسالہ منطق	منطق	عربی	×
ابانۃ فی شرح الامانۃ	تفسیر	اردو	×
توضیح المرام فی قرأۃ الفاتحہ خلف الامام	حدیث	"	×
القول الاسلم فی تلخیص السلم	منطق	عربی	×
توضیح المنطق	"	اردو	×
تبیان الحقائق	تصوف	"	×
انوار رحمانی فی شرح مکتوب ملتانی	کلام	"	×
تنویر الدرایہ فی شرح اصول الروایہ	اصول	عربی	×
الایضاحات	کلام	"	×
القول المفید فی التجوید	تجوید	اردو	×
الحکمیۃ العملیہ	اخلاق	"	×
رسالہ عروض و قافیہ	عروض	"	×
رسالہ تجوید	تجوید	"	×
تقریر الفوائد فی تحریر العقائد	کلام	عربی	×
رسالہ ضرورت مہدی	حدیث	اردو	×
تنویر الہدایہ	"	"	×
القول المبین فی المصرمین	کلام	"	×
رسالہ ایصال ثواب	×	"	مختصر سا رسالہ ہے
شرح توضیح الکلام	کلام	"	×
الواح الذاہب فی شرح معدن الادب	"	عربی	×

نام تصنیف و تالیف	مضمون تصنیف	زبان جس میں کتاب لکھی گئی	کیفیت
رسالہ کشف المنطق	منطق	عربی	×
الحیات بعد الممات	×	اُردو	×
آئینہ سوز و ساز شمسی	دیوان	فارسی	ضخیم دیوان ہے
مجموعۂ غم طراز شمسی	"	"	"
" طربات شمسی	"	"	"
دیوان شمسی	"	"	دیوان غزلیات جو مدون کیا گیا ہے
بیاض شمسی	"	"	"
داستان ناز و نیاز شمسی	"	"	یہ آخری بیاض ہے
رسالہ دعا ر	حدیث	اُردو	×

شمسی صاحب کی تصانیف نہ صرف تعداد کے لحاظ سے بلکہ بلحاظ علمیت بھی ان کے نام نامی کو زندہ جاوید بنانے کے لئے بہت کافی ہیں وہ فارسی اور عربی دونوں زبانوں کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے چنانچہ ان کی بہترین شاعری کا بیشتر حصہ ابھی منظر عام پر نہ آنے کی وجہ سے ان کی حقیقی عظمت لوگوں کے دلوں پر اچھی طرح مرتسم نہیں ہوسکی۔ طوالت کے خیال سے ہم ان کے ولولہ انگیز کلام کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں البتہ صرف ایک چھوٹا سا قطعہ پیش کریں گے جس کو انھوں نے اپنے وظیفہ پر علیحدہ ہونے سے کچھ ہی دن پیشتر کہا تھا اور جو اپنے اندر جذبات عالیہ کی ایک بیمثال دنیا پوشیدہ رکھتا ہے جس کے ہر ہر لفظ سے علمی تجسس اور ادبی ذوق کی وہ امٹ خواہش ٹپکی پڑتی ہے جو مصنف کے دل میں آخری وقت تک پنہاں تھی۔ اور جس میں وہ جامعہ عثمانیہ اور اپنی تعلیمی خدمات پر فخر و مباہات کرتے ہیں۔

و لست بدار العلم البث ساعة	اذا کنت لا تدری مکانی و محتدی
فها ان ذا منی قریض نفثة	کما ینفث النفاث فی کل معقد
و اقرأت طلب العلوم بدارها	مقاصدها من کل باب و مقصد

اتانی طلاب من دیار بعیدۃ — فزودتهم بالعلم خیرا لتزوّد

فاوصلتهم من مولوی فاضل — الی کامل حتی ارتقوا کل مصعد

فاهدا اهم قلبی الی خیر بغیۃ — وارشدهم درسی الی خیر مرشد

انا البارغ العلام فی کل مبحث — انا فارس لمقدام فی کل مشهد

وانی اصادی النفس فی کل مرقب — وانی اواسی القلب فی کل مرصد

وما تبتغی نفسی غنی المال والثریٰ — لان الغنی بالعلم لی خیر مقصدی

واجزح من ذالبیت قبل وداعکم
اذا لم یکن فیہ قیامی بسرمد

ان کے فرزند بھی عربی قابلیت میں اپنے والد کے قدم بقدم نکلے تھے لیکن عین جوانی میں ان کا انتقال ہوا جس کی وجہ سے نہ صرف ان کے والد کو بڑھاپے میں ناقابل برداشت صدمہ پہنچا بلکہ میدان عمل سے ایک قابل ہستی گم ہوگئی جس کا جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ان کا نام سید علی تھا اور کنیت ابوالحسن۔ انھوں نے دیوان زہیر ابن ابی سلمیٰ کی شرح اردو زبان میں لکھی ہے جو شائع ہوچکی ہے اور بہت سارے عمدہ قصائد بھی عربی زبان میں تحریر کئے ہیں ان کا انتقال ۱۳۳۷ھ میں ہوا۔

اساتذہ بیرون جامعہ میں ڈاکٹر زاہد علی صاحب پروفیسر عربی نظام کالج کا نام خاص طور پر لینے کے قابل ہے۔ آپ نے حال ہی میں دیوان حسن ابن ہانی کی نہایت مفصل شرح لکھی ہے جو جدید ادب میں یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

مولوی سید نبی صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ جنھوں نے ادب عربی کی تکمیل مولوی سید ابراہیم صاحب سے کی ہے موجودہ زمانے کے اچھے شعرا میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کے قصائد عراق، فلسطین اور حجاز میں بھی کافی شہرت رکھتے ہیں۔ انھیں عربی صرف ونحو کے سمجھانے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ قدیم طریقوں سے گرم حفظ کرانے کے یہ سخت مخالف ہیں عربی میں بہت سے مقالے، تنقیدیں اور علمی مضامین لکھ چکے ہیں۔ اب درسی کتب تیار کر رہے ہیں۔ انتہائی اچھے خیالات کے آدمی ہیں طالب علموں پر بے حد مہربان رہتے ہیں۔

مولوی وحید الدین صاحب عالی مرحوم جنھوں نے حال ہی میں انتقال کیا عربی زبان کے بہترین شاعر تصور

کئے جاتے تھے۔ انھوں نے عربی زبان میں بعض نہایت عمدہ کتابیں لکھی ہیں تصنیف و تالیف کے میدان میں یہ بھی مولوی اشرف شمسی کے ہم پلہ تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے مفصل حالات اور کتابیں ہمیں اس مضمون کی تیاری کے وقت مل نہ سکیں۔

متذکرہ بالا مصنفین و مولفین کے علاوہ بہت سے ایسے اشخاص بھی دکن میں موجود ہیں جن میں علوم و فنون عربیہ سے بے حد دلچسپی ہے ان میں نواب مہدی یار جنگ بہادر بالقابہ کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ آپ نے اس علوم کے احیاء اور اس کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آپ نے متعدد بار اپنی تقاریر اور خطبات میں ان علوم کی تحصیل اور ترقی پر بہت زور دیا ہے اس لحاظ سے آپ کا نام عربی ادب کے محسنین میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ آپ ہی کی طرح نواب بہادر یار جنگ بہادر کی بھی قابل تقلید شخصیت ہے جو فدائیان ادب عربی کی فہرست میں شامل کی جاسکتی ہے

کسی زبان کی خدمت صرف اسی وقت خدمت نہیں کہی جاسکتی جبکہ اس کا خدمت کرنے والا اس کا ماہر اور اسی کا علمبردار ہو بلکہ اس زبان میں اگر اس کی دلچسپی بہ نسبت دوسری زبانوں کے زیادہ ہو اور اس کی نشر و اشاعت میں وہ ہر وقت حصہ لیتا رہے خواہ وہ کسی طریق پر ہو تو یہ بھی اس کی بڑی خدمت تصور کی جائیگی۔ گمنامی سے خدمت پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا اور اگر حقیقتاً کسی زبان کے سچے خادموں کو ڈھونڈھنا ہو تو شاید ہی آپ کو بلند بانگ دعوے کرنے والوں میں کوئی سچا خادم مل سکے۔ عالم کو شہرت کی پرواہ نہیں ہوتی بلکہ وہ خاموش اپنا کام کرتا رہتا ہے حتّٰی کہ شہرت خود اس کو ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ حیدرآباد میں بھی ایسے کام کرنے والوں کی کمی نہیں بلکہ بعض فدائیان علم و ادب نے گمنامی ہی میں اس دار فانی سے کوچ کیا اور دوسروں کو اس کی خبر بھی نہ ہونے پائی۔ اگر یہی قابل افراد آزاد ملکوں میں پیدا ہوتے تو آسمان شہرت پر مہر و ماہ کی طرح جلوہ گر رہتے لیکن وہ زمانہ بعید نہیں جب حیدرآباد بھی اپنے ان مشتاقان علم و ادب کے کارناموں کو روشنی میں لائے اور جس شہرت و نیکنامی کے وہ اپنی زندگی میں مستحق تھے، گو بعد از وقت سہی ہیں اس سے متصف کردے۔

یہاں ہم یاد رفتگان سے اپنے مضمون کو طویل کرنا نہیں چاہتے لیکن ان خادمان ادب کے نام پیش کردینا چاہتے ہیں جو گمنامی میں ہیں لیکن اپنی سعی پیہم سے باز نہیں آتے۔ حیدرآباد کی موجودہ علمی سرگرمیوں سے یہ اُمید ہو چلی ہے کہ ایک نہ ایک دن ان کے کارنامے ادبی دنیا کے آگے پیش ہوں گے اور انھیں بام رفعت پر پہنچا کر ہی رہیں گے

علوم و فنون کی فہرست میں سب سے بڑا رتبہ شاعری کو حاصل ہے۔ کوئی شاعر اس وقت تک عمدہ شعر نہیں کہہ سکتا

جب تک کہ وہ اس زبان پر پوری طرح حاوی نہ ہو جس میں شعر کہنا چاہتا ہے۔ حیدرآباد میں بہت سے ایسے قابل افراد گزر چکے ہیں اور موجود ہیں جو عربی میں عمدہ شعر کہہ سکتے تھے اور کہتے ہیں اور یہ اسی طرح پر اس زبان کی خدمت میں حصہ لیتے رہے ہیں ان میں مولوی بہاء الدین صاحب، مولوی محمد جعفر صاحب سرورؔی، برادر محمد عبدالقادر صاحب سرورؔی لکچرار اُردو جامعہ عثمانیہ، حبیب ابوبکر ابن شہاب سابق مددگار مدرس مدرسہ دارالعلوم، مولوی حکیم ہیبت اللہ صاحب احسن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

سرکاری اداروں میں ہم مختصراً دو کا حال تحریر کرکے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ پہلا تو شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ ہے جس میں شعبۂ تراجم عربی نے اس عہد میں بے حد شہرت حاصل کی ہے۔ مولوی عبداللہ عمادی صاحب مترجم کتب عربی نے ترجمہ کے کام کے علاوہ تصحیح اور پروف پر نظر ثانی کرنے کی خدمات بھی انجام دیں۔ جامعہ عثمانیہ کا یہ زرین کارنامہ ہر لحاظ سے عظیم الشان ادبی خدمات میں شمار ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد ادارہ دائرۃ المعارف ہے اس کو نواب عماد الملک مرحوم نے ۱۲۹۷ف میں بہ سرپرستی حضرت اقدس و اعلیٰ حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ قایم کیا۔ اس ادارہ کا قیام اس لئے عمل میں آیا تھا کہ ان مشہور و معروف علمار سلف اور ادبار سابق کی نادرہ کار تصانیف کو تلف ہونے سے بچالیا جائے جو دست برد زمانہ سے تقریباً فنا ہو جارہی تھیں۔ اس میں آٹھویں صدی ہجری تک کی اعلیٰ تصانیف شامل ہیں۔ اس مجلس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں انھیں ہم تفصیلاً بیان کرنا چاہتے ہیں۔ آسانی کے لئے ان مطبوعہ کتب کا جدول پیش کیا جاتا ہے جو دائرۃ المعارف سے طبع ہو کر عوام کے ہاتھوں میں پہونچیں جن میں تصنیف اور مصنف سے متعلق ہی ذکر ہوگا۔

جب غفران مکان نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کے عہد زرین میں ضرورت اس امر کی داعی ہوئی کہ ایک ادارہ قایم کیا جائے جس کے ذریعے ابتدائے اسلام سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی بیش بہا تصانیف کو جو تقریباً معدوم ہو چلی تھیں زیور طباعت سے آراستہ کرکے اہل علم کی صحیح رہنمائی کی جائے تو دائرۃ المعارف کے قیام کی تحریک کی گئی اور منظور ہو گئی۔ چنانچہ اس کے قیام کے وقت جو رپورٹ تیار کی گئی تھی اس میں اس کے بانین کے متعلق ہمیں حسب ذیل الفاظ ملتے ہیں:۔

اول من اعتنی بتأسیس هذه الجمعیة مولانا السید حسین البلگرامی

المخاطب بالنواب عماد الملک ناظر معارف الدولۃ الآصفیہ وکاتب
السر لحضرۃ السلطان النظام السادس والعلامۃ الجلیل المولیٰ عبدالقیوم
احد اساطین الشرعیۃ وذو المحاسن الظاہرۃ والباطنۃ مولانا انوار اللہ
خان المخاطب بالنواب فضیلت جنگ شیخ الاسلام فی البلاد الآصفیہ
غفر اللہ لهم اجمعین فضلاً وعنایۃ...... ولا ریب ان ہؤلاء الزعماء
بذلوا غایۃ المجهود باخلاص النیۃ وحسن الطویۃ فی ترصیص ہذہ
الجمعیۃ فطیب اللہ ثراهم"

اس زمانے میں ادارے کے بعض معاونین میں مفتی محمد سعید مدراسی، سید التحریر مظفر الدین، محقق، مولانا شیخ عبدالحق خیرآبادی، مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر سر سید احمد خاں، نواب سر وقار الملک، نواب سر عماد الملک، نواب محسن الملک منشی انوار اللہ خان، مولانا عبدالقیوم، نواب اقبال یار جنگ بہادر اور نواب رفعت یار جنگ بہادر جیسی مشہور علم دوست ہستیاں نظر آتی ہیں۔ اس کے سب سے پہلے صدر نواب وقار الامراء ہی تھے لیکن غفران مکان کے عہد میں صرف چند ہی کتب مہیا ہوئیں جو دائرۃ المعارف سے طبع ہو کر نکلیں۔

اس کے بعد آصف جاہ سابع سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر کے عہد میمنت مانوس میں اس ادارے کو بے حد اہمیت حاصل ہو گئی اور اس میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ آپ کے دور زرین کی ابتداء ہی میں جب اس کی تنظیم جدید ہونے لگی تو بعض مشہور علم نواز شخصیتیں بھی اس کی اعانت میں شریک ہو گئیں۔ حالیہ رپورٹ سے اس کی موجودہ حالت کا ایک خاکہ ہماری نظروں کے سامنے آ سکتا ہے مثلاً:-

"فی عهد حضرۃ الملک النبیل السلطان الاکبر میر عثمان علی خان نظام
الملک آصف جاہ السابع ازہرہ اللہ ایامہ الحمیدۃ"

"لما تفجرت ینابیع العلم فی ہذا العهد المیمون بتاسیس الجامعۃ الکبریٰ
العثمانیہ واقامۃ دار التالیف والترجمۃ وافتتاح المدارس الفنیۃ
والمعاهد الادبیۃ بذل سلطاننا الاشرف الاعرف بسلطان العلوم

عناية الجميلة الى هٰذه الجمعية العلمية وشرفها بالخطاب والمعونة العظيمة
واشار فى توقيعه الملوكى المؤرخ غرة جمادى الاخرة ۱۳۳۸ھ الى مقاصدها
الجليلة وامر بافتتاح دار تصحيح للكتب القديمه من العلوم العربية -
فامتثالاً لامره الكريم تجدد هٰذا المعهد بمساعدة الوزير الكبير
النواب السير حيدر نواز جنگ بهادر وزير المالية والنواب
عماد الملك رئيس الجمعية والنواب مسعود جنگ عميد الجمعية "

اس ادارے کے بعض مشہور معاونین اور علم دوست ہستیوں میں دکن، ہندوستان اور دیگر ممالک کے حسب ذیل مشاہیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

مولانا احسان اللہ سندھی، ڈاکٹر سالم کرنکوی پروفیسر جامعہ بون (جرمنی) مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابو عبداللہ محمد سورتی، ڈاکٹر ایچ. ریٹر، علامہ ابو الاشبال احمد محمد شاکر مصری، پروفیسر جامعہ ازہر، مولانا ابو الوفا افغانی اُستاد مدرسہ نظامیہ (دکن) ڈاکٹر آغناطیوس پروفیسر جامعہ لینین گراڈ (روس) مولانا عبدالوہاب صدر مدرس مدرسہ جمالیہ مدراس مولانا عنایت اللہ پروفیسر جامعہ جھنگ (پنجاب) الحاج مولانا معین الدین ندوی صدر مدرس مدرسہ اسلامیہ باقی پور، ڈاکٹر نکلسن پروفیسر جامعہ آکسفورڈ، مولانا محمد اسعد براده ناظر دار الکتب (مصر) ڈاکٹر شادہ پروفیسر جامعہ ازہر (مصر) ڈاکٹر میکس مایرہوف (مصر) ڈاکٹر داؤد چلپی مدیر "امور طبیہ" (بغداد) مولانا شیخ محمد نصیف (جدہ) علامہ بھجۃ البیطار (دمشق)

اس کی مجلس علمی کے عہدہ داروں میں حسب ذیل نام خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں. اس کے صدر علامہ نواب محمد یار جنگ ہیں اور مولانا محمود حسن صاحب، مولوی عبداللہ عمادی صاحب رکن دار الترجمہ، مولوی مناظر احسن صاحب گیلانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ، مولوی عبدالقدیر صاحب صدیقی سابق پروفیسر جامعہ، مولوی سید عباس حسین صاحب اور مولوی سید زین العابدین صاحب دیگر عہدہ دار ہیں اس کے سرپرستوں اور معاونین میں نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر بالقابہ، نواب مہدی یار جنگ بہادر بالقابہ، نواب ناظر یار جنگ بہادر، مولوی حسین عبدالمنعم صاحب، مولوی خان فضل محمد خاں صاحب اور سید ظہور الحق صاحب ہیں۔

عہد عثمانی کے اس بست و پنج سالہ مبارک عہد میں علمائے سلف اور ادبائے قدیم کی حسب ذیل نادرہ کار تصانیف کی طباعت اور اشاعت پایہ تکمیل کو پہونچ چکی ہے جس کی شہرت اور حقیقی عظمت کی دھاک نہ صرف ہندوستان اور ایشیا کے علمی و ادبی حلقوں میں بیٹھ چکی ہے بلکہ یورپ اور دیگر ممالک کے سارے اہل علم اس سود مند کتب سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں:-

اسمائے کتب مع مختصر حالات

اسم تصنیف یا تالیف	اسم مصنف یا مولف	تعداد جلد وصفحات	مصنف کا سنہ وفات	قیمت سکہ عثمانیہ	کیفیت
الکهف والرقیم فی شرح بسم اللہ الرحمن الرحیم	علامہ شیخ عبدالکریم سبط شیخ عبدالقادر جیلانی	۴۰ صفحات	.	۵ر	بسم اللہ کی بہترین شرح ہے
اعجاز البیان فی تاویل ام القرآن	شیخ صدر الدین محمد بن اسحاق قونوی	۳۵۰ ، ایک جلد	سنہ ۶۷۲ھ	[illegible]	سورۂ فاتحہ کی عدیم المثال تفسیر ہے
عمل الیوم واللیلہ	علامہ ابن السنی رحمۃ اللہ	.	سنہ ۳۶۴ھ	زیر طبع ثانی	رسول مقبول کے دن رات کے تمام اوراد و وظائف کو بحسن و خوبی یکجا جمع کیا ہے
مشکل الآثار	امام طحاوی	۴ جلد ۱۶۹۷ صفحات	سنہ ۳۲۱ھ	[illegible]	علامہ ممدوح نے نہایت وضاحت سے متعارض حدیثوں کے اعتراضات کو دلائل سے باطل قرار دیا ہے
جامع المسانید	قاضی القضاۃ ابو المؤید محمد بن محمود خوارزمی	دو جلد ۱۱۹۴ صفحات	سنہ ۶۶۵ھ	[illegible]	ان تمام مسانید کو جو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے محاسن و فضائل و مرویات سے ہیں نہایت عمدگی سے یکجا جمع کیا ہے
کنز العمال	مصنف علامہ سیوطی و مولف شیخ علی المتقی	۸ جلد ۲۸۴۳ صفحات	سنہ ۹۷۵ھ	[illegible]	مخزن حدیث ہے۔ علامہ سیوطی کی بہترین تصنیف ہے ترتیب بلحاظ حروف تہجی ہے
المستدرک مع التلخیص	امام ابو عبداللہ الحاکم	۴ جلد ۲۵۵۸ صفحات	.	[illegible]	علامہ موصوف کی یہ تصنیف حدیث اور علم حدیث کے سارے مسائل اور مباحث پر حاوی ہے
المعتصر من مشکل الآثار	تصنیف امام طحاوی تلخیص قاضی یوسف بن موسیٰ	ایک جلد ۴۷۶ صفحات		[illegible]	تلخیص کے ساتھ ساتھ سارے اعتراضات کے جوابات نہایت عمدگی سے دئے ہیں۔
کتاب الاعتبار	علامہ محمد بن موسیٰ حازمی	ایک جلد ۳۵۲ صفحات	سنہ ۵۸۴ھ	۸ر	احادیث ناسخ و منسوخ میں بہترین تصنیف ہے
القول المسدد فی الذب عن مسند احمد	حافظ ابن حجر عسقلانی	ایک جلد ۱۰۴ صفحات	.	۱۰ر	روایات مسند کے اعتراضات کے مدلل جوابات دیئے ہیں
الجوہر النقی فی الرد علی البیہقی	علامہ علاء الدین الماردینی ترکمانی	دو جلد ۶۵۲ صفحات	سنہ ۷۵۰ھ	[illegible]	سنن بیہقی پر برجستہ تنقید کی ہے حدیث اور اصول حدیث کے اہم مباحث مندرج ہیں
مسند ابو داؤد طیالسی	سلیمان بن داؤد البصری	ایک جلد ۴۰۶ صفحات	دوسری صدی ہجری	[illegible]	مسانید میں پہلی یا دوسری کتاب ہے مصنف ایک جلیل القدر محدث اور عالم تھے
احادیث قدسیہ	علامہ شیخ مدنی	ایک جلد ۲۴۸ صفحات	.	[illegible]	بلا واسطہ کسی فرشتے کے اللہ تعالیٰ نے رسول مقبول پر جو احادیث القا کی تھیں ان کا بے مثل مجموعہ ہے

اسم تصنیف یا تالیف	اسم مصنف یا مولف	تعداد جلد و صفحات	مصنف کا سنہ وفات	قیمت سکہ عثمانیہ	کیفیت
شرح تراجم ابواب البخاری	مولانا شاہ ولی اللہ دہلوی	ایک جلد صفحہ ۱۵۱	.	۱۴ ر	ابواب صحیح بخاری کے استعمال کو نہایت بہترین پیرائے میں حل کیا ہے۔
الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب رضی اللہ عنہم	علامہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ	دو جلد صفحات ۱۲۶۶	.	لعہ ۲۱	تمام صحابہ رضی و صحابیات کے حالات درج ہیں فن رجال میں اس کا درجہ سب پر مقدم ہے
کتاب الکنی والاسماء	علامہ ابوالبشر دولابی	دو جلد صفحہ ۴۸۰	۳۱۰ھ	صہ ر	علامہ ممدوح نے ایک کنیت کے جتنے صحابہ اور رواۃ حدیث ہیں ان میں کے ناموں کا شمار کیا ہے
تجرید اسماء الصحابہ رض	علامہ ذہبی تلخیص اسد الغابۃ	جلد دو صفحات ۸۲۸	.	۴ ر	اسد الغابہ کی تلخیص کے علاوہ اور بہت سے صحابہ رض کے اسماء کا اضافہ فرمایا ہے
کتاب الجمع بین رجال الصحیحین	علامہ ابوالفضل مقدسی المعروف بابن القیسرانی	جلد دو صفحہ ۶۷۰	.	۸ ر ۱۱	علامہ موصوف نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف میں رواۃ صحیحین کو یکجا جمع کیا ہے
قرۃ العین فی ضبط رجال الصحیحین	علامہ عبدالغنی بن احمد البحرانی الشافعی	جلد ۱ صفحہ ۶۴	.	۱۱ ر	رواۃ کے متعلق چند اصول کے علاوہ اشتباہ رواۃ صحیحین کو دور کیا ہے
تعجیل المنفعۃ فی رجال الائمۃ الاربعۃ	حافظ ابن حجر عسقلانی	جلد ۱ صفحہ ۵۶۰	۸۵۲ھ	۴ ر	ائمہ اربعہ کے ان رواۃ کو جمع کیا ہے جو صحاح ستہ کے علاوہ ہیں
تہذیب التہذیب	علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ	بارہ جلدوں میں ہے	.	۳۳ ر ۱۲	صحاح کے رواۃ کے علاوہ دوسرے رواۃ کو بالاستیعاب جمع کیا ہے فن رجال کی بہترین تصنیف ہے
لسان المیزان	" "	جلد ۶ صفحہ ۳۲۶۸	.	لعہ ۲۱	علامہ ممدوح نے اس کتاب میں ان راویوں کا ذکر کیا ہے جن پر متقدمین کو اختلاف تھا تنقید بھی کی ہے
الجواہر المضیئۃ	علامہ محی الدین ابو محمد عبدالقادر القرشی	جلد ۲ صفحہ ۹۸۰	۶۹۶ھ	ے ر	اسماء باری تعالیٰ و اسماء نبوی پر تفصیلی طور سے بحث کی ہے حنفی علماء کے حالات بھی ہیں
تذکرۃ الحفاظ	امام ذہبی	جلد ۵ صفحہ ۱۴۷۰	.	لعہ ۱۲	حفاظ حدیث کو طبقات کے ترتیب پر مرتب کرکے لکھا ہے صحابہ کرام کے حالات بھی ہیں
رسائل خمسہ اسانید	مختلف علماء	رسائل ۵ صفحہ ۲۲۳	.	۴ ر	مختلف کتابوں کو رسائل کی شکل میں علماء نے اسناد کے لئے جمع کیا ہے
دلائل النبوۃ	علامہ ابو نعیم اصبہانی	جلد ۱ صفحہ ۲۳۹	۴۳۰ھ	۴ ر	اس میں مصنف نے آنحضرت کے حالات دلائل نبوت اور آپ کے متعلق جملہ پیشنگوئیوں کو یکجا جمع کیا ہے
الخصائص الکبریٰ	علامہ سیوطی	جلد ۲ صفحہ ۵۹۰	.	۶ ر	آنحضرت کے تمام معجزات و خصائص کو مع حوالہ کتب حدیث یکجا جمع کیا ہے

نام کتاب	مصنف	جلد و صفحات	سنہ	جسامت	کیفیت
مناقب امام اعظم رحمۃ اللہ	موفق بن احمد مکی	جلد ۲ ص ۵۳۵	۵۶۶ھ یا ۶۶۸ھ مشتبہ ہے	۷/۱۰	امام اعظم کے حالات شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے ہیں اس کے ذیل میں امام اعظم کے مناقب نامی علامہ کردری کی کتاب بھی شامل ہے۔
سنۃ کتب العقائد مع شرح الفقہ الاکبر	چھ کتابوں کا مجموعہ ہے جس میں (۱) شرح فقہ اکبر مصنفہ شیخ ابو منصور ماتریدی (۲) " " مصنفہ شیخ ابو المنتہی احمد مغنیساوی (۳) شرح وصیت امام ابو حنیفہ (۴) کتاب الابانہ امام ابو الحسن اشعری (۵) جواب اعتراضات ادارد " "	ایک جلد صفحات ۵۳۹	۔	۸/۱۴	چھ کتابوں کا بے حد مفید مجموعہ ہے فقہ اکبر کی شرحوں کے علاوہ اعتراضوں کے جوابات اور ضمیمہ کتاب ابانۃ نہایت عمدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں
الروضۃ البہیۃ	علامہ شیخ ابی عذبہ احمد اللہ	جلد ۱ ص ۸۷	۔	۱۰/	علامہ موصوف نے اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مسائل مختلفہ کو بیان کیا ہے
السمط المجید	علامہ صفی الدین احمد بن محمد مدنی قشاشی	جلد ۱ ص ۱۰۴	۔	۸/۹	صوفیا کرام کی طرح بیعت خرقہ اور تلقین وغیرہ کا احادیث اور آثار سے ثبوت دیا ہے
الصارم المسلول	علامہ ابن تیمیہ	جلد ۱ ص ۶۰۰	۔	۶/۹	علامہ ممدوح کی مہتم بالشان تالیف انبیاء علیہم السلام کی عظمت و فضیلت بہت وضاحت سے بیان کی ہے
شفاء السقام	علامہ شیخ تقی الدین سبکی	جلد ۱ ص ۱۹۰	۔	۱۴/	آنحضرت صلعم کی زیارت کو احادیث و آثار صحابہ اور اقوال ائمہ سے ثابت کیا ہے
کتاب الروح	علامہ ابن قیم	جلد ۱ ص ۴۴۸	سنہ ۷۵۱ھ	۷/	روح کی حالت کو شریعت اور مذہب سے پوری طرح بیان کیا ہے قبر کی حالتیں بھی بیان کی ہیں
الذخیرۃ	علامہ علاء الدین طوسی	جلد ۱ ص ۲۷۲	سنہ ۸۷۷ھ	۸/۱۴	سلطان محمد خاں فاتح کے حکم سے علامہ غزالی کی کتاب تہافۃ الفلاسفہ اور دیگر کتب پر محاکمہ کیا ہے
استحسان الخوض	امام شیخ ابو الحسن اشعری	جلد ۱ ص ۲۱	۔	۱۴/	صفات باری تعالیٰ اور زمانہ کے متعلق غور و خوض کرنے کو صحیح ثابت کیا ہے۔

اسم تصنیف یا تالیف	اسم مصنف یا مولف	تعداد جلد وصفحات	مصنف کا سنہ وفات	قیمت سکہ عثمانیہ	کیفیت
الرسائل التسعة	علامہ سیوطی	رسائل ۹ صـ ۲۸۰	۰	عاـ/ ۴ر	ثابت کیا ہے آنحضرت کے والدین پر نار جہنم حرام ہے یہ کہ آنحضرت صلعم بعد وصال زندہ ہیں امام اعظم کے مناقب بھی ہیں
فتح المتعال فی مدح النعال	علامہ احمد بن محمد المغربی	جلد ۱ صـ ۴۲۰	سنہ ۱۰۳۹ھ	ـے ۴ر	تمام محدثین اور مورخین کے اقوال نبی کریم کے نعال مبارک کے متعلق جمع کئے ہیں
الاقتراح	علامہ سیوطی	جلد ۱ صـ ۱۸۰		عہ ۲ر	اصول نحو کی پہلی اور لاجواب کتاب ہے
مصداق الفضل	حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ	جلد ۱ صـ ۲۴۲	صحابی تھے	عہ ۸ر	آپ کے مشہور قصیدے بانت سعاد کی شرح ہے ہر شعر کے صرف و نحو و معانی و عروض سے بحث کی ہے
الفائق	علامہ ابو القاسم زمخشری	جلد ۲ صـ ۴۸۶	۰	عہ ۱۲ر	لغات حدیث میں بہترین تالیف ہے
المغرب	علامہ ابو الفتح الحنفی	جلد ۲ صـ ۶۵۰	سنہ ۶۱۰ھ	للعہ ۲ر	لغات اور مصطلحات فقہ کو حل کیا ہے
کتاب الازمنة والامکنة	ابو علی مرزوقی	جلد ۲ صـ ۶۳۹	۰	لـے ر	زمان، مکان، افلاک، کواکب اور بروج وغیرہ پر نہایت تفصیلی بحث کی ہے
النفائس الارتضیه	ارتضا علی خاں	جلد ۱ صـ ۸۸	۰	۱۴ر	رسالۂ عزیزیہ مصنفہ شاہ عبد العزیز دہلوی کی شرح مع تفصیل بیان و معانی
المنحة السراء	"	جلد ۱ صـ ۱۴۴	۰	عاـ/ ۴ر	مصنف نے اس میں اسماء باری تعالیٰ کے معانی اور ہر ایک کی تاثیر تفصیلاً تحریر کی ہے
مفتاح السعادة	علامہ احمد بن مصطفےٰ المعروف بہ طاش کبری زادہ	جلد ۲ صـ ۹۲۳	سنہ ۹۶۲ھ	لـے ر	جس میں علوم و فنون کی تعریف و غرض غایت اور ہر فن کی منتخب کتابوں کا جامع ذکر ہے
دستور العلماء	" "	جلد ۴ صـ ۱۵۲۸	"	۱۳ ر	اس میں مختلف علوم و فنون کے اصطلاحات و محاورات اور تاریخ کو بیان کیا ہے
شرح السیر الکبیر	علامہ سرخسی	جلد ۴ صـ ۱۵۸۵	۰	۱۶ ر	یہ سیر کبیر مصنفہ امام محمد کی بے نظیر شرح ہے فقہ حنفی کا بے بہا ذخیرہ دار الحرب اور جہاد پر عمدہ مباحث ہیں
دول الاسلام	علامہ ذہبی	جلد ۲ صـ ۵۶۶		ـے ۴ر	فن تاریخ میں بیش بہا تصنیف ہے۔

مرآۃ الجنان	علامہ ابو محمد عبد اللہ ابن اسعد یافعی	جلد ۴ صفحہ ۲۰۹۶	۷۶۸ھ	۱۶/۸	یہ کتاب غزوات شمائل، معجزات نبوی، مناقب صحابہؓ اور صوفیائے کرام کی کرامتیں اور ان کے حالات بحوالۂ تاریخ درج کئے گئے ہیں۔
التحفۃ النظامیہ	″	جلد ۱ صفحہ ۱۵۱	″	۱۴/	مختصر رسالہ ہے جس میں مترادف الفاظ کا فرق بتلایا ہے۔
رسالہ فی فضیلۃ العلم والصناعہ	امام ابو نصر فارابی	رسالہ صفحہ ۱۴	۔	۴/	اس کتاب میں علم وصنعت کی فضیلت پر بحث کی ہے
الفقہ الاکبر	امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ	جلد ۱ صفحہ ۱۶	۔	۹/	عقائد وکلام کا بہترین رسالہ ہے آخر میں امام اعظم کے مفصل حالات درج ہیں
کتاب المجتنی	علامہ ابن درید	جلد ۱ صفحہ ۱۰۰	۔	۱/۴	نادر الوجود تصنیف ہے ادبی نقطہ سے احادیث علمائے کرام اور دیگر فصحا کے اقوال کو جمع کیا ہے
مباحث مشرقیہ	امام فخر الدین رازی	جلد ۲ صفحہ ۱۲۹۵	۔	۳۰	علم کلام کی مہتم بالشان کتاب ہے تمام مسائل کلام پر تنقیح اور فیصلہ کیا ہے۔
جمہرۃ اللغۃ	علامہ ابن درید	جلد ۳ صفحہ ۱۱۰۴	۔	[illegible]	علم لغت کی بہت ہی مستند اور قابل قدر کتاب ہے تمام کتب لغت عربیہ کا ماخذ ہے
السنن الکبری للبیہقی	امام ابوبکر احمد بن حسین	دس جلدیں ہیں	۔	پہلی پانچ جلدوں کی	علم حدیث اور حدیث سے متعلق حقیقی تنقیدیں ہیں ان میں یہ شاہکار ہے
مع الجواہر النقی	بن علی بیہقی	طبع شدہ چھ جلد		قیمت ۱۲۵	اس کے ساتھ الجواہر النقی کا رسالہ بھی ہے
حماسۃ ابن الشجری	ابو السعادات ہبۃ اللہ ابن الشجری العلوی الغزی	جلد ۱ صفحہ ۳۲۷	۔	۸/	جامعیت اقوال میں حماسہ ابو تمام سے بازی لے گئی ہے۔ یورپ سے حاصل کی گئی۔
رسالہ اثبات المفارقات	حکیم ابو نصر فارابی	صفحہ ۸	۔	۴/	فلسفہ طبیعیات کا بہت اچھا رسالہ ہے۔
رسالہ مسائل متفرقہ	″ ″	صفحہ ۲۷	۔	۷/	مختلف مسائل کے جوابات نہایت خوبی سے ادا کئے گئے ہیں
رسالہ نصوص الحکم	″ ″	۔	۔	۶/	تصوف وحقائق الٰہیہ میں مختصر مفید رسالہ ہے
رسالہ تحصیل السعادۃ	″ ″	صفحہ ۴۵	۔	۱۲	علم طبیعیات اور معرفت میں نادر الوجود رسالہ ہے
السیاسات المدنیہ	″ ″	صفحہ ۷۶	۔	۸/	تہذیب وتمدن میں عدیم المثال رسالہ ہے۔
رسالہ التنبیہ علی سبیل السعادۃ	″ ″	صفحہ ۲۶	۔	۴/	حصول سعادت پر نہایت عالمانہ بحث کی ہے۔

اسم تصنیف یا تالیف	اسم مصنف یا مولف	تعداد جلد و صفحات	مصنف کا سنہ وفات	قیمت سکہ عثمانیہ	کیفیت
رسالہ تعلیقات فارابی	حکیم ابونصر فارابی	ص ۲۶	.	۶ر	مسائل امور عامہ وطبیعیات پر نہایت عمدہ پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔
کتاب التیجان	علامہ ابومحمد عبدالملک بن ہشام صاحب السیرہ	جلد ا ص ۴۹۸	.	صر	علم تاریخ میں معتبر کتاب ہے جس میں ملوک حمیر کے احوال نہایت تفصیل سے بیان کئے ہیں
الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ	علامہ ابن حجر عسقلانی	جلد ۴	.	[illegible]	آٹھویں صدی کے سلاطین امراء اور علماء کے حالات میں علم رجال کی عمدہ کتاب ہے
الامالی لابن الشجری	علامہ ضیاء الدین المعروف بابن الشجری	جلد ۲ ص ۸۵۵	.	[illegible]	مصنف نے اس میں نحو، صرف، بیان بدیع کلام، معانی وغیرہ کے اہم اصول بیان کئے ہیں
تنقیح المناظر	علامہ کمال الدین ابی الحسن الفارسی	جلد ۲ ص ۱۰۱۴	.	[illegible]	علم مرایا و مناظر میں لاجواب تصنیف ہے اور ان کے علوم کے اختلافات کو اشکال اقلیدس کے ذریعہ حل کیا ہے سب سے پہلی کتاب ہے جو دائرہ میں طبع
رسالۃ الدعاوی القلبیہ	.	.	.	۳ر	مسائل فلسفہ و تہذیب جامع طریق پر بیان کئے ہیں
رسالہ مقالہ فی اغراض مابعد الطبیعۃ	.	.	.	۲ر	مسائل مابعد الطبیعہ کو دلچسپ پیرایہ میں حل کیا ہے
رسالۃ زینوت الکبیر	.	.			علم کلام پر محققانہ بحث کی گئی ہے
تذکرۃ النوادر					مختلف علوم و فنون کی قدیم ترین اور نادر الوجود تصنیفیں ہیں مشہور مقامات اور وہاں کے مکاتب کے پتے بھی درج ہیں
فہرست الجمہرۃ	ابن درید	ص ۸۷۲	سنہ ۳۲۱ھ	[illegible]	مواد اسماء، شعراء، انہار، بقاع واماکن وغیرہ جدید اصول انڈکس کو پیش نظر رکھ کر تیار کی گئی ہے جس سے متن کو پڑھنا نہایت آسان ہوگیا ہے۔
نزہۃ الخواطر	مولانا حکیم عبدالحی لکھنوی مرحوم	ص ۲۱۴	.	۲ر	آٹھویں صدی ہجری کے علماء شعراء اور سلاطین کے مفصل حالات تحریر کئے ہیں۔
کتاب الامثال	.			عمر	مصنف نے مفید امثال اور ان کی شرح بہت عمدہ طور پر تحریر کی ہے پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہے کتاب الکامل کی تقلید ہے۔
صبح الامکنۃ	.				نزہۃ الخواطر کی مانند جغرافیہ ہند ہے مقامات اور رجال کے بسیط حالات بھی ہیں

ان کتب کے علاوہ بہت ساری قدیم کتب زیر تصحیح ہیں جن میں علامہ ابونعیم المتوفی ۴۳۰ھ کی حلیۃ الاولیاء علامہ ابن جوزی المتوفی ۵۹۷ھ کی صفۃ الصفوۃ سخاوی کی الضوء اللامع فی اعیان القرن التاسع علامہ سید عبدالقادر کی تصنیف "النور السافر اعیان القرن العاشر" علامہ ہلال ابن یحییٰ کی تصنیف "احکام الوقف" علامہ ابوالبرکات کی کتاب کتاب المعتبر علامہ زید ابن رفاعۃ کی تصنیف "الاربعین للرازی" خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

مندرجہ بالا تصانیف کے علاوہ جدید الطبع رسائل میں شیخ الرئیس ابوعلی ابن سینا کے حسب ذیل رسائل بھی طبع ہو چکے ہیں۔

(۱) رسالۃ الفعل والانفعال

(۲) رسالہ فی سر القدر عن معنی قول الصوفیہ

(۳) رسالہ عرشیہ

(۴) رسالہ فی السعادۃ

(۵) رسالہ فی اسباب الرعد والبرق

(۶) رسالہ فی الحث علی الذکر

(۷) رسالہ فی الموسیقی فقط

سید ابوالفضل بی۔اے

متعلم ایم۔اے (عربی)

حیدرآباد میں فن مُرغبانی کی ترقی

یہ مضمون بزم معاشیات و عمرانیات کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا

وہ تمام غذائیں جو انسان کے استعمال میں آتی ہیں تین بڑے اجزا پر مشتمل ہوتی ہیں جن سے تغذیہ بدن ہوتا ہے یا جو ضائع شدہ انسانی تار و پود کو بنانے یا اس کی مرمت کرنے یا حرارت و طاقت پیدا کرنے میں مدد معاون ہوتی ہیں وہ تین اجزا یہ ہیں۔

(۱) پروٹیڈ (Protead) (۲) کاروہائیڈریٹ (Carls Hydrate) (۳) چربی (Fat)

تحقیق سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ انڈے میں جو غذائی مادہ ہوتا ہے وہ بمقابل دودھ کے زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک عدد انڈا جس کا وزن تقریباً ۲ اونس ہوتا ہے نسبتاً زیادہ غذائی مادہ رکھتا ہے۔ اتنے ہی ہموزن دودھ سے حیات انسانی کی بقا کے لئے ۷۶ء کیلوری[1] حرارت ضروری ہے[2]

	پروٹیڈ	چربی	کاروہائیڈریٹ	پانی	نمک	فضلہ	مقدار حرارت جو ان سے پیدا ہوئی
انڈا	۱ر۱۳	۹ر۳	۰	۶۵۵	۹ر	۱۹ر۲	۶۳۵
دودھ	۳ر۳	۴	۵	۸۶	۷ر	۰	۳۱۰

[1] کیلوری مقدار حرارت کا نام ہے ایک کیلوری میں تقریباً اتنی ہی حرارت ہوتی ہے جتنی کہ نصف سیر پانی کو چار درجہ فارن ہائیٹ پر پہنچانے کے درکار ہو۔

[2] رہنمائے صحت لکھنؤ بابت مارچ سنہ ۱۹۳۶ء

متمدن ممالک میں انڈے بطور غذا کے زیادہ تعداد میں استعمال ہوتے ہیں اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف شہر پیرس میں ہر شخص ۲۰۰ انڈے سالانہ بطور غذا کے استعمال کرتا ہے۔ ہندوستان میں آبادی کی اکثریت انڈے کو ایک غلیظ و ناپاک چیز سمجھتی ہے۔ مسلمان، پارسی، کرسٹان اور نیچ طبقے کے ہندو انڈے استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح اگر ہم ایک سرسری اندازہ لگائیں تو معلوم ہوگا کہ ہر ہندوستانی کے استعمال میں سالانہ بمشکل ۲۰ انڈے آتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں انڈے نہ صرف بطور غذا کے استعمال ہوتے ہیں بلکہ بہت سی صنعتوں میں بھی کام آتے ہیں مثلاً ممالک متحدہ امریکہ میں سالانہ ۴۰۰ ملین انڈے کیالیکو کی چھپوائی میں صرف ہوتے ہیں۔ ۲۴۰ ملین جلد بندی اور دوسرے چمڑے کی صنعت میں۔

انڈے بطور غذا اور صنعتوں میں استعمال کے بعد بھی زیادہ تعداد میں بچ جاتے ہیں تو وہ آمدنی کا بھی ایک ذریعہ ہیں۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ جزائر برطانیہ میں سالانہ ۶، کروڑ ۵۰ لاکھ روپیوں کے انڈے صرف ہوتے ہیں جن میں سے ۴۰ فی صدی بالعموم چین، مصر، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا سے درآمد ہوتے ہیں بالفاظ دیگر یہ ممالک ۳۰ کروڑ ۶۰ لاکھ روپیے سالانہ برطانیہ سے انڈوں کی تجارت کے ذریعہ کماتے ہیں[۱]۔

ریاست حیدرآباد اُن چند ہندوستانی حصوں میں سے ہے جہاں فن مرغبانی کم وبیش عام طور پر جاری ہے۔ حیدرآباد کا اصیل مُرغ قدیم زمانے میں بہت مشہور اور ترقی یافتہ حالت میں تھا۔ اُس زمانہ میں اس کو عام طور پر لڑائی کے لئے سدھایا جاتا تھا۔ اس کو زوال میں آئے حال کی بات ہے۔ اب بھی بعض مقامات پر اس نسل کی اچھی مرغیاں نظر آتی ہیں۔ دیسی مُرغی حیدرآباد میں عام طور پر پائی جائیں گی بمشکل سے کوئی گاؤں ایسا نہ ہوگا جہاں یہ نظر نہ آتی ہو۔

دیہاتی آبادی ہی زیادہ تر مرغیاں پالتی ہے۔ بمشکل کوئی شخص ریاست حیدرآباد میں ایسا ملے گا جس کا اصل یا ثانی پیشہ مرغبانی ہو بلکہ یہ ایک ذیلی پیشہ ہے۔ ہماری دیہاتی آبادی جس بُری طور پر ان مرغیوں کی رکھ رکھاؤ کرتی ہیں وہ ناگفتہ بہ ہے۔ صبح ہوتے ہی مرغیوں کو کھولا جاتا ہے اور پھر انھیں باہر چگنے کے لئے نکال دیا جاتا ہے اور شام ہوتے ہی پھر انھیں بند کردیا جاتا ہے۔

مُرغیاں جو بند کی جاتی ہیں دو یا تو جھانپ میں یا ٹپکہ میں یا کڑاڑا میں۔ ان تین طریقوں میں صرف اوّل الذکر طریقہ (یعنی جھانپ میں بند کرنے کا) ایسا ہے جس میں ہوا کے گذرنے کے لئے کافی گنجایش ہوتی ہے۔ بقیہ دو تو قیدخانہ سے کچھ کم نہیں۔ صفائی کا کچھ خیال نہیں رکھا جاتا۔ اس طرح مرغیاں نہایت ہی ناموافق حالات میں پلتی ہیں اور جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو آسانی کے ساتھ اس کا شکار

---

[۱] Hyderabad Poultry Survey Report By Nizamuddin Hyder

ہوجاتی ہیں۔

بہ حیثیت مجموعی مرغیوں کو کوئی غذا نہیں دی جاتی صرف چوزوں کو باجرہ یا جوار چھڑکا جاتا ہے۔ جوں ہی کہ وہ ذرا بڑے ہوجاتے ہیں انھیں بھی ان کی ماں کے ساتھ چگنے اور اپنی غذا آپ تلاش کرنے کے لئے باہر نکال دیا جاتا ہے جس طرح ہمارے مویشیوں کو اطراف واکناف میں چرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے بعینہ یہ ہی حالت مرغیوں کی بھی ہے۔ انھیں گھر پر رکھ کر گرہ سے کچھ خرچ کرکے غذا دینا بار معلوم ہوتا ہے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ مرغیاں بھی ایک طرح کا اصل (Capital) ہیں ان پر پیسے خرچ کرنے سے بعد میں چل کر معاوضہ ملتا ہے۔

مرغیوں کے اقسام:۔ مرغیوں کے حسب ذیل چار اقسام ہیں۔

(۱) کم اور میعادی انڈے دینے والی کڑک ہونے والی مرغی مثلاً دیسی مرغی، اصیل، چٹاگانک، آرنگٹن وغیرہ

(۲) زیادہ اور ہمیشہ انڈے دینے والی اور کڑک نہ ہونے والی مرغی مثلاً وائٹ لگ ہارن، سیاہ منارکہ، بصرہ کی مرغی وغیرہ

(۳) اپنے وزن کو بڑھانے والی موٹی مرغی مثلاً اوڈ آئی لینڈ اوڈ، بلائی موتھ وغیرہ۔

(۴) نمائشی مرغی مثلاً پالٹس، سلیمانی وغیرہ۔

دیسی اور ولایتی مرغیوں کا مقابلہ:۔

دیسی مرغی	ولایتی مرغی (وائٹ لیگ ہارن)
۱۴ سے ۲۱ انڈے دینے کے بعد کڑک ہوجاتی ہے	کم از کم ۳ سال تک برابر انڈے دینے کے بعد کڑک ہوجاتی ہے
ایک سال میں ۵۰ سے ۱۰۰ تک انڈے دیتی ہے	ایک سال میں ۲۰۰ سے ۳۰۰ تک انڈے دیتی ہے۔
اس کے انڈے کا وزن ۳/۴ چھٹانک تک ہوتا ہے	اس کے انڈے کا وزن ایک چھٹانک ہوتا ہے
اس کے انڈے کی قیمت ۲ پیسے سے ۵ پیسے تک ہوتی ہے	اس کے انڈے کی قیمت ۶/ سے ۴/ تک ہوتی ہے
اس مرغی کی قیمت ۸/ سے ۱۲/ تک ہوتی ہے	اس مرغی کی قیمت ۳ روپیے سے ۶ روپیے تک ہوتی ہے۔
اس کے بازو اور دم کے پر ۲/ سے ۹/ سینکڑہ تک بک جاتے ہیں	اس کے بازو اور دم کے پر ۸/ سے ۱۲/ سینکڑہ تک فروخت ہوتے ہیں
یہ مرغی بھدی ہوتی ہے	یہ خوبصورت اور گدگدی ہوتی ہے۔
اگر اس کو پکڑا جائے تو مشکل سے قابو میں آتی ہے	بآسانی پکڑی جاتی ہے
یہ مرغی ۵ سال کے بعد بوڑھی ہوجاتی ہے	یہ تین سال کے بعد بوڑھی ہوتی ہے

دیسی مرغی	ولایتی مرغی (وائٹ لیگ ہارن)
اس کا گوشت لذیذ اور طاقتور ہوتا ہے	اس کا گوشت لذیذ اور طاقتور نہیں ہوتا۔
یہ بچے پالنے میں ماہر ہوتی ہے	یہ مرغی بچے خود نہیں پالتی[ل]

شہریوں کی بہ نسبت دیہاتیوں کے لئے بعض سہولتیں

(۱) دیہاتیوں کو مرغیوں کی پرورش اور رہائش کے لئے کشادہ میدان اور دوسرے ذرائع بکثرت موجود ہیں جو شہریوں کو نصیب نہیں۔

(۲) دھوپ، سایہ، صاف ہوا اور کھلی روشنی یہ تمام اہم چیزیں جو ایک مرغی خانہ کے لئے ضروری ہیں دیہاتیوں کو نسبتاً زیادہ حاصل ہیں۔

(۳) دیہاتیوں کو خوراک پر کچھ زیادہ خرچ کرنا نہیں پڑتا اس لئے کہ اطراف واکناف کے کھیتوں اور میدانوں میں خود مرغیاں کیڑے کوڑے وغیرہ چگ کر پیٹ بھر لیتی ہیں دوسرے یہ کہ خود کاشتکار اپنے غلہ میں سے بآسانی تھوڑی مقدار مرغیوں کو دے سکتا ہے

(۴) مرغیوں کے متعلقہ تمام ضروری کاروبار موسم سرما میں ہوتے ہیں اور یہ ہی موسم کاشتکاروں اور زمینداروں کی فرصت کا ہوتا ہے کیونکہ اس موسم میں باہر کھیتوں میں کسانوں کے لئے بہت تھوڑا کام رہ جاتا ہے۔ اس لئے یہ مفید تجارت ہمارے دیہاتی ربیع کی فصل بونے کے بعد نہایت سہولت اور اطمینان سے اختیار کر سکتے ہیں۔ نیز اس فصل کے گذر جانے کے بعد جب زراعتی ضروریات ان کو باہر کھیتوں پر رہنے کے لئے مجبور کرتی ہیں تو گھر کی عورتیں یہ کام بخوبی انجام دے سکتی ہیں۔

چند خاص نسل کی مُرغیاں اور اُن کی خصوصیات

وائٹ لگ ہارن:۔ وائٹ لگ ہارن نسل کے پرندے نہایت خوبصورت ہوتے ہیں اور ان کے سفید اور خوبصورت پروں کی سُرخ آنکھیں اور زرد چونچ دیر نہایت دلکش ہوتے ہیں۔ معمولی وائٹ لگ ہارن نسل کی کلغی سادہ ہوتی ہے۔ مرغ کی کلغی کھڑی رہتی ہے اور مرغی کی ایک طرف لٹک جاتی ہے۔

طبعاً پھرتیلے اور سرگرم ہونے کے باعث اپنی روزمرہ کی غذا کا نصف تو وہ خود میدانوں میں ادھر اُدھر گھوم گھام کر مہیا کر لیتے ہیں

[ل] زمین کی دولت مرتبہ سید انعام اللہ صاحب حیدرآباد اڈیشن

اس لئے وائٹ لگ ہارن کی پرورش میں زیادہ کفایت ہے۔

اس نسل کی مرغیاں اپنی زیادہ انڈے دینے کی صفت کے باعث دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ انڈوں کی تعداد فی پرند سالانہ ۲۰۰ سے ۳۰۰ تک ہے اور ہر ایک انڈا تقریباً ایک چھٹانک کا ہوتا ہے۔

وائٹ لیگ ہارن پرند سخت جان ہوتا ہے اور حیدرآباد کی آب و ہوا میں کامیابی کے ساتھ پرورش پاتا ہے۔

اوڈ آئی لینڈ ریڈ: ۔ یہ مرغیاں بہت قدآور ہوتی ہیں۔ زیادہ تر جاڑوں اور شروع گرمیوں میں انڈے دیتی ہیں۔ یہ نسل یورپ میں بہت عام ہے رنگ کے لحاظ سے اس کی چند قسمیں ہیں مثلاً سرخ، خاکستری اور سبزی مائل۔ چونکہ یہ وزنی جانور ہے اس لئے یہ کراس بریڈ Cross Bread کے لئے موزوں ہے۔

بلیک منارکہ: ۔ یہ مرغی دراصل چین کی ہے لیکن یورپ کے اکثر ممالک میں اس کو پالا جاتا ہے۔ انگلستان میں یہ بکثرت پائی جاتی ہے رنگ کے لحاظ سے اس کی کئی قسمیں ہیں مثلاً سفید، خاکی، کالی وغیرہ۔ اس کا قد وائٹ لیگ ہارن سے کچھ نکلتا ہوا ہوتا ہے اس کے نر کی کلغی کھڑی اور مادہ کے ایک طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے کلغی کا رنگ سرخ، ٹانگوں کا رنگ سیاہ اور کان کا سفید ہوتا ہے انڈے دینے میں یہ مرغی وائٹ لیگ ہارن کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ مرغی تین سال تک متواتر انڈے دینے کے بعد کڑک ہو جاتی ہے۔ اس کے جوڑے کی قیمت ۱۲ سے ۱۵ روپے تک ہوتی ہے۔

سوسکس: ۔ یہ ایک انگریزی نسل کی مرغی ہے۔ دیکھنے میں نہایت خوبصورت اور مناسب قد و قامت کی ہوتی ہے۔ یہ نسل انگلستان میں بہت عام ہے۔ یہ مرغی وزنی اور انڈے زیادہ تعداد میں دیتی ہے۔ یہ سفید، سرخ اور خاکی رنگ کی ہوتی ہے۔

دیسی مرغی: ۔ یہ ہندوستان کی مرغی ہے اور اسے آسانی کے ساتھ پالا جا سکتا ہے۔ اس کے نر کا وزن ایک سیر سے دو سیر تک اور مادہ کا تین پاؤ سے ڈیڑھ سیر تک ہوتا ہے۔ رنگ کے لحاظ سے اس کی کئی قسمیں ہیں مثلاً کالی، سفید، خاکی، زردی مائل وغیرہ۔ سال میں ۵۰ سے ۱۰۰ تک انڈے دیتی ہے۔ اس کا گوشت ولایتی مرغیوں کے بہ نسبت لذیذ اور قوت بخش ہوتا ہے اس کا کوئی مرغی خانہ نہیں۔ عام طور پر گھروں میں پالا جاتا ہے۔ اس کے جوڑے کی قیمت ۱/۲ سے ۲ تک ہوتی ہے یہ مرغی نہایت سخت جان ہوتی ہے۔ باوجود انتہا درجہ نا موافق حالات کے پلتی اور زندہ رہتی ہے۔

اصیل مرغی: ۔ یہ مرغی نسلاً ہندوستانی ہے۔ حیدرآباد کی اصیل قدیم زمانے میں بہت مشہور تھی اور عام طور پر اس زمانے میں اس کو لڑائی کے لئے سدھایا جاتا تھا مگر چونکہ اب مرغبازی کا شوق باقی نہ رہا اس لئے اس کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہیں کی۔ یہ بہت طاقتور اور بے حد

گھر والے ناراض تھے ———— مجھ میں اپنے آبائی پیشہ کی استادانہ خصوصیات مفقود تھیں۔ میں اس اسٹیج پر ایک ناکام اداکار تھی۔ جب کبھی میں آئینہ سامنے لئے اپنے دن بھر کے سبق کو دُہراتی تو اپنے دلنواز تبسم کے سوا مجھے اپنی کوئی چیز نہ بھاتی۔

ماں کہتی "تیری نگاہوں میں جادو ہے، ذرا جادو چلانا سیکھ جا تو ساحرہ بن جائے گی"

اُستاد جی کہتے "تیری جوانی کا رس چاند کی کرنوں سے ڈھلا ہے۔ اس میں ذرا صبح کی صباحت آجائے تو امرت بن جائیگا"

اور میں کہتی ———— میرا دل کہتا، میں کچھ نہیں:

مگر اپنے سینہ کے اُتار چڑھاؤ میں ایک جگہ ایسی بھی رکھتی تھی جہاں ارمانوں اور آرزوں کی پرورش ہوتی ہے۔

(۲)

رقص و سرود کی محفلوں میں گھڑیاں کاٹتے کاٹتے دو سال ہوئے آگئے مگر میری زندگی بے سہارا ہی رہی۔ زندگی کے اس طوفان میں میری کشتی ڈگ مگ کرتی چلی جارہی تھی۔ اور ساحل پر کھڑے رہنے والے تماشہ بین چیخ چیخ کر مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے اپنے تنومند مردانہ ہاتھوں کو ہوا میں جنبش دے دے کر بھنور کی طرف اشارہ کر رہے تھے ———— اس بھنور سے بچانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔

اس دو سال میں کتنے نفرت انگیز جذبات میرے دل میں اُٹھا کئے مگر میں اس نفرت کو مسکراہٹ کے پردوں میں چھپاتی رہی۔ ایک مرتبہ ساری رات محفل عیش میں گذار کر صبح ہوتے ہوتے میں گھر آئی تو تھک کر چور ہوگئی تھی ———— آئینہ دیکھا تو میری مسکراہٹ میں افسردگی تھی، میں کملائی جارہی تھی، میرے کان اپنی تعریف سُنتے سُنتے پک گئے۔ میرے حسن کی میری اداؤں کی میرے ایک ایک عضو کی تعریف میں استعاروں اور تشبیہوں کی ساری نزاکتیں ختم ہوچکی تھیں ———— مگر میں تماشہ بینوں کے اس تصنع اور تکلف کی گفتگو سے تنگ آگئی تھی۔ مجھے کوئی اب تک اپنا بنانے والا ———— مجھ پر چھا جانے والا نہیں ملا تھا۔

(۳)

ایک رات میں نے خواب دیکھا:-

آسمان پر اُڑی جارہی ہوں، میرے پیروں سے نور کی کرنیں پھوٹ کر زمین تک پہنچ رہی ہیں۔ یک بیک اوپر نظر جو کی تو دیکھا کہ روشنی کی شعاعیں آسمان کا دامن چیر کر مجھ تک آرہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں نہا رہی ہوں نور کی بارش میں میرے جسم کی کثافتیں دور ہو رہی ہیں اور آخر میں ———— میں نے یہ محسوس کیا کہ میں خود ایک کرن بن گئی ہوں۔

بھاگ متی کی آپ بیتی

میں نے یہ افسانہ محترمی ڈاکٹر زور صاحب کی دلچسپ کتاب "سیر گولکنڈہ" پڑھنے کے بعد لکھا ہے۔ اس کتاب میں یوں تو سارے افسانے بہت اچھے ہیں مگر "چحلم کی رقاصہ" مجھے بہت پسند آیا جس میں بھاگ متی اور شہزادہ قلی کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے کے پڑھتے ہی بھاگ متی کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی۔ ذیل کی سطور میں اس داستان عشق کو میں نے بھاگ متی سے کھلوایا ہے۔

(۱)

میں نئی نویلی، اپنے پیشہ کی زندگی سے ناآشنا جوانی کی لغزشوں میں کھوئی ہوئی، شعور شباب کی بدمستیوں میں بہی چلی جا رہی تھی میں کیا تھی ایک سانولی سلونی بھولی بھالی کمسن لڑکی جو زمانہ کی ناسازگاریوں میں پلی تصنع اور تکلف میں جوان ہوئی اور ——— پھر پرشور موجوں کے دھارے پر تنہا چھوڑ دی گئی۔

مجھے آئینے کے سامنے گھنٹوں بٹھا کر دوسروں کو گھائل کرنے کے درس دیئے جاتے، مجھے بتایا جاتا کہ آنکھوں سے کس طرح تیر چلائے جاتے ہیں۔ سینہ کو ابھار کر کس طرح جذبات میں تلاطم پیدا کیا جا سکتا ہے، چال میں مستانہ پن کی ایک جھلک کس طرح قیامت برپا کر سکتی ہے، اور مسکراہٹ سے کتنی بجلیاں گرائی جا سکتی ہیں مگر میں اس مکتب کی ایک کند ذہن طالب علم ثابت ہوئی ———



پروفیسر قاضی محمد حسین ام-اے-ال-ال-بی (کینٹب)
نائب معین امیر جامعہ

سفید عہ/ر اور رنگدار ۸/ر سینکڑہ کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں۔ پروں سے مختلف قسم کی اشیا تیار ہوسکتی ہیں۔ مثلاً گدیاں، گدیے، پھول، برش، ٹوپیاں، شٹل کاک، کھلونے ڈسٹر وغیرہ۔[1]

عام طور پر مرغیوں کی بیٹ پھینک دی جاتی ہے۔ یہ ایک اچھی کھاد ہے خصوصاً پھلدار درختوں کے لئے اور پھول والے پودوں کے لئے تو اکسیر ہے۔ کاشتکار اگر ذرا توجہ کرے تو ایک اچھی کھاد اس طرح حاصل کرسکتا ہے

جب مرغی کڑک ہوجاتی ہے تو کڑک توڑنے کے لئے عام طور پر اس کی ناک میں جبراً ٹھونس دیا جاتا ہے یہ ایک ظالمانہ طریقہ ہے کڑک توڑنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ ایک تار کی جالی کا پنجرا بنالیا جائے۔ اور اس میں مرغی کے کھانے پینے کا تمام سامان رکھ کر مرغی کو پنجرے کے اندر بند کردیں اور درخت کی کسی شاخ میں لٹکادیں۔

جہاں تک مرغیوں کو بند کرنے کا تعلق ہے اس کے لئے مرغی خانہ تیار کیا جائے۔ اس مرغی خانہ میں ایک کھڑکی ضرور ہو تاکہ ہوا کا گذر اچھی طرح ہوسکے۔ روزانہ اندر کی مٹی نکال دی جائے اور تازہ مٹی ڈالی جائے۔

ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ بیروزگار بھائی جو ملازمت کی تلاش میں دفاتر کے اطراف چکر لگاتے پھرتے ہیں اگر ذرا اس طرف توجہ کریں تو وہ باآسانی ماہانہ ۶۰۔۷۰ روپیہ کماسکتے ہیں۔ مرغبانی کے کاروبار کے ساتھ (Dairy Products) کا بھی کاروبار کیا جائے تو بہت مناسب ہے۔ دونوں کاروبار تھوڑے سے سرمایہ سے جاری کئے جاسکتے ہیں جب تعلیم یافتہ نوجوان اس طرح کاروبار میں ہاتھ ڈالیں گے تو اُمید ہے کہ بہت سے کاروباری نقایص دور ہوجائیں اور کاروبار منفعت بخش طور پر چل سکے۔ صرف ایثار اور محنت کی ضرورت ہے۔

محمد عبدالرحیم متعلم سال چہارم

---

[1] "زمین کی دولت" مرتبہ سید انعام اللہ صاحب حیدرآباد

انڈے محفوظ رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ۲ گیلن اُبلتے ہوئے پانی میں ایک پونڈ سوڈیم سلیکٹ (Sodium-Silicate)
ملالیا جائے اور اس محلول کو ایک روغنی برتن میں ڈال کر اس میں انڈے رکھ دیئے جائیں۔ اس طرح جو انڈے رکھے جائیں گے وہ باسانی
ایک سال تک اچھے رہ سکتے ہیں یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ۱۵ اونس چونا ۳ گیلن صاف پانی میں ملا کر ایک روغنی برتن میں
ڈال دیا جائے۔ اس طرح سے محفوظ کئے ہوئے انڈے ۶ ماہ تک اچھے رہ سکتے ہیں۔

جب مرغی بیمار ہو تو فوراً قریب کے ڈاکٹر کے پاس رجوع کرایا جائے۔ پروپگنڈے کے ذریعہ عوام کو انڈے استعمال کرنے کی ترغیب
دی جائے۔ بچے نکالنے کے لئے ایک مشین ایجاد ہوئی ہے جسے پیرسن انکوبیٹر مشین (Pearson Incubator machine)
کہتے ہیں۔ اس مشین میں ایک لیمپ ہوتا ہے۔ انڈے سینے کے لئے جتنی حرارت چاہئے اتنی حرارت اس لیمپ کے ذریعہ پہنچائی جاتی ہے
اس مشین میں بیک وقت ۶۰، ۷۰ انڈے رکھے جا سکتے ہیں۔ اس طریق سے بچے نکالنے کا فائدہ یہ ہے کہ انڈے خراب ہونے نہیں پاتے
اگر کوئی انڈا خراب ہو گیا تو آلہ کے ذریعہ سے فوراً معلوم کیا جا سکتا ہے۔ عموماً جو انڈے مرغی کے نیچے بٹھلائے جاتے ہیں ان میں ۵، ۶ ضرور خراب
ہوتے ہیں پھر کڑک مرغی کے لئے بڑی دقت ہوتی ہے کئی دفعہ مرغی انڈوں پر سے اُٹھ جاتی ہے۔ اکثر مرتبہ خاص طور پر سینے کے لئے ایک نئی
کڑک مرغی خریدنا پڑتی ہے۔ یہ تمام دقتیں دور ہو جاتی ہیں۔ اگر پیرسن انکوبیٹر مشین کے ذریعہ سے بچے نکالے جائیں۔ اس مشین کی قیمت ۱۵۰ روپیہ
ہے ظاہر ہے کہ ہر شخص اسے خرید نہیں سکتا۔ اس لئے عوام کے فائدے کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انھیں امداد باہمی مقامی طور پر ایک
مشین خرید کر رکھے اور عوام سے فی انڈا کچھ دام لے کر بچے نکال کر دے۔ سرکاری پولٹری فارموں پر جہاں جہاں یہ مشین ہے ان کو چاہئے کہ
عوام کو مفت مشین کے ذریعہ سے بچے نکال کر دیں۔

زیادہ تعداد میں انڈے حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مرغی کو اچھی اور کافی مقدار میں غذا دی جائے۔ عام طور پر اس بارے
میں بہت ہی لاپروائی برتی جاتی ہے۔ مرغی کے لئے بہترین اور سستی غذا حسب ذیل ہے۔

چار حصے گیہوں کا بھوسہ، دو حصے گیہوں کا آٹا، دو حصے چنے کا آٹا، اور آدھا حصہ السی کا سفوف ان سب کو ملا کر آمیزہ بنا لیا جائے
اور دن میں تین مرتبہ دیا جائے۔ سیپیاں، گار کے پتھر، کوئلے کے ٹکڑے مرغیاں شوق سے کھاتی ہیں اس لئے ان چیزوں کو باریک پیس کر
بطور زائد غذا کے مرغی خانے میں رکھا جائے۔

عموماً اگسٹ سے اکٹوبر تک مرغیوں کے پر جھاڑنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مرغیوں کے پروں کو کوئی اہمیت نہیں دی
جاتی اور کوڑے کرکٹ میں ضائع کر دیئے جاتے ہیں حالانکہ دوسرے ممالک مثلاً انگلستان، جاپان، ڈنمارک وغیرہ میں عمدہ سفید پر بجائے معمولی

اصلاح کی تدابیر :- بیماریوں کی تحقیق کی جانی چاہئے اور اس کے لئے موزوں علاج تجویز کئے جائیں. حمایت ساگر پولٹری فارم نے تحقیق سے آسان ادویات معلوم کی ہیں جو تھوڑے سے پیسے خرچ کرنے سے بآسانی حاصل ہوسکتی ہیں. ضرورت اب اس امر کی ہے کہ پروپگنڈے کے ذریعہ ان دواؤں کو عوام تک پہنچایا جائے. صرف علاج کر دینے سے کچھ نہیں ہوتا تا وقتیکہ عوام اس سے باخبر نہ ہوں. حفظ ما تقدم کے طور پر بیماریوں سے بچنے کے لئے ہر ہفتہ مرغیوں کو ایک مرتبہ فنائل میں ڈبو دیا جائے - دو چھٹانک فنائل کے کر دس سیر پانی ملاکر مرغی خانے کے کھانے پینے کے برتن وغیرہ کو دھو دیا جائے. مرغی خانہ کو ہمیشہ پاک صاف رکھنے کی کوشش کی جائے.

انڈوں کی فروخت کے لئے ایک ڈپو قایم کیا جائے. ڈپو مختلف مراکز سے انڈے حاصل کرے اور اس کے فروخت کا انتظام کرے پہلے اس طرح کا ایک ڈپو قایم تھا مگر معلوم نہیں کن اسباب کی وجہ سے یہ ڈپو برخاست ہوگیا. اس ڈپو کی از سرِ نو تجدید کی جائے اور اسے حیدرآباد فارمنگ ایسوسی ایشن کے زیر انتظام کر دیا جائے. انڈوں کو محفوظ رکھنے کے لئے سائنٹفک اصول اختیار کئے جائیں.

پیکنگ کا معقول انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ایک تہائی سے زیادہ انڈے پھوٹ جاتے ہیں - عام طور پر ٹوکروں میں گھاس ڈالی جاتی ہے اور اس پر انڈے رکھ دیے جاتے ہیں اُدھر کپڑا باندھ دیا جاتا ہے. اس غرض کے لئے بمبئی، کلکتہ، کراچی اور دہلی میں موٹے گتے کے بنے ہوئے خانہ دار ڈبے ملتے ہیں. ہر ایک انڈے کو موم دار کاغذ میں لپیٹ کر خانہ میں رکھا جاتا ہے اور خانہ کو کاغذ کی کترنیوں سے بھر کر ڈھکنا بند کر دیا جاتا ہے یا ایک دو دیے کا ڈبہ لیا جائے اس میں بھوسہ بھر کر انڈے رکھ دیئے جائیں. اگر یہ بھی نہ ہوسکے تو خالی سگریٹ کے ڈبے اس غرض کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں. اس بارے میں انجمن امداد باہمی اپنے فرائض میں انڈوں کی فروخت کا بھی انتظام کرے

انڈا گرم ہونے کی وجہ سے موسم گرما میں بہت کم بطور غذا کے استعمال کیا جاتا ہے - اس موسم میں انڈے کی تھوڑی مقدار استعمال کی جانی چاہئے. اس غرض کے لئے زردی اور سفیدی کو دھوپ سکھا لیا جائے. مکھیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک باریک کپڑا ان کے اوپر باندھ دیا جائے اس طرح یہ خشک ہوکر ٹھوس مادہ بن جاتا ہے. موسم گرما میں اس کی تھوڑی مقدار دودھ میں ملاکر استعمال کی جائے تو نہایت مقوی ثابت ہوگی - اس طریق کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انڈے خراب یا گندے نہ ہونے پائیں گے. مزید براں اس طرح کا خشک بنا ہوا ٹھوس مادہ چمڑے کی رنگوائی اور ہوائی جہاز کی پینٹنگ میں بھی آسکتا ہے. بطور نمونہ حمایت پولٹری فارم میں یہ چیز موجود ہے.

مرغیوں کی فروخت کے لئے ایک مرکز قایم کیا جائے. سالانہ تقریباً ۳ لاکھ روپے کی مالیت کے مرغیاں حیدرآباد سے برآمد کی جاتی ہیں. مرغیاں بھیجنے کے طریقے نہایت ناقص اور ظالمانہ ہیں ایک ٹوکرے یا پنجرے میں ۶۰، ۷۰ مرغیاں ٹھوس دی جاتی ہیں. پیکنگ کے کم خرچ اور آسان طریقے معلوم کئے جائیں.

نسل کشی :۔ انڈوں کی تھوڑی تعداد جو بچ رہتی ہے اُسے نسل کشی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ سال تمام انڈے بٹھائے جاتے ہیں مگر زیادہ تر موسم سرما میں ایک وقت میں ۸ سے ۱۲، انڈے سینے کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ سینے کے لئے انڈوں کا کوئی انتخاب نہیں کیا جاتا اور نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ انڈے آیا خراب ہیں یا اچھے، عموماً ۲۱ روز بعد بچے نکل آتے ہیں۔ اس دوران میں مرغی کو جوار بطور غذا کے دی جاتی ہے۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے اس طرح کہ بٹھائے ہوئے انڈوں میں ۵ یا ۷ خراب ہو جاتے ہیں۔

خانگی پولٹری فارم :۔ امجد پولٹری فارم :۔ نواب امجد علیخاں صاحب کا پولٹری فارم ہے۔ صاحب موصوف کو اچھی نسل کے مرغیاں پالنے کا بہت شوق ہے اور انھوں نے کثیر رقم اس شوق کے لئے صرف کی ہے۔ ہر سال نمائش باغبانی و مرغبانی میں ۳، ۴ انعامات حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر صاحب موصوف کا پولٹری فارم تجارتی اصول پر نہیں ہے۔

دوسرا خانگی پولٹری فارم حیدرآباد گلشن پولٹری فارم واقع آصف نگر ہے یہ نواب تراب علی خاں صاحب ضیا کا ہے چند دنوں پہلے تک نواب صاحب موصوف کو مرغیوں کی پرداخت کا بہت شوق تھا۔ کثیر رقم صرف کرکے اچھی اچھی نسل کی مرغیاں باہر سے منگوائی گئی تھیں۔ نمائش باغبانی و مرغبانی میں کئی مرتبہ انعام بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اعلیٰ نسل کے جوڑے اور انڈے فروخت بھی ہوتے تھے مگر اب نواب صاحب موصوف کا شوق اس جانب سے ہٹ گیا ہے اور سوائے دو یا تین مرغیوں کے جوڑے کے اب کوئی مرغی نہیں۔ مرغی خانہ ویران پڑا ہوا ہے۔

سرکاری پولٹری فارموں میں حمایت ساگر، ٹینچر وا اور پربھنی کے پولٹری فارم قابلِ ذکر ہیں۔ حکومت سرکار عالی نے جب دیہی ترقی کے لئے مراکز قایم کئے تو اس کے ساتھ ساتھ پولٹری فارم کا قیام بھی عمل میں آیا تاکہ حیدرآباد میں فن مرغبانی کو ترقی ہو۔ ٹینچر وا کا پولٹری فارم اس بارے میں بہت کچھ کام انجام دے رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً پمفلٹ اُردو انگریزی میں شائع کئے جاتے ہیں عوام کو تبلایا جاتا ہے کہ وہ کن اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اچھی نسل کے مرغیوں کو ترقی دے سکتے ہیں۔ دیہی آبادی میں مرغبانی کے شوق کو بڑھانے کے لئے وائٹ لگ ہارن کے انڈے مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں میں فن مرغبانی کے شوق کو بڑھانے اور اس کی ہمت افزائی کرنے کے لئے محکمہ زراعت کی جانب سے دس ہزار روپیہ کے خرچ سے سالانہ نمائش باغبانی و مرغبانی ہوتی ہے۔ اچھی نسل کے مالکان مرغی کو انعامات دیئے جاتے ہیں اس نمائش کے سرپرست والاشان حضرت اعظم جاہ بہادر ولی عہد حیدرآباد ہیں اس نمائش کی ابتدا ۱۹۳۱ء میں ہوئی تھی ۱۹۳۵ء میں کُل ۷۰۵ پرندے نمائش میں داخل کئے گئے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

وائٹ لیگ ہارن	بلیک منارکہ	روڈ آئی لینڈ روڈ	اصیل
۶۲	۷۰	۱۰۱	۶۰

عام طور پر مرغیاں اللہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ ان کا کوئی معقول علاج نہیں ہوتا۔ چیچک کا علاج یہ کیا جاتا ہے کہ نیم کے پتہ پیس کر زخم پر لگائے جاتے ہیں۔ دوسری بیماریوں کی صورت میں لہسن باریک پیس کر اجوائن کے پانی کے ساتھ مرغیوں کو دیا جاتا ہے اکثر مرغیاں پالنے والوں کو اس امر کی شکایت ہے کہ وقتاً فوقتاً بیماریوں کے پھیلنے کی وجہ سے انھیں نقصان ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت فن مرغبانی کی ترقی کے لئے مضر ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ موسم باراں کے اوائل میں جبکہ خود رو گھاس اُگتی ہے۔ مرغیاں کھاتے ہی بیمار ہو جاتی ہیں اور کثرت سے مرنا شروع ہوتی ہیں۔ تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ مرغیوں کے اس طرح ایک دم خوب گھانس کھانے کی وجہ سے بیمار ہو جاتی ہیں اور یہ بیماری بڑھتے بڑھتے کالرا مرض کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے

ان امراض کی وجہ سے مرغیاں پالنے والوں میں ایک غیر یقینی حالت سی پیدا ہو گئی ہے جس کی وجہ سے وہ مرغیوں کی ہلاکت کے ڈر سے ایک دم تمام مرغیاں ارزاں داموں فروخت کر دیتے ہیں۔ اکثر حضرات نے دیکھا ہوگا کہ اوائل موسم برسات میں مرغیاں ارزاں داموں بکثرت فروخت ہوتی ہیں۔

پیداوار:۔ مرغیاں جو انڈے دیتی ہیں وہ مختلف ہیں بعض سالانہ ۵۰ اور بعض سالانہ ۱۰۰، اس طرح ہم بہ حیثیت مجموعی اوسط نکالیں تو ۹۰ انڈے ہوتے ہیں۔ جہاں تک کہ انڈوں کی فروخت کا تعلق ہے تھوڑی مقامی طور پر فروخت ہو جاتی ہے اور کثیر تعداد حیدرآباد اور سکندرآباد فروخت کے لئے لائی جاتی ہے ان دو مقامات پر دیہات کے بہ نسبت کچھ زاید قیمت مل جاتی ہے۔

عام طور پر انڈے بھوسہ یا چاول بھرے برتن میں محفوظ رکھے جاتے ہیں عموماً لوگ موسم گرما میں انڈے کم استعمال کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس موسم میں ۴؍ فی درجن دیہات میں اور بلدہ میں ۸؍ فی درجن فروخت ہوتے ہیں۔ بقیہ موسموں میں اوسط شرح قیمت ۶؍ فی درجن دیہات میں اور ۱۰؍ فی درجن بلدہ میں رہتی ہے۔ اعلیٰ اور متوسط طبقہ میں انڈوں کا استعمال زیادہ ہے اور یہ ہی حالت گوشت کی بھی ہے ۱۳۴۱ف میں ۱۹۵،۰۵۷،۶ مرغیاں حیدرآباد سے برآمد کی گئیں جن کی مجموعی قیمت ۳ لاکھ ۰، ہزار روپیے وصول ہوئی۔ مگر یہ تعداد گذشتہ سال یعنی ۱۳۴۰ف کے اعداد سے کم ہے۔ ۱۳۴۰ف میں ۶،۹۹،۱۹۱ مرغیاں برآمد کی گئی تھیں[۵]، جو پرند برآمد کئے جا رہے ہیں ان کی سالانہ اوسط تعداد تقریباً ۷ لاکھ ۶ ہزار ہے اور انڈوں کی تقریباً ۲ لاکھ ۱۳ ہزار، برآمد کی جملہ مالیت ۴ لاکھ ۴۰ ہزار روپیہ ہوتی ہے۔ بجز آسام اور مشرقی بنگال کے ہندوستان میں کوئی صوبہ ایسا نہیں۔ جہاں مرغیوں کی پرورش اس قدر عام ہو[۲]۔

---

۵ Administrative Report of the Customs department

۲ از مضمون "ریاست حیدرآباد میں مرغیوں کی پرورش"، حیدرآباد فارمر بابتہ شہریور ۱۳۴۲ف

جنگجو پرند ہے۔ دیسی، ولایتی اور امریکی مرغ اس کے لڑنے کی تاب نہیں لاسکتے۔ رنگ کے لحاظ سے اس کی قسمیں ہیں کالا سفید اور سرخ اس کا نر نسل بڑھانے کے لئے اچھا ثابت ہوا ہے۔ اس کی ٹانگیں بہت مضبوط ہوتی ہیں۔ نر کا وزن تین سیر سے پانچ سیر تک اور مادہ کا وزن دو سیر سے ۲½ سیر تک۔ نر کا قد ڈیڑھ فیٹ سے دو فٹ تک ہوتا ہے۔ یہ مرغی ۷ سے ۱۲ تک ایک مرتبہ انڈے دیتی ہے۔ اس کے انڈے بعض دواؤں میں کام آتے ہیں۔ اس نسل کی مرغیاں کھلے میدانوں میں خوب پرورش پاتی ہیں۔ اس کے چوزے کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے جوڑے کی قیمت ۱۰ روپے سے ۵۰ روپے تک ہے۔

بیماریاں اور ان کا علاج:۔ ان میں تمام قسم کی بیماریاں پائی جاتی ہیں مثلاً کالرا، پلیگ، کھانسی، سکتہ، حلق پکنا، ہیضہ، ٹک فیور، زہرباد سرسام وغیرہ عام طور پر کالرا اور چیچک میں مرغیاں زیادہ بیمار رہتی ہیں اب ہم ان بیماریوں کا ذکر تفصیل سے کریں گے جو عام ہیں۔

مرض کالرا:۔ بیٹ سبز رنگ کی ہوجاتی ہے اور دستوں کی صورت میں تھوڑی تھوڑی دیر سے آتی ہے پیاس کی زیادتی ہوجاتی ہے اور آنکھیں گڑھوں میں گھس جاتی ہیں۔ چہرہ نڈھال ہوجاتا ہے منہ اور پاؤں تپلے ہوجاتے ہیں اس بیماری کی انتہائی مدت ۵ یا ۶ روز ہے اکثر مرغیاں ۳ روز کے اندر ہی ہلاک ہوجاتی ہیں یہ بیماری وبا کی طرح پھیلتی اور ہزارہا مرغیوں کا صفایا کرجاتی ہے۔

چیچک:۔ یہ چوزوں کا مرض ہے اور بہت تکلیف دہ بیماری ہے جسم میں گندے مواد کی موجودگی سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے۔ جانور سست ہوجاتا ہے۔ کلغی، ڈاڑھی اور چہرے پر دانے نکل آتے ہیں۔ جن کا رنگ سیاہ ہوجاتا ہے پھر بڑے ہوکر پھوٹ جاتے ہیں

ٹک فیور:۔ یہ ایک مہلک بیماری ہے جو مرغیاں اس مرض میں مبتلا رہتی ہیں اُن میں ۵۰ فیصدی مرجاتی ہیں۔ دیسی ساخت کے ڈربوں میں رکھنے سے مرغیوں کے جسم میں جوئیں پیدا ہوتی ہیں جو ان کا خون چوس چوس کر بیمار کرڈالتی ہیں خون میں کمی ہوجاتی ہے اور مرغی کو بخار آتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا ہونے کے بعد مرغی ہر وقت پروں میں چونچ ڈال کر کریدتی رہتی۔ بیٹ زیادہ ہوتے ہیں۔ ہر وقت کسی گوشے کی تلاش میں رہتی ہے اس مرض کی مدت ۶ ماہ ہے۔

بمبل فوٹ:۔ یہ بیماری عموماً مرغیوں میں پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے مرغیاں اپنی آرام گاہ سے جو زمین سے اونچی واقع ہوتی ہے۔ کودنے سے ہوتی ہے۔ اگر اس بیماری سے غفلت برتی جائے تو اس کا نتیجہ مرغی کو لنگڑا بنادینا ہے۔

مرض حلق:۔ اس مرض کا سبب یہ ہے کہ چھوٹے کیڑے حلق کی نلی میں پیدا ہوجاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جانور کو سانس لینا دشوار ہوجاتا ہے۔

کھر دُرے پاؤں یعنی پاؤں کی بیماری:۔ یہ نہایت تیزی سے سرایت کرنے والی بیماری ہے۔ اس بیماری والے پرندے کو دوسرے پرندوں سے فوراً علیحدہ کردینا چاہئے۔

آنکھ کھل گئی، میرا دل گدگدا اٹھا، میں نے ایک جھرجھری سی محسوس کی، آئینہ سامنے رکھا تھا، دیکھا تو میرا چہرہ دمک رہا تھا آنکھیں خمار آلود تھیں، مگر اس میں سے مسرت کی ہلکی کرنیں آئینہ پر بکھر رہی تھیں۔ دل کی اس شگفتگی نے ہونٹوں کی کلی کھلوا دی اور ایک انگڑائی کے ساتھ میں نے ہاتھ جو اٹھایا تو تبسم کی ایک لہر آئینہ کی سطح پر پھیل گئی ایک انجان خواہش دل میں پیدا ہوئی کہ کاش اس وقت مجھے پیچھے سے کوئی دیکھتا! مگر اس خواہش کے ساتھ ہی میں شرما گئی ——— ایک آخری مرتبہ نیند سے بوجھل ہوتی آنکھوں سے آئینہ کو دیکھا مگر اس میں کچھ اندھیرا اندھیرا سا نظر آیا ——— پڑ کر سو رہی۔

(۴)

شاہی محل میں محفل نشاط منعقد ہوئی میرے پیشہ کی ساری استاد عورتیں وہاں بلائی گئی تھیں۔ جانے سے پہلے ماں نے میرا خوب بناؤ سنگھار کیا اور جب میں سنور کر پہلی مرتبہ شاہی محل میں آئی تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ محفل میں مجھے تیسری نشست ملی۔ پہلے ایک استاد گانے والی کی باری تھی۔ اس کا نام اصل میں روشن تھا۔ مگر روشنی کے نام سے مشہور تھی۔ امرا اور وزرا پر اس کے سحر نغمہ کا جادو چل چکا تھا، خود ظل اللہ بھی اس کا گانا سننے کے مشتاق رہا کرتے۔ ناچنا وہ جانتی نہیں تھی، یوں ہی پیروں کو جنبش دے کر گھنگروؤں کو بجا لیا کرتی تھی۔ مگر گانے میں وہ سب پر بھاری تھی۔

شاہی حکم کے ساتھ ہی اس نے پہلے اٹھ کر ظل اللہ کو سات سلام کئے اور گانا شروع کیا۔ اس کے آواز کے درد اور رسیلے پن نے ایسا اثر کیا کہ ساری محفل جھوم گئی۔ صاحب دل اور اہل ذوق امرا کا یہ اجتماع مسحور ہو کر رہ گیا۔ ظل اللہ بھی کبھی کبھی بے اختیار تعریف کردیتے۔ اس کا گانا ختم ہوا، دوسری مانکہ بائی تھی اپنے فن میں یہ بھی کچھ کم نہ تھی مگر آج اس کا رنگ نہ جم سکا۔

اب میری باری تھی۔

دھڑکتے ہوئے دل اور لڑکھڑاتے پیروں سے اٹھ کر میں نے ظل اللہ کو سلام کیا ——— میرے ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔
شمع پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالتی ہوئی محفل میں آئی۔ پسینہ کا ایک قطرہ پیشانی سے ڈھلک کر میرے رخسار پر آ گیا، ماں کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمت بندھائی ——— میں نے اپنا رقص شروع کیا۔

گھنگروؤں کی جھنکار میں واہ واہ کی آواز نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ میں ایک غیر معمولی قوت کے ساتھ فن کارانہ ضربیں لگاتی ہی ناچتے ناچتے میں نے دیکھا ——— میں نے یہ دیکھا کہ دو پُر شوق نگاہیں میرے دل کی گہرائیوں میں گھسی جا رہی ہیں۔
جذبات کی لہروں نے میرے سینہ کے اتار چڑھاؤ میں ارتعاش پیدا کردیا میرے جسم کا ذرہ ذرہ مجسم رقص بن گیا ———

ادھر شہزادہ کس درجہ مسحور ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میرے دل میں ایک میٹھا درد اُٹھا ——— میرا رقص ختم ہو گیا میں جذبات کی دنیا میں جھومتی ہوئی گر پڑی۔

دوسرے دن شہزادے نے باریابی کا شرف بخشا، میری قسمت جاگ گئی، میرے دل کی دنیا جگمگا اٹھی۔ شہزادہ مجھ پہ قربان ہونے کو تیار تھا اور میں ——— میری ہزار زندگیاں شہزادے کی ایک محبت بھری نظر کی قیمت نہ ہوسکتی تھیں۔ دنیا نے مشہور کر دیا کہ شہزادہ مجھ پہ عاشق ہو گیا۔ ماں پھولی نہیں سماتی تھی، میری ہم پیشہ عورتیں حسد سے جلی جا رہی تھیں اور میں تھی کہ آسمان پر اڑی چلی جا رہی تھی ہوتے ہوتے یہ خبر ظل اللہ تک پہنچی، شہزادے کو حسین لڑکیوں کے جھرمٹ میں بالا حصار میں قید کر دیا گیا تاکہ وہ مجھے بھول جائے شہزادہ مجھ تک آ نہیں سکتا تھا اور میں مجبور اپنی جھونپڑی میں کانٹوں پر لوٹ رہی تھی۔

ایک دن شہزادے کا قاصد خط لایا۔ لکھا تھا۔

محمد قلی کی طرف سے حسن کی شہزادی بھاگ متی کے نام

بالا حصار میں، شوخ و طرار لڑکیوں میں قید کر دیا گیا ہوں۔ یہ کم سن بھولی بھالی لڑکیاں میرے دل کو مستقل نشانہ بنا کر وار پر وار کرتی چلی جا رہی ہیں ——— مگر جو دل نشانہ بن چکا ہے اور جس کا زخم ابھی دھویا بھی نہیں گیا تو یہ غریب لڑکیاں کس طرح اسے مجروح کر سکیں گی۔ بھاگ متی! یہ دل صرف تیرا ہے اور ہمیشہ تیرا رہے گا۔

خط پڑھ کر میرا رواں رواں شہزادے کو دعائیں دینے لگا ——— میرا جذبہ محبت اُمنڈ آیا۔ خوشی اور اپنی کم قیمتی اور نارسائی کے دو آنسو آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ میں نے شہزادے کو جواب میں لکھا۔

حضور شہزادے کی خدمت میں غریب بھاگ متی کی طرف سے

اپنے مالک کے چرنوں میں آنکھیں ملنے کی آرزوؤں کے ساتھ

حضور میرا خیال چھوڑ دیں۔ میں جو حضور شہزادے کی داسی بننے کے بھی قابل نہیں، کس منہ سے محبت کا اظہار کر سکتی ہوں۔ حضور نے پہلی مرتبہ جس محبت بھری نظروں سے دیکھا ——— صرف اسی کی قیمت میں اپنی جان کا نذرانہ بھی حقیر سمجھتی ہوں۔ تو اب حضور جب میری محبت میں دیوانے ہو رہے ہیں تو میرے پاس کیا ہے جو نذر کر سکوں! میں ساری عمر شہزادے کے نام کی مالا جپ کر گزار دوں گی۔ شہزادہ جب ایک مرتبہ

عرش سے اتر کر ایک خاک نشین کو نواز چکا تو گھڑی گھڑی عرش سے اترنا کیا ضرور "

قاصد کے ہاتھ خط بھیج کر میں کچھ مطمئن سی ہوگئی۔ میرے دل کی وسعتیں وسیع تر ہوگئیں۔ دو دن گذرے تیسرے دن آدمی خبر لایا کہ شہزادہ میری محبت میں بے چین ہے۔ ہر لمحہ اس کی زبان پر میرا ہی نام رہتا ہے ——— یا اللہ میں اب کیا کر سکتی تھی!

(۵)

اس زور کی بارش ہوئی کہ ندی نالے ایک ہوگئے بجلی کی چمک اور بادل کی گرج سے دل بلیوں اچھل رہا تھا، بارش ختم ہی نہیں ہو رہی تھی ——— ندی کے پانی کی آواز زور زور سے آنے لگی ——— اس کے ساتھ چیخ و پکار کی آوازیں آئیں اور ایک کہرام مچ گیا۔ ندی میں سیلاب آیا اور قریب قریب کے مکانات اجڑتے جارہے تھے بچوں اور عورتوں کی چیخوں سے سارا جنگل گونج اٹھا سیلاب بڑھتا جارہا تھا ——— اپنے لئے میری جان کی کچھ قیمت نہ تھی مگر شہزادہ! ——— مجھے شہزادہ کا خیال آیا۔ سیلاب قریب آرہا تھا۔ میرے ہمسایہ کے دو چار گھروں سے پانی ٹکرانے لگا۔ میں دروازے پر کھڑی ہوگئی۔ کتنا ہیبت ناک منظر تھا اتنے میں بجلی چمکی ——— میری آنکھوں نے دیکھا کہ شہزادہ تن تنہا گھوڑا دوڑائے چلا آرہا ہے۔ اس طوفان میں اس زور کے سیلاب میں شہزادہ ندی پار کر کے مجھ تک آیا تھا۔ پانی میں تر ابور شہزادے کا گھوڑا میرے دروازہ پر رکا۔ بے اختیار میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی میں دوڑ کر گھوڑے کے پیروں پر گر گئی۔

اشفاق

جامعۂ عثمانیہ کے مزدور

ذیل کا مضمون بزم معاشیات و عمرانیات کے تحقیقاتی مضامین کے سلسلہ میں لکھا گیا تھا اور اس کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا۔ اگرچہ میں نے اپنی اکثر معلومات کو اس میں درج نہیں کیا ہے مگر پھر بھی امکان ہے کہ بعض حضرات کو اس مضمون میں ایسی باتیں معلوم ہوں جن کو عامیانہ خیال کیا جائے۔ لیکن عمرانی تحقیق میں اخلاقیوں اور بداخلاقیوں دونوں کا ذکر ضروری ہے اور کسی چیز کی اصلاح کی طرف اس وقت تک ہرگز کوئی قدم نہیں اُٹھایا جا سکتا تاوقتیکہ تصویر کے دو رُخ پیش نظر نہ ہوں۔ فقط

ہم جس وقت پُر جوش تقریریں کرتے ہیں اور اعلیٰ پایہ کے مضامین لکھتے ہیں تو اس وقت عموماً افریقہ اور امریکہ کے وحشیوں اور پست ماندہ اقوام کا ذکر بڑے افسوس کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم کو ان انسانوں کی حالت پر رحم آتا ہے جو نیم برہنہ تنگ و تاریک جھونپڑیوں میں رہتے ہیں جن کے بچے سردی و گرمی میں لباس سے بے نیاز رہتے ہیں جن کی غذا جنگلی پھل اور پھول یا معمولی اور ادنیٰ فصلیں ہوتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسی پست ماندہ اقوام کا حال سُن کر ہمدردی کا پیدا ہونا لازمی ہے کیونکہ ہمدردی کے واسطے کسی قوم یا فرقے کا امتیاز ضروری نہیں مگر اس جوش اور ہمدردی میں ہم خود اپنے ملک کی حالت بھول جاتے ہیں اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے یہاں بھی اس صدی میں ایسی اقوام آباد ہیں جو کسی طرح افریقہ اور امریکہ کے وحشیوں اور جنگلیوں سے کم نہیں ہیں۔

آج میں آپ کو ایسی ہی چند پست قوموں کا کچھ حال سناتا ہوں۔ یہ اقوام اگرچہ جنگلی ہیں مگر میں نے جہاں ان کے حالات، عادات واطوار، طرز رہایش، اور طرز معاشرت کا مطالعہ کیا ہے وہ کوئی جنگلی یادورافتادہ مقام نہیں ہے بلکہ یہ شہر کے اطراف کا ذکر ہے جو ہندوستان کا چوتھا شہر ہے اور ایک وسیع اور ترقی یافتہ دیسی ریاست کا دارالخلافہ ہے جہاں کشادہ سڑکوں، عالیشان بنگلوں خوشنما دکانوں اور اعلیٰ قسم کی موٹروں کی کثرت ہے۔ جہاں ہر سال "تعیشاتی اشیاء" پر کئی لاکھ روپیہ صرف ہوتا ہے۔ یہ لوگ اس شہر سے ۶، ۷ میل کے فاصلہ پر رہتے ہیں اور شہری زندگی سے بہت کم متاثر ہوتے ہیں ان سے میری مراد وہ مزدور ہیں جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کے عارضی اور مستقل عمارات کی بنیادیں ڈالی ہیں۔

جس وقت اڈیکمیٹ کی سنگلاخ، پتھریلی اور نشیب وفراز زمین پر اس عظیم الشان جامعہ کی بنیاد رکھی جارہی تھی اس وقت یہاں ۳۶ ہزار مزدور کام کرتے تھے مگر جس وقت مجھے ان لوگوں کو دیکھنے کا موقع ملا اس وقت ان کی بڑی تعداد اپنا کام ختم کرنے کے بعد واپس جاچکی تھی اور یہاں صرف ½ ۱ ہزار مزدور موجود تھے۔ اگر ابتدائی زمانہ میں ان کے حالات کا مطالعہ کیا جاتا تو بہت سی معلومات فراہم ہوسکتی تھیں۔

جامعہ عثمانیہ کے کیمپ میں رہنے والے مزدوروں کو ہم کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلے طبقہ میں عمدہ کام کرنے والے شامل ہیں یہ لوگ فن تعمیر سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہیں یہ لوگ عموماً جنوبی ہند کے اضلاع مدوار، تنجور، رام ناتھ اور ان کے ملحقہ علاقوں کے ہوتے ہیں۔ پتھر تراشنے والے بعض پشاوری پٹھان بھی اس طبقے میں آجاتے ہیں اس طبقہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو پتھروں کو صاف اور چکنا کرکے اُس کو آئینہ کے مماثل بنادیتے ہیں نسلی اعتبار سے یہ سب لوگ بہت طاقتور اور مضبوط ہوتے ہیں۔

دوسرے طبقے میں وہ مزدور شامل ہیں جو معمولی کام کرتے ہیں۔ مثلاً بڑے بڑے پتھر پہاڑوں سے تیرگاہ تک لانا، مٹی ڈھونا، سڑکیں بنانا، پتھر کوٹنا وغیرہ۔ ان میں وڈر، لمباڑے، دھیڑ، مانگ، ڈگانی وغیرہ فرقے شامل ہیں۔ اب میں ان لوگوں کا حال الگ الگ تفصیل سے بیان کروں گا۔

وڈر یہ لوگ ایک تو گرم ملک کے باشندے ہیں۔ پھر جنگلوں میں رہتے ہیں، محنت حد سے زیادہ کرتے ہیں۔ غذا معمولی کھاتے ہیں صفائی کا مطلق خیال نہیں کرتے اس وجہ سے ان کا رنگ پختہ سیاہ ہوجاتا ہے۔ یہی حال عورتوں کا ہے ایک مرتبہ میں نے ان کے بڑھے آدمی کو دیکھا جو طاقتور اور مضبوط تھا اور صرف ایک اونچی دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ داڑھی کے

بال بکھرے تھے سینہ پر بھی لمبے لمبے بال تھے ۔ مجھے یہ آدمی دیکھ کر ڈاروِن کی "گمشدہ کڑی" یاد آگئی ۔ اگر دنیا میں اس قسم کے انسانوں کے ایک عظیم اکثریت مل جائے تو غالباً کسی کو ڈاروِن کے نظریہ ارتقا میں شک نہ رہے ۔

میں جس وقت ان کے کیمپ میں گیا تھا مجھے افریقہ کے زولو اور بنٹو قوم کی وہ جھونپڑیاں یاد آگئیں جن کی تصویر اکثر رسالوں اور اخباروں میں نظر سے گذری تھیں ۔ کیمپ کے چھوٹے بڑے کتوں نے مجھ اپنے اجنبی کو دیکھ کر اس زور شور سے بھونکنا شروع کیا کہ گویا وہ مجھ کو انسان ہی نہیں سمجھتے ۔ چاروں طرف سے ننھے ننھے ننگ دھڑنگ سیاہ بچوں، نیم برہنہ مرد اور عورتوں نے مجھے گھیر لیا ۔ چند لمحوں تک حیرت و استعجاب سے دیکھنے کے بعد وہ اپنی زبان میں جس سے میں قطعاً ناواقف ہوں میرے متعلق خیال آرائیاں کرنے لگے ۔ میں اس منظر میں ایسا کھو گیا کہ کچھ دیر کے لئے بالکل بھول گیا کہ میں افریقہ کے کسی حصہ میں ہوں یا ہندوستان کے !

یہ قوم جب جنگلوں میں رہا کرتی ہے تو پکی جرائم پیشہ ہوتی ہے ۔ اور آدمی کو چند روپیوں کے حاصل کرنے کے خیال سے مار ڈالنا بالکل معمولی بات سمجھتے ہیں ۔ وہاں ان کے مکانات میں جو "گرسی" کہلاتے ہیں قدم رکھنے کی جرأت کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے ان کے پاس بڑے بڑے جنگلی کتے بھی ہوتے ہیں جو ان کو جرائم میں مدد دیتے ہیں مگر شہروں میں آکر یہ جرائم نہیں کر سکتے کیونکہ باقاعدہ پولس کی نگرانی میں رکھے جاتے ہیں ۔ اگرچہ ان کو شہروں میں جنگلوں سے زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے مگر اس لحاظ سے کہ ان کی آزادی میں فرق آجاتا ہے ۔ یہ شہروں کی زندگی کو پسند نہیں کرتے ۔ جامعہ عثمانیہ کے وڈروں کے دو فرقے ہیں ۔ ایک رائچوری وڈر کہلاتے ہیں اور دوسرے مٹی وڈر ۔ طور و طریق، طرز معاشرت میں دونوں یکساں زندگی بسر کرتے ہیں ۔ البتہ بعض چھوٹی چھوٹی باتوں میں اختلاف ہے

یہ لوگ آٹھ، دس جھونپڑیاں ایک ساتھ ملا کر اس طرح بناتے ہیں کہ ایک گول دائرہ بن جاتا ہے یعنی جھونپڑیاں دور تک دور دور چلی جاتی ہیں ۔ ہر جھونپڑی کے باہر مٹی کے دس بارہ برتن پڑے نظر آتے ہیں ۔ یہ لوگ پانی کے برتن باہر ہی رکھتے ہیں کیونکہ جھونپڑی میں ان کے رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی ۔ ان کے جھونپڑے دور سے مرغیوں کے ٹاپے کی مانند نظر آتے ہیں بعض جھونپڑیاں بیضوی شکل کی ہوتی ہیں ۔ دروازہ اس قدر چھوٹا ہوتا ہے کہ آدمی بیٹھ کر اس کے اندر جا سکتا ہے ۔ یہ جھونپڑیاں تاڑ کے پتوں سے بنائی جاتی ہیں ۔ بارش میں ٹپکنے کا خوف نہیں رہتا ۔ بیضوی شکل کی جھونپڑیوں میں چاروں طرف ایک فٹ کچی مٹی کی دیوار کھڑی کر کے اس پر دو چار بانسوں کے پتلے پتلے ٹکڑے کر کے مثل کمان کے لگا دیتے ہیں اور ان پر پتے ڈال کر جھونپڑیاں تیار کر لیتے ہیں ۔ جھونپڑی میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ آدمی کھڑا ہو سکے ۔ گول جھونپڑیوں کا قطر عموماً چھ فٹ ہوتا ہے ۔ دوسری قسم کی جھونپڑیاں چھوٹی بڑی ہوتی ہیں بعض ایسی بھی جھونپڑیاں ہیں جن کا طول ۵ فٹ اور عرض ۴ فٹ ہے ۔ رائچوری وڈروں کی جھونپڑیاں ذرا اچھی ہوتی ہیں ۔ اور

ان میں چاروں طرف دیواریں بھی ہوتی ہیں۔ بعض دیواروں پر سفیدی بھی موجود ہے اور گیرو (سرخ رنگ) سے معمولی پھول بیل بنائے گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنی بعض جھونپڑیوں میں بیچ میں ایک دیوار کھڑی کرتے ہیں اور اس طرح جھونپڑی کے دو حصّے ہوجاتے ہیں دائرہ میں کسی جگہ یا نمایاں جگہ پر مقدم کی جھونپڑی ہوتی ہے اس کو جھونپڑا کہنا مناسب ہے کیونکہ اس میں آدمی کھڑا ہوسکتا ہے۔ اس میں روشنی بھی آتی ہے مقدم اور راجگورہی ڈڈروں کی جھونپڑیوں کے علاوہ اور کسی جھونپڑی میں اتنی روشنی نہیں ہوتی کہ آدمی کتاب پڑھ سکے۔ مقدّم کے جھونپڑے کے سامنے ایک چھپّر بھی ڈال دیا جاتا ہے یہ گویا اس کے دفتر کا کام دیتا ہے۔ مقدم کے جھونپڑے کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا معیار زندگی دوسرے لوگوں سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ اس کے یہاں ایک معمولی پلنگ، لکڑی کا صندوق، پیتل کے برتن، چھوٹی قندیل اور اسی قسم کی چند اور چیزیں نظر آتی ہیں۔ بعض شوقین مقدّموں کے یہاں لنگی کے کیلنڈر، اور کپڑوں کے تھانوں کی تصویریں بھی چپکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ برسات کے علاوہ دوسرے موسموں میں اپنا کھانا جھونپڑیوں کے باہر پکاتے ہیں مگر برسات میں کھانا بھی اندر پکتا ہے۔ یہ لوگ اپنے اوڑھنے بچھانے کے کپڑے، اور پہننے کے کپڑے بانسوں پر ٹانگتے ہیں۔ جھونپڑیاں اندر سے گوبر سے لیپی جاتی ہیں۔ اور باہر بھی کچھ لیپ دیا جاتا ہے۔ ایک جھونپڑی میں عموماً میاں بیوی اور اس کے دو تین بچے رہتے ہیں یہ لوگ سور اور مرغیاں بھی پالتے ہیں اور ان کے لئے بھی اپنی جھونپڑیوں کے قریب چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا دیتے ہیں ان لوگوں کے کیمپ کے آس پاس پتھروں اور چٹانوں میں بڑی تعداد میں چھوٹے چھوٹے گڑھے نظر آتے ہیں جو مرچیں کوٹنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

ان کی عام غذا چاول ہے مگر یہ بہت معمولی قسم کا چاول کھاتے ہیں جس کی رنگت سرخ ہوتی ہے۔ ان چاولوں کو اُبال کر ان کے ساتھ سُرخ پسی ہوئی مرچیں بڑی کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ املی کا کھٹّا بھی چاولوں سے کھاتے ہیں۔ بینگن، دالیں، جوار بہت کم کھاتے ہیں۔ جنگلات میں ان کو جنگلی مرغیاں اور ان کے انڈے آسانی سے مل جاتے ہیں اس لئے یہ ان کو بڑے شوق سے کھاتے ہیں مگر شہروں میں یہ چیزیں نایاب ہونے کی وجہ سے میسر نہیں آتیں۔ بلّی و ڈرسور بھی کھاتے ہیں یہ لوگ سیندھی کے بڑے شوقین ہوتے ہیں لیکن ایک عجیب بات ہے کہ جنگلوں میں یہ سیندھی صرف تہواروں اور شادی بیاہ کے موقعہ پر پیا کرتے تھے مگر شہروں میں چونکہ ان کو اُجرت کافی ملتی تھی اس لئے عادی ہوگئے ہیں اور روزانہ آمدنی کا ایک اچھا خاصہ حصّہ اس کی نذر ہوجاتا ہے ان کے یہاں ایک آدمی ۲۰ سیر سیندھی ۲۴ گھنٹے کے اندر پی سکتا ہے

ڈور موٹے کپڑے کا ایک سٹلو کا پہنتا ہے۔ سر پر ایک چھوٹی سی پگڑی باندھتا ہے۔ دھوتی گھٹنوں سے اونچی ہوتی ہے عموماً مرد سر منڈواتے ہیں البتہ بعض انگریزی بال بھی رکھتے ہیں۔ عورتیں ایک ساری باندھتی ہیں اور یہ ساری بھی دھوتی کی طرح باندھی جاتی ہے۔ اوپر کوئی کپڑا نہیں پہنتی بلکہ ساری کا ایک پلو کندھے پر سے جاکر اس طرح ڈال لیتی ہیں کہ ان کا سینہ چھپ جاتا ہے۔ ایک کندھا اور سر کھلا رہتا ہے۔ روایت مشہور ہے کہ اس قوم میں آج تک کسی عورت نے سینہ بند (چولی) نہیں پہنا، اور ان کا عقیدہ ہے کہ وہ اگر یہ بدعت کریں تو ان پر کوئی مصیبت نازل ہوگی۔ عورتیں جوڑا باندھتی ہیں۔ ہاتھوں میں سیسے کی ایک ایک چوڑی اور کہنیوں سے اوپر بھی ایک چوڑی پہنتی ہیں۔ پاؤں میں بھی ایک موٹی چوڑی پڑی رہتی ہے۔ گلے میں سُرخ، سفید اور کالے دانوں کے معمولی قسم کے ہار ہوتے ہیں۔ انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں پہنتی ہیں۔ مردوں سے زیادہ عورتیں چپل کا استعمال کرتی ہیں۔ اور مقامی چمار ان لوگوں کے لئے موٹی اور بھدی چپلیں تیار کرتا ہے۔ مرد، عورت اور بچے بیڑی کے بڑے شایق ہیں۔ یہ بیڑی کافی موٹی ہوتی ہے اور ہمارے سگار سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ایک بیڑی کو متعدد مرتبہ پی کر ختم کیا جاتا ہے۔ عورتوں کے کان چھدے ہوئے ہوتے ہیں اور ان میں چوڑے پھول یا سلاخ دار پھول پہنتی ہیں۔ ناک دونوں جانب سے چھدی ہوئی ہوتی ہے۔ بعض عورتیں کمر میں چاندی کی پیٹی بھی ڈالے رہتی ہیں۔

ڈور مختلف طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں اور ہر طبقہ کا ایک پنچ یا سردار ہوتا ہے جس کو "مقدم" کہتے ہیں۔ جو ان ہی کے ساتھ رہتا ہے۔ اور ان کے خانگی معاشی اور معاشرتی جھگڑوں کا فیصلہ یہی کرتا ہے۔ بعض جگہ مقدّم گتہ لے لیتا ہے اور پھر اپنے طور ان لوگوں سے کام لیتا ہے۔ ان کے یہاں طلاق کا رواج ہے اگر شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو وہ مقدم سے شکایت کرتا ہے اور مقدّم دونوں کے بیانات سُن کر فیصلہ کر دیتا ہے۔ عموماً طلاق کے وقت بیوی کو شوہر سے وہ رقم واپس دلوائی جاتی ہے جو شادی کے موقعہ پر بیوی کے والدین نے داماد کو ادا کی تھی۔ اگر مقدّم کے خیال میں شوہر کا رویہ نامنصفانہ ہے تو وہ اس پر کچھ مزید جرمانہ بھی کر دیتا ہے۔ یہ جرمانہ مقدّم کو ادا کیا جاتا ہے اور اس قسم کے جرمانوں کو رفاہ عام کے کاموں شلاً مندر بنوانا، محتاج اور غریبوں کی مدد کرنا کنویں بنوانا یا ساری برادری کو سیندھی پلوانا وغیرہ پر خرچ کیا جاتا ہے۔ مطلقہ عورت کو دوبارہ شادی کرنے کا حق رہتا ہے۔ مقدم ان تمام مقدمات، جن کو ہم فوجداری اور دیوانی کے معاملات کہہ سکتے ہیں فیصلہ کرتا ہے اور اس کو اس کا فیصلہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

شادی ہندوانہ رسم و رواج کے تحت ہوتی ہے اور اس میں کافی رقم صرف ہوتی ہے۔ شادی کے وقت

لڑکی کے والدین لڑکے کو کچھ رقم بھی دیتے ہیں جس کی تعداد ۴ روپیہ سے ۴۰ روپیہ تک ہوتی ہے اور لڑکی کے والدین بہت زیادہ صاحب حیثیت ہوں تو رقم میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ شادی بچپن ہی میں ہوجاتی ہے۔ شادی کے بعد دولہا دلہن ماں باپ کے ساتھ نہیں رہتے بلکہ ان کے لئے ایک جھونپڑی بنادی جاتی ہے۔ بیوہ عورت کی دوبارہ شادی ہوسکتی ہے۔ وڈروں کے بعض طبقے اپنے مردوں کو جلاتے ہیں اور چھوٹے بچوں کو دفن کرتے ہیں مگر بعض کے یہاں جلانے کی رسم موجود ہی نہیں۔ دیوالی کے موقعہ پر یہ لوگ سیندور، خوشبودار عرق، پانی، پھول، اور سیتا پھل کی ڈالیاں لے کر اپنے قبرستان میں جاتے ہیں اور قبروں کے اوپر ڈالیاں گاڑ کر سیندور اور عرق وغیرہ چھڑکتے ہیں پھر عورتیں ہر قبر پر خوب چیخ چیخ کر روتی ہیں۔ روتے وقت سر قبر پر رکھ لیا جاتا ہے۔

ان کے دیوتا مختلف ہوتے ہیں زیادہ تر ان کے یہاں وینکٹ ور، پوچم اما اور رام اما کی پوجا ہوتی ہے۔ ہر کیمپ کے پاس ان دیوتاؤں کے ۳، ۳½ فٹ اونچے اور ۲، ۲½ فٹ چوڑے دیول نظر آتے ہیں۔ دیول میں کوئی مورت یا بت نہیں ہوتا اپنے دیوتاؤں پر پسی ہوئی سرخ مرچیں، پسی ہوئی ہلدی، ناریل، پیاز، گیرو، پیسے، بکروں اور مرغوں کی ٹانگیں اور اسی قسم کے دوسری چیزیں بطور چڑھاوے کے چڑھائی جاتی ہیں۔ ۵۰ فی صدی وڈروں نے مذہب عیسوی اختیار کرلیا ہے مگر اس سے ان کی طرز رہائش اور طرز معاشرت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا تقریباً ہر جمعے کو دو تین کنواریاں (nuns) یہاں آتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچوں سے دعا منگواتی ہیں اور ان کو سلام کرنا اور دوسری مفید باتیں سکھاتی ہیں۔ اور ترغیب و تحریص کے لئے مٹھائی بھی تقسیم کرتی ہیں۔

اگر یہ کسی کام کا ارادہ کررہے ہوں اور لومڑی کی آواز آجائے یا کوئی چھینک دے تو ان کے خیال میں کام پورا نہیں ہوسکتا۔ چیچک، کالرہ، اور دوسری مہلک بیماریوں کو دیوتاؤں کا غضب مقرر کرتے ہیں۔ اور بجائے حکیم یا ڈاکٹر کے پاس رجوع ہونے کے دیوتاؤں سے دعا مانگتے ہیں۔ جس سال بارش نہ ہو اور قحط سالی کے آثار نمایاں ہونے لگیں تو ۲۰، ۲۵، ایک دائرہ کی شکل میں کھڑے ہوتے ہیں بیچ میں ایک بتی یا چراغ روشن کرتے ہیں اور اس کے گرد گھوم گھوم کر گیت گاتے ہیں جس میں رام لچھمن اور سیتا جی کی تعریف و توصیف ہوتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس عمل سے دیوتا خوش ہوتے ہیں اور بارش شروع ہوجاتی ہے۔

ان سب کی زبان تلنگی ہے۔ مگر اردو بولتے اور سمجھ سکتے ہیں۔

لمباڑے میرے رہنما نے تبلایا کہ ان کی خاصیت اُلو کی سی ہے جس طرح وہ گوشۂ تنہائی کو پسند کرتا ہے اس طرح یہ لوگ مل جل کر رہنے کے عادی نہیں ہیں۔ جس وقت ہم ان کے کیمپ میں پہونچے تو ایک لمباڑن چلانے لگی "میاں اجنبیوں کا کیا کام"۔ مگر رہنما کے اثر سے بہت جلد وہ اس قدر مہربان ہوگئی کہ اس نے اپنی بھاوج کو جس کی شادی ایک روز پہلے ہوئی تھی ہمیں دکھلا دیا۔ ایک دن کی دلہن کا نام سن کر نہ معلوم کیا کیا قیاس آرائیاں ہونگی مگر یہ دلہن ہماری دیکھی بھالی دلہنوں سے مختلف تھی ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکی اپنے مخصوص نئے قومی لباس میں باہر بیٹھی تھی ہم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اپنی نئی جھونپڑی میں چلی گئی۔ اور جب اس کی نند اس کو باہر لائی تو اس نے گھونگٹ نکال لیا تھا۔ اور جب اس کی نند نے گھونگٹ اٹھا کر اس کا سیاہ فام معصوم چہرہ ہمیں دکھلایا تو شرم سے اس نے آنکھیں بند کرلیں تھیں۔ ایشیائی شرم وحیا ہماری جنگلی اقوام میں بھی موجود ہے۔

مردوں کے لباس میں شلوکا، دھوتی اور پگڑی شامل ہوتی ہے ان کی عورتیں اونچا لہنگا پہنتی ہیں اور بدن پر ایک شلوکا جس میں سینہ اور پیٹ کے حصہ پر شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگے رہتے ہیں۔ یہ محض خوبصورتی کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ سر پر ڈوپٹہ اوڑھتی ہیں جس کو یہ لوگ "ٹکڑی" کہتے ہیں۔ یہ ڈوپٹہ اس طرح اوڑھا جاتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ لہنگے میں دبا کر پیچھے ڈال دیا جاتا ہے اور باقی سر پر آجاتا ہے۔ ان کا سارا لباس ایک ہی قسم کے کپڑے کا ہوتا ہے اس کپڑے پر پختہ رنگ کے پھول بیل بنے ہوتے ہیں یہ ان کی قوم کا مخصوص لباس ہے اور ہر لڑکی ۴، ۵ سال سے زندگی بھر یہی لباس پہنتی ہے اور اپنے اس مخصوص لباس کی وجہ سے لمباڑنی ہر جگہ آسانی سے پہچانی جاسکتی ہے عورتیں اپنے بالوں میں گوند لگا کر ان کو جمالیتی ہیں اور کانوں کے اوپر کے بال موڑ کر کانوں کے سامنے لاتی ہیں۔ ان بالوں میں دونوں طرف ۵، ۶ تولہ وزن کی جھمکیاں پہنتی ہیں جو تقریباً ٹھڈی تک لٹکتی رہتی ہیں۔ بعد میں یہ لٹیں کانوں کے نیچے سے جاکر چوٹی میں مل جاتی ہیں۔ یہ جوڑا نہیں باندھتی بلکہ ان کی چوٹی کھلی رہتی ہے اور چوٹی میں کوڑیاں بھی باندھتی ہیں ہاتھوں میں نصف انچ چوڑی سفید چوڑیاں پہنتی ہیں اور ان کا سلسلہ کہنی تک جاتا ہے پھر کہنی سے اوپر بھی ۲، ۳ چوڑیاں اسی قسم کی پہنی جاتی ہیں۔ پاؤں میں ایک قسم کا پیتلی زیور پہنتی ہیں جو پاؤں سے بالکل چپکا رہتا ہے مگر یہ اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے اور اس میں دانے یا پتھر کے چھوٹے ٹکڑے بھرے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے چلنے میں آواز پیدا ہوتی ہے۔

گو ان کی مادری زبان تلنگی ہے مگر یہ اُردو خوب صاف بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ شیو کی پوجا کرتے ہیں پوجا کے لئے کوئی دن مقرر نہیں ہے۔ پوجا کے وقت آگ جلائی جاتی ہے اور جب شعلے کافی بہت بلند ہوجاتے ہیں تو گھی چھڑکتے ہیں اور ڈنڈوت کرتے ہیں۔ غیر معمولی موقعوں پر پوجا کے وقت بکرا بھی ذبح کرتے ہیں ان کے سردار کو "نایک" کہا جاتا ہے اور نایک کو وہی تمام

حقوق حاصل ہوتے ہیں جو مقدم کو حاصل ہیں۔ ان کے یہاں لڑکی کی شادی کی عمر ۱۱، ۱۲ سال اور لڑکے کے لئے ۱۳، ۱۴ سال مقرر ہے اور عموماً اسی زمانہ میں شادی ہوجاتی ہے۔ بیوہ اور مطلقہ دونوں دوبارہ شادی کرسکتی ہیں لیکن پہلی صورت میں سواسو روپیہ اور دوسری صورت میں ۳۰۰ سے ۰۰ ، روپیہ تک شادی کرنے والے مرد کو عورت کے خاندان والوں کو دینا پڑتا ہے۔ ان کے یہاں مرد ۷، ۸ شادیاں کرسکتا ہے مگر آجکل عموماً دو سے زیادہ شادیاں نہیں کی جاتیں۔ مرد سنگ تراشی یا اسی قسم کا کوئی اور کام کرکے روپیہ ڈیڑھ روپیہ روز کمالیتے ہیں، عورتیں چونہ وغیرہ ڈھوتی ہیں اور ان کو ۴ر یومیہ مزدوری مل جاتی ہے۔

ان کی غذا جوار، دالیں، چاول ہیں۔ جوار کی روٹی اُلٹے توے یا ٹھیکرے پر پکائی جاتی ہے اور بینگن یا دال کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ یہ اپنا کھانا مٹی کے برتنوں میں پکاتے ہیں ان کی جھونپڑیاں وڈروں کی جھونپڑیوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ایک طرف سے بالکل کھلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور یہی رُخ ان کے دروازے کا کام دیتا ہے۔ اس میں روشنی اور ہوا بخوبی آسکتی ہے رات کو دروازے کے سامنے ٹٹی کھڑی کرلی جاتی ہے اور اس طرح جھونپڑی محفوظ ہوجاتی ہے۔ یہ لوگ گوشت بھی کھاتے ہیں اور شراب وسیندھی بھی پیتے ہیں۔ توانائی کے لحاظ سے یہ وڈروں سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ یہ لوگ کالرہ سے بہت جلد متاثر ہوجاتے ہیں اور ہر سال اس مرض سے ان کے یہاں کافی تعداد مرجاتی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ اگر کسی کام کو جاتے ہوئے کوئی چھینک دے، یا کتا کان ہلادے، یا پیچھے سے گیڈر آجائے، یا بکری آواز نکالے تو کام خراب ہوجاتا ہے۔ اور اس لئے کچھ دیر بعد اس کام کا ارادہ کرنا چاہئے۔ البتہ اگر گیڈر سامنے سے آجائے تو اُن کا مقصد پورا ہوجائے گا۔ اگر بارش نہ ہو تو چند آدمی مل کر ایک گیت جو کافی طویل ہے گاتے ہیں اور ناچتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس عمل سے بارش ضرور ہوتی ہے۔ ان کی عورتوں کو گانا اور ناچنا بہت اچھا آتا ہے اور عموماً ہولی کے موقعہ پر دس بارہ لباڑنیوں کی ایک جماعت ایک ساتھ ناچتی اور گاتی ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے اس تہوار پر کافی آمدنی بھی حاصل کرلی جاتی ہے

دھیڑ اور مانگ اسی قوم کے ایک پنڈت یا عالم نے بتایا کہ یہ لوگ اچھوت ہیں۔ منو کی رو سے ان کا کام کاشتکاروں کو کھیتی باڑی کے معاملات میں مدد کرنا تھا۔ ان کے دوسرے کام جوتے بنانا، لاشیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا۔ گاؤں کی صفائی کی ذمہ داری۔ بیماریوں کے زمانہ میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے اعلیٰ ذاتوں کی طرف سے بھینسوں کی قربانی کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ آج کل بھی یہ لوگ دیہات میں اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں ان کو "انعام داروں" میں شامل کیا جاتا ہے اور عموماً حکومت کی جانب سے تین روپیہ سال کی معافی ان کو دیجاتی ہے۔ گاؤں میں جب

کوئی افسر آتا ہے تو ان کا فرض ہے کہ اس کی ضروریات کی تکمیل کرائیں۔ کاشتکار بھی ان کو فصل کے موقعہ پر کچھ دے دیتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کیمپ میں یہ آپ محنت مزدوری کرتے ہیں۔ مرد معماری، سنگ تراشی اور اینٹیں بنانے کا کام کرتے ہیں۔ عورتوں مٹی ڈھونا، چونا ڈالنا یا اسی قسم کے اور دوسرے کام انجام دیتی ہیں۔ یہ ہر قسم کی چیزیں کھا سکتے ہیں۔ ان کی غذا میں چاول، جوار اور ترکاریوں کے علاوہ مختلف کیڑے مکوڑے، مینڈکے، سور، اور مردہ جانور بھی شامل ہیں۔ یہ سب دیوتاؤں کو مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں چنانچہ جو لوگ مسلمان پیروں کو مانتے ہیں وہ شراب مردہ اور اسی قسم کی دوسری چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی زبان ملنگی ہے مگر ۹۰ فی صد کے قریب اُردو بول اور سمجھ سکتے ہیں ان کا سردار مقدم کہلاتا ہے اور تمام جھگڑوں کا فیصلہ وہی کرتا ہے۔

ان کے یہاں عموماً جھگڑوں کا فیصلہ پنچایت کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور اس پنچایت میں ۴، ۵ مقدم شامل ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملے میں پنچایت فیصلہ نہ کرسکے یا کوئی فریق اس کے فیصلہ کو تسلیم نہ کرے تو پھر انسپکٹر (جو حکومت کی جانب سے ان کی نگرانی کرتا ہے) اس کا تصفیہ کرتا ہے۔

مردوں کے لباس میں دھوتی، پگڑی، اور شلوکا شامل ہے بعض لوگ جوتا اور کوٹ بھی پہنتے ہیں۔ عورتیں آستین دار چولی پہنتی ہیں جس کے دو پلے سامنے آتے ہیں اور منہ کے بیچ میں اُن کو باندھ لیا جاتا ہے۔ اس چولی کا مقصد صرف سینے کو چھپانا ہوتا ہے ورنہ پیٹ کا نچلا حصہ کھلا رہتا ہے۔ اونچی ساڑی دھوتی کی طرح باندھتی ہیں اور اس کا ایک پلو سر پر ڈال لیتی ہیں۔ ناک، کان میں زیور بھی پہنتی ہیں۔ ماتھے پر بندی ضرور لگاتی ہیں۔ گلے میں موتیوں کا ہار، ہاتھوں اور پاؤں میں چھلے بھی استعمال کرتی ہیں۔

شادی ہندوانہ رسوم کے تحت بڑی دھوم دھام سے ہوتی ہے اور شادی کے موقعہ پر برادری کو دعوت دی جاتی ہے جس میں ۱۰۰ روپیہ سے ۴۰۰ روپیہ تک خرچ ہوتے ہیں بیوہ اور مطلقہ عورت کی شادی ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی دوسرے مرد سے تعلقات قایم کرے، اس صورت میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ قصور کس کا ہے۔ اگر غیر مرد کا قصور ثابت ہوجائے تو اس کو عورت کے شوہر کو وہ اخراجات دینا پڑتے ہیں جو اس نے اپنی شادی میں کئے تھے اور اس کے بعد عورت آزاد ہوجاتی ہے اور وہ جس سے چاہے شادی کرسکتی ہے۔ بعض لوگ اس بنا پر کہ ان پر دیوتاؤں کا فضل رہے اپنی کم عمر لڑکیوں کو دیوی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ان لڑکیوں کو "مرلی یا جوگی" کہا جاتا ہے۔ ان کی شادی نہیں ہوتی۔ البتہ ان کی شادی کی رسم اس طرح ادا کی جاتی ہے کہ ایک تلوار کو ہار پھول پہنا کر اس کے ساتھ لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں۔ بہر حال عمر بھر انہیں عصمت فروشی کے ذریعہ اپنی زندگی گذارنا پڑتی ہے۔ حکومت کی جانب سے اب لڑکیوں کو مرلی بنانے کی ممانعت ہوچکی ہے چنانچہ اس کیمپ

میں اب کوئی باقاعدہ مرلی نہیں ہے۔

نوگانی یہ لوگ شولاپور کے رہنے والے ہیں اور قوم کے مرہٹے ہیں۔ ان کی زبان مرہٹی ہے مگر اُردو بھی بول سکتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ چٹانوں سے پتھر کاٹنا اور اس کو تراشنا ان ہی کا کام ہے۔ اس وقت کیمپ میں ان کی تعداد ۲۶ کے قریب ہے۔ ان کو ایک روپیہ روزانہ اُجرت ملتی ہے۔ ان کا کیمپ سب سے الگ ہے۔ ان کی خاص غذا جوار ہے۔ چاول بہت کم کھاتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ جوار کھانے سے انسان میں طاقت آتی ہے اور اس کی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے یہاں عورتیں باہر کام نہیں کرتیں بلکہ گھر کا کام ہی کرتی ہیں۔ جوار یہ خود ہی پیستی ہیں۔ ان کے یہاں لڑکی کی شادی ۱۲ برس اور لڑکے کی ۱۸ برس کے سن میں ہوتی ہے۔ مرد قمیص، دھوتی، اور پگڑی باندھتے ہیں، عورتیں ساری اور شلوکا پہنتی ہیں یہ لوگ وشنو، کرشن، اور شنکرجی کی پوجا کرتے ہیں۔ سیندھی اور شراب کے عادی نہیں ہیں البتہ تہواروں، میلوں اور شادی بیاہ میں خوب پیتے ہیں، مچھلی، انڈے اور بکری کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ جھونپڑیاں تو ان کی بھی معمولی ہیں مگر ان میں سازوسامان کچھ زیادہ نظر آتا ہے۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا معیار زندگی بہت زیادہ گرا ہوا نہیں ہے۔ ان کے یہاں اوڑھنے اور بچھانے کے لئے سلیقے کے کپڑے نظر آتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے اکثر حصوں میں آلات و اوزار تیز کرنے کے لئے متعدد بھٹیاں قایم ہیں جہاں لوہار کو ۸ روپیہ، بھٹی دھونکنے والے کو ۴ روپیہ، اور آلات و اوزار ادھر سے ادھر لانے والے کو بھی ۴ روپیہ مزدوری ملتی ہے ان بھٹیوں میں عموماً بھتیہ چلانے کا کام عورتیں کرتی ہیں اور ان کو بھی ۴ روپیہ اُجرت ملتی ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے مزدوروں کو اگرچہ اُجرت کافی ملتی ہے اور پھر خاندان کے سب افراد کچھ نہ کچھ کما لیتے ہیں اور اس طرح مجموعی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے مگر اس کے باوجود ان کے پاس کچھ پس انداز نہیں ہے اور بلکہ بعض مزدور تو سیٹھ ساہوکاروں کے قرضدار ہیں۔ اس رقبہ میں اکثر شمالی ہند کے لوگوں نے چائے خانہ یا دوکانیں کھول رکھی ہیں۔ مگر حقیقتاً وہ روپیہ کا لین دین کرتے ہیں اور ان سے ۱۲ روپیہ سینکڑہ ماہوار سے ڈھائی روپیہ ماہوار تک سود لیتے ہیں گویا شرح سود ۹ فی صد سے ۳۰ فی صد تک ہوتی ہے۔ قرض عموماً شادی بیاہ یا اسی قسم کے اور دوسرے غیر مفید کاموں کے لئے لیا جاتا ہے کیمپ میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پاس پس انداز بھی ہے یہ یا تو دیوار میں کوئی سوراخ کر کے اس میں ایک برتن گاڑ دیتے ہیں۔ یا چولے کے نیچے ایک گڑھا کھود کر اس میں اپنا سرمایہ دفینہ کی شکل میں رکھ دیتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کے مزدوروں کا (Chorus.) "ہائی سو" ہے جب وہ کوئی سخت محنت کا کام کرتے ہیں تو چلا چلا کر یہ کہتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی توجہ دوسری طرف بٹ جاتی ہے۔ بعض وقت ایک یا دو آدمی مل کر کچھ گاتے ہیں اور جب ان کا ایک مصرعہ ختم ہو جاتا ہے تو دوسرے تمام لوگ اس فقرہ کو دوہراتے ہیں۔

حکومت اور مزدور

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ حکومت نے ان کے لئے رہنے کا انتظام کیا۔ ان سے نہ صرف زمین کا کوئی کرایہ نہیں لیتی بلکہ ان کو جھونپڑیاں بنانے کے لئے سامان وغیرہ بھی مفت دیتی ہے۔ دوسری چیز پانی کا انتظام ہے۔ چنانچہ ان کے ہر کیمپ کے پاس نل لگے ہوئے ہیں جہاں سے عمدہ صاف پانی پینے کے لئے مل جاتا ہے۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ نل ایسی جگہ لگے ہوئے ہیں جہاں غلیظ پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں ہے اس وجہ سے پانی کسی نشیب یا گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے اور مچھر وغیرہ پیدا ہو کر مختلف بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں چونکہ یہ لوگ صاف پانی کی قدر نہیں جانتے اس لئے بعض اوقات وہ غیر مصفا پانی جو درختوں میں دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے اس کو بھی پینے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور عموماً کپڑے تو سب ایک گندہ نالہ میں دھوتے ہیں۔ حکومت نے ان کے لئے ایک دواخانہ بھی قایم کر رکھا ہے جہاں ایک ٹرینڈ ڈاکٹر موجود ہے اور یہاں نہ صرف ان کو طبی امداد مفت حاصل ہوتی ہے بلکہ دوا بھی مفت دی جاتی ہے اور بعض اوقات بیماری کے زمانہ میں غذا اور کپڑوں کا انتظام بھی حکومت کی جانب سے کیا جاتا ہے۔ جب کبھی امراض متعدی مثلاً چیچک، طاعون وغیرہ کا زور ہوتا ہے تو ان کو اور ان کے بچوں کو ٹیکہ بھی دیا جاتا ہے۔ چنانچہ چیچک کا ٹیکہ بہت سے بچوں کے لگ چکا ہے۔ حکومت کی جانب سے یہاں ایک مدرسہ بھی قایم ہے۔ جس میں ابتدائی تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ مدرسہ میں تلنگی، اُردو، حساب وغیرہ پڑھانے کا انتظام ہے مگر اس مدرسہ میں ان مزدوروں کے بچے بہت کم پڑھتے ہیں۔

حکومت کی جانب سے اس رقبہ میں ایک بازار بھی قایم ہے جو "بازار مزدوران" کہلاتا ہے۔ یہاں متعدد دوکانیں ہیں اور مزدوروں کی روزمرہ کی ضروریات مثلاً آٹا، ڈال، نمک، چاول، جوار، گیہوں، لکڑی، ترکاری، گوشت، بیڑی، مٹی کے برتن موجود رہتے ہیں۔

حکومت کی جانب سے بازار میں برقی روشنی کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس مقام پر ہر جمعہ کو دن کے ۱۲ بجے سے شام کے ۶ بجے تک ایک بڑا بازار بھرتا ہے اور اس دن چونکہ مزدوروں کی چھٹی ہوتی ہے اس لئے وہ آسانی سے خرید فروخت کر سکتے ہیں۔ خرید و فروخت میں مرد اور عورت برابر کے شریک ہوتے ہیں بلکہ عورتوں کی تعداد کچھ زیادہ ہی رہتی ہے۔

جمعہ کے بازار میں چھوٹے چھوٹے دوکاندار یہاں آجاتے ہیں۔ منہیاری والوں کے پاس چھوٹے بڑے، کالے پیلے، سرخ سفید موتیوں کی لڑیں، ڈبیاں، آئینے، کنگھے، بٹن تالے، بٹوے، چوڑیاں، چھلے اور ایسی ہی معمولی چیزیں ہوتی ہیں جن میں سب سے زیادہ فروخت چوڑیاں، چھلے اور موتیوں کی ہوتی ہے۔

خوانچہ والے معمولی مٹھائی اور مرمرے، گڑ کے گلگلے، اور پاپڑ لا کر فروخت کرتے ہیں مگر مٹھائی بہت کم بکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس دن تمباکو، املی، سڑے گلے پھل، پیسہ والی سوڈے کی بوتلیں، جھینگے، چھوٹی چھوٹی سوکھی مچھلیاں بھی بکثرت فروخت ہوتی ہیں۔

کپڑے والے نئی دھوتیاں، ساریاں، سلے ہوئے قمیص لے کر آتے ہیں مگر خرید و فروخت مستعمل کپڑوں کی زیادہ ہوتی ہے۔ دوکاندار متوسط اور اچھے گھرانوں سے یہ کپڑے حاصل کرتے ہیں اور ان کو درست کر کے رنگ لیتے ہیں اور غریب مزدور لوگ چونکہ یہ چیزیں نئے کپڑوں کے مقابلہ میں ارزاں مل جاتی ہیں اس وجہ سے وہ ان ہی کو خرید لیتے ہیں۔

محمد احمد سبزواری متعلم سال چہارم

"میں کسی اور ملک سے واقف نہیں جہاں محبت اور رحم پر اس فصاحت سے گفتگو کی جاتی ہو جیسی کہ ہندوستان میں"۔

(ٹگوچی)

حیدرآباد میں جدید علمی و ادبی تحریکات

یہ مضمون بین الکلیاتی کانفرنس جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا

یہ امر اب کسی دلیل کا محتاج نہیں رہا کہ حیدرآباد آج چار سو سال سے اُردو ادب کی ہر طرح سے خدمت کرتا آرہا ہے نہ معلوم "معراج العاشقین" مصنفہ حضرت سید محمد گیسو دراز کے بعد سے آج تک کتنی ہزار کتابیں کن کن علوم پر لکھی گئیں اور ایسے کتنے مصنفین ہیں جو اپنی یادگاریں چھوڑنے کے باوجود اب بھی قعر گمنامی میں پڑے ہیں۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ، وجہی غواصی اور پھر ولی، سراج، ایمان وغیرہ نے ادب کا پایہ بلند کرنے میں جو حصہ لیا ہے اس سے آج دنیائے اُردو واقف ہے لیکن درحقیقت عہد عثمانی اردو کی سرپرستی کا وہ تابناک اور درخشندہ زمانہ ہے کہ اُردو کے نشاۃ ثانیہ کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ اور اس دور کو حیات دوام بخشنے والی تحریک جامعہ عثمانیہ ہے۔ جہاں کی تعلیمی زبان اردو ہی جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس قلیل عرصہ میں اُردو ادب نے راہ ترقی پر جس سرعت کے ساتھ گامزنی کی ہے دنیا میں آج شاید ہی کوئی زبان اس کے مقابلے میں پیش کی جاسکے۔ یہ محض جامعہ عثمانیہ کی تحریک تھی کہ دارالترجمہ اور مجلس وضع اصطلاحات کا قیام عمل میں آیا۔ اور ان اداروں نے وہ مہتم بالشان امور انجام دئے کہ جن اشخاص کو آج سے بیس بائیس سال پہلے اُردو کی تنگ دامانی کی شکایت تھی اب وہ اس کی وسعت پر نازاں ہیں آج اگر غالب زندہ ہوتے تو انہیں ع



مولوی عبدالحق بی-اے (علیگ) صدر شعبہ اردو
مشیر حصہ اردو

فارسی ہیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

کہنے کی ضرورت داعی نہ ہوتی۔ اس تنگ دامانی کا علاج ایک مسیحا نفس نے کر دیا اور اب اس کو حیات دوام حاصل ہوگی۔ اس ترقی اور اوج پر پہنچ جانے کے باوجود اب بھی گیسوئے اُردو اور زیادہ محنت و سرعت سے سنوارے جا رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں کہ اُردو ہندوستان بھر کی واحد ادبی اور قومی زبان ہوگی۔

ان اداروں کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے خاص طور پر اس کی ترقی میں حصہ لیا ہے۔ ان میں دو قسم کے ادارے ہیں ایک سرکاری یعنی جنھیں سرکار کی سرپرستی حاصل ہے اور دوسرے غیر سرکاری جو محض اُردو کی خدمت کے لئے دامے، درمے، قدمے، سخنے قلمے، ہر طرح امداد کر رہے ہیں۔ ایسے ادارے کوئی فنی کتاب شائع کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ وہ اس کی لاگت کے متحمل نہیں ہو سکتے البتہ ان اداروں نے ادبی کتابوں کی اپنی ہمت سے زیادہ اشاعت کی اور کرتے جا رہے ہیں

سرکاری اداروں میں دارالترجمہ ہندوستان میں ایک واحد ادارہ ہے جو فنی کتابوں کے تراجم و تالیف کی اشاعت میں مصروف ہے۔

اس کی ایک دھندلی سی تصویر ہمیں اس کے قیام سے سو سال پیشتر ہی نظر آتی ہے حیدرآباد کے مشہور علم دوست نواب محمد فخر الدین خان بہادر شمس الامرائے ثانی نے اس اہم ضرورت کو محسوس کرکے مختلف علوم و فنون پر لائق مترجمین و مولفین سے پچاس سے زیادہ کتابیں لکھوائی تھیں غرض دارالترجمہ کی بدولت اس شکایت کا دفیہ ہوگیا کہ اُردو میں سوائے ادبی کتابوں کے اور کچھ نہیں چونکہ یہ نہایت اہم ادارہ ہے اس لئے اس کی تفصیل یہاں بے جا نہ ہوگی ادارہ میں ایک تو تنخواہ یاب مترجمین ہیں جن کا کام صرف یہ ہے کہ جو کتاب ترجمہ کے لئے مجلس نصاب متعلقہ میں پیش ہو کر منظور ہو جاتی ہے اس کا ترجمہ کر دیں۔ ترجمہ کی تیاری کے بعد اس کو ناظر ادبی اور ناظر مذہبی کی اجازت سے شائع کیا جاتا ہے تاکہ اس میں کوئی ادبی نقص باقی نہ رہے اور نہ کوئی ایسی تحریر ہو جس سے کسی مذہب کو ٹھیس لگتی ہو۔

دوسرے ایسی کتابیں جو دنیا میں اپنے اعلیٰ امتیاز کے باعث خصوصیت اختیار کرگئی ہیں ان کا بھی ترجمہ کیا جاتا ہے اور کثرت کار کے سبب سے ان کے ترجمہ کے لئے باہر کے قابل افراد کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور اس کا انھیں معقول بلکہ بہت زیادہ صلہ دیا جاتا ہے۔

دارالترجمہ کا قیام ۱۳۳۶ف میں عمل میں آیا اور ابتدائے امرداد ۱۳۴۴ف تک اس نے ۲۲۶ کتابیں ۲۶ علوم سے

متعلق شائع کیں۔ ۲، کتابیں زیر طبع اور ۸۰ زیر ترجمہ ہیں اور ۱۱۸ کتابوں کے ترجمہ کے لئے مجلس نصاب نے منظوری دے دی ہو

دوسرا ادارہ مجلس وضع اصطلاحات دار الترجمہ سے متعلق ہے اس کے اجلاس روزانہ منعقد ہوتے ہیں جس میں اُردو زبان کی موجودہ ضرورتوں کے لحاظ سے علمی اور فنی اصطلاحیں وضع کی جاتی ہیں۔ اور ان میں مترجمین کے علاوہ اُردو، فارسی اور عربی کے اساتذہ بھی رہتے ہیں جن کی معاونت مترجمین کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے مجلس کے قیام کے بعد سے امرداد ۱۳۴۴ف تک ۲۳،۰۰۰ اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں اور اب ان کی طباعت کا بھی انتظام کیا گیا ہے عنقریب طبع ہو کر شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں گی

غیر سرکاری اداروں میں انجمن ترقی اُردو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اس انجمن نے قدیم تذکروں اور دوسری کتابوں کی اشاعت میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اگر اس کی کتابوں کو اردو ادب کے خزانہ سے علیحدہ کیا جائے تو مجسمہ اُردو عریاں نظر آئے گا

دوسرا ادارہ جو نہایت سرعت کے ساتھ تصنیف و تالیف اور ان کی اشاعت میں مصروف ہے "سلسلہ ادبیات اُردو" ہے اس کا اہم مقصد یہ ہے کہ اُردو ادب کے خزانے میں موجودہ ضروریات کے مطابق کتابوں کا اضافہ کیا جائے اور ان نئے انشا پردازوں کی مدد کی جائے جو اس میدان میں گامزن ہونا چاہتے ہوں یا اپنی تصنیف و تالیف کی اشاعت سے قاصر ہوں۔ اس کی باگ ملک کے ایک ہونہار اور اس مادر علمی کے قابل سپوت ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کے ہاتھوں میں ہے اس کو وجود میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا لیکن اس نے اب تک کئی کتابیں شائع کیں جن میں مرقع سخن، ورڈ سورتھ اور اس کی شاعری اور ٹیگور، اُس کی شاعری خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

ادبی رسالوں میں مجلہ کے بعد شہاب صرف ایک ایسا رسالہ ہے جو وقت کی پابندی کے علاوہ اپنا ادبی معیار قائم رکھے ہوئے ہے ایک نیا ماہوار رسالہ "داستان گو" صرف افسانوں کو پیش کرنے کے لئے جاری کیا گیا تھا لیکن اب اس نے اپنی شکل بدل دی ہے۔ اس کے معاونین اپنے مقصد کو دوسرے طریقہ پر ظاہر کر رہے ہیں یعنی اب داستان گو بالالتزام نہیں نکلے گا بلکہ جب کبھی ۱۰۰ صفحے کی ضخامت کے افسانے جمع ہو جائیں گے ایک کتاب شائع کر دی جائے گی۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی "راز" شائع ہو چکی ہے۔ یہ غالباً اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے جو ایسے اعلیٰ مقصد کی تکمیل میں سرگرم رہے۔

قدیم کارنامے:۔ جامعہ عثمانیہ کے قایم ہوتے ہی قدیم ادب کی چھان بین شروع ہو گئی اور محققین نے کئی کتب خانے چھان ڈالے اُردو شاعری کا باوا آدم دکنی اور شاہجہاں آباد کا دربار گہوارہ اُردو غلط ثابت ہو گئے۔ اُردو کی قدامت اور ادبیت آشکارا ہو گئی

اس کا سہرا عام طور پر دکن اور بالخصوص فرزندان جامعہ عثمانیہ کے سر ہے۔ اس کے علم بردار اردو میں حسب ذیل اشخاص کے نام زرین حروف میں لکھے جائیں گے۔

مولوی عبدالحق صاحب　　ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور　　نصیر الدین صاحب ہاشمی

اور سید محمد صاحب۔ انھیں کی کتابیں تھیں جنھوں نے اردو کی قدامت کا ثبوت دیا اور اس کے قدیم شاہکاروں کو جو اب تک قعر گمنامی میں پڑے تھے منظر عام پر جلوہ گر کیا۔ اب تک بھی ان جواہر پاروں کی تفتیش و تحقیق جاری ہے۔

اصول تنقید کے متعلق مستند کتاب ایک بھی نظر نہ آتی تھی لیکن اس کمی کو بھی ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے "روح تنقید" اور "تنقیدی مقالات" کی اشاعت سے پورا کر دیا اور یہ کتابیں جو مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کر چکی ہیں اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنا بہت کافی ہے کہ یہ ہندوستانی جامعات کے نصابوں میں شامل ہیں۔

افسانوں پر جو کام حیدر آباد میں ہوا ہندوستان اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے "دنیائے افسانہ" اور افسانے سے متعلق دوسری کتابیں لکھ کر اردو میں افسانوں کو جو اہمیت دی اور ان کے صحیح اصول سے واقف کرایا وہ اردو کی حیات تک باقی رہیں گی۔ افسانوں کے نہ صرف اصول تبلا دیئے گئے بلکہ ان اصولوں کی روشنی میں دنیا کی مشہور زبانوں کے افسانے اردو میں منتقل کئے گئے اور "شاہکار افسانے" کی صورت میں وہ اردو دنیا میں جلوہ گر ہوئے۔

جامعہ میں جب سے تحقیقات کا کام آغاز ہوا اس کو اردو کی تاریخ کا ایک جداگانہ باب تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس میں جو تحقیقاتی مقالے لکھے گئے وہ نہ صرف اس اعتبار سے اہم ہیں کہ اردو میں بیش بہا اضافہ ہیں بلکہ ایک اور اہم اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ جن کو مجلس وضع اصطلاحات نے وضع کیا ہے اس بے تکلفی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں کہ مروجہ الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔

تحقیقی ادب سے بعض اصحاب نے خاص دلچسپی لی ہے اور ایک مقررہ موضوع پر تحقیق کرتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر تاریخ کا نام پیش پیش رہے گا جنھوں نے تاریخ دکن کی تحقیق کا بیڑا اٹھایا ہے آپ کے بعض مقالے مختلف جلسوں میں پڑھے جا چکے ہیں اور تعلیم یافتہ طبقہ ان کی اہمیت اور عظمت کا قائل ہو چکا ہے۔

ڈرامہ نگاری:۔ یوں تو حیدر آباد میں اس سے پہلے بھی ڈرامے لکھے گئے جن میں منشی محمد امیر حمزہ صاحب کا نام حیدر آباد کے ڈرامہ کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا لیکن جدید معاشرت کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کے ڈرامے لکھنے اور ان کو منظر عام پر لانے میں جامعہ عثمانیہ کے

سپوتوں نے جو حصہ لیا ہے اس کی نظیر ہندوستان کی کوئی اور جامعہ پیش نہیں کر سکتی۔ انجمن اتحاد کلیہ جامعہ عثمانیہ ہی وہ سب سے پہلی انجمن ہے جس نے ہندوستانی اسٹیج کو جو عرصہ تک قعر ذلت میں پڑی رہی بام ترقی پر پہنچا دیا اس کا سب سے پہلا ڈرامہ "کالج کے دن" ڈرامہ کی تاریخ کا پہلا باب کہلایا جاسکتا ہے۔ یہ ایک جشن یوم جامعہ کے سلسلہ میں پیش کیا گیا تھا اور توقع سے زیادہ کامیاب ہوا۔ دوسرے سال ہماری اس قابل قدر انجمن نے مشہور المانوی ادیب گوئٹے کا ترجمہ "فاؤسٹ" پیش کیا اور پھر "ہوش کے ناخن" دکھایا گیا غرض اس فن کی جانب اس سرعت کے ساتھ قدم بڑھائے گئے کہ اس تین چار سال کے عرصہ میں کئی انجمنیں قایم ہوگئیں۔ اور انھوں نے ایسے اعلیٰ معیار کے ڈرامے پیش کئے کہ اس کا جواب باہر کی ناٹک یا ڈرامہ کی کوئی کمپنی نہیں دے گی۔ ان میں بزم تمثیل اور انجمن ترقی ڈرامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر نے مستقبل، زندگی، اور زمانہ اور دوسرے نے نئی روشنی، غلط در غلط، ظاہر باطن، حشرات الارض وغیرہ دکھائے۔ انجمن طیلسانین بھی اپنی سالانہ کانفرنس میں ایک ڈرامہ پیش کرنے کا اہتمام کرتی ہے۔

حیدرآباد ڈرامیٹک اسوسی ایشن کے ڈرامے صید زبون اور پردہ غفلت بھی منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

فن ڈرامہ نگاری پر سید بادشاہ حسین صاحب نے ایک کتاب لکھی جو اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

شاعری: حیدرآباد کی فضا شعر و سخن کے لئے ہمیشہ روح پرور رہی اور ایسے ایسے شاعر پیدا کئے جن کے نام اردو دنیا میں اس کی بقا تک رہیں گے زمانہ حال میں بھی جب کہ حیدرآباد کے نوجوان علم و فضل اور فنون کی تحصیل اور تحقیق میں مشغول ہیں متعدد ایسے صاحب ذوق بھی پیدا ہوتے جارہے ہیں جنھیں شاعری سے فطری لگاؤ ہے اور یقین ہے کہ اگر یہی رفتار ترقی جاری رہی تو یہ اردو شاعری کی کائنات میں اپنے لئے ایک مستقل اور اہم جگہ پیدا کرلیں گے۔ یہ امر خوش آیند ہے کہ حیدرآباد کے مختلف شعرا غزل گوئی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پایہ کی نظمیں لکھ رہے ہیں اور یہ نظمیں صرف دقیانوسی خیالات اور معتقدات کی حامل نہیں ہیں بلکہ زمانہ کی موجودہ رفتار اور ملک کی نت نئی ضروریات کے مطابق لکھی جارہی ہیں یہ وہ خصوصیت ہے جو ایک شاندار مستقبل کی پیشینگوئی کرتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کا مستقبل بنانے اور ایک اٹھتی ہوئی قوم کی صحت مند نشو و نما میں ان نوخیز شاعروں کا ولولہ انگیز کلام خاطر خواہ حصہ لینے والا ہے۔ ہمارے شاعروں کی نظمیں جو عام طور پر ہندوستان کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتی ہیں اس قدر مقبولیت حاصل کررہی ہیں کہ نہ صرف حیدرآباد کے لاسلکی نشرگاہ سے ان کو آئے دن نشر کیا جاتا بلکہ دہلی کی نشرگاہ کے ارباب حل و عقد نے بھی اپنے یہاں سے نشر کرنے کے لئے ان کو طلب کیا ہے۔

ہماری شاعری میں گذشتہ ربع صدی سے ہندی عنصر بھی بڑھتا رہا ہے لیکن وہ ہندی نہیں جو آج کل ایک خاص طبقہ میں بولی اور لکھی جارہی ہے۔

اس کے محرک غلام طیب صاحب اور عظمت اللہ خاں مرحوم ہیں جنھوں نے ہندی طرز کی نظموں کی ابتدا کی عظمت اللہ خاں مرحوم کی یہ نظمیں:-

(۱) مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا

(۲) مرے حسن کے لئے کیوں مرے تھیں لینے تھے نہیں یوں مرے

اور (۳) پیل

وغیرہ نے ہمارے موجودہ نوجوان شعرا پر بھی اثر ڈالا اور ساز ،میکش، مخدوم اور ظہیر صاحبان کی نظمیں اس سے متاثر نظر آتی ہیں۔

ہم جب ان نوجوان شعرا کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک کیف طاری ہوتا ہے اور بعض نظمیں تو اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ حیدرآباد کے معاشرہ میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا ہے اور ہماری سماج کروٹ بدل رہی ہے۔

اکبرالدین صدیقی متعلم سال چہارم

زبان کا کوئی وطن نہیں اسکا کوئی مذہب نہیں، اس کی کوئی ذات نہیں جو کوئی اسے بولتا پڑھتا اور سلیقے سے استعمال کرتا ہے اسی کی زبان ہے، خواہ وہ کوئی ہو اور کہیں کا ہو۔

(عبدالحق)

ہمارا آقا

خسروِ فقر آشنا، تاجورِ پاکباز صاحبِ ایماں کا دل، سینۂ مومن کا راز

صاحبِ تاجِ نگیں، حاملِ صدق و یقیں حامیِ دینِ مبیں، سالکِ راہِ حجاز

شاعرِ رنگیں سخن، صاحبِ صد علم و فن جہل کا ارماں شکن، علم کا آئینہ ساز

رہبرِ عصرِ رواں، مالکِ صد کارواں جس کی صدا دلکشا، جس کی نظر دلنواز

پھونک دی اس عہد میں جس نے حقیقت کی رُوح توڑ دیا جس نے آج رنگِ طلسمِ مجاز

جس کی نظر روز و شب راہبرِ زندگی شام و سحر جس کا دل ذوقِ عطا سے گداز

شوکتِ ناپائدار جس کی نظر میں نہیں عشرتِ بے کار سے جس کا ہے دل بے نیاز

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو جلوۂ تمکینِ ناز، مظہرِ شانِ نیاز

مالکِ طبل و علم، والیِ خیل و حشم صاحبِ جُود و کرم شاہِ زمانہ نواز

گو ہے ترے فرق پر تاجِ زرِ خسروی فقر ہے تیرا وضو، درد ہے تیری نماز

حاملِ "خُلقِ عظیم"، سادہ لباس و کریم مسندِ الطاف پر ناز سے جلوہ طراز

علم کے پیاسوں کی ہے، شام و سحر یہ دُعا تجھ کو ملے دہر میں خضر کی عمرِ دراز

جشن یہ سیمیں ترا تجھ کو مُبارک رہے
رحمتِ یزداں سے تو، اور بھی ہو سرفراز!

حبیبہ تقیہ منیر خان تابی
ایم۔اے (عثمانیہ)

ظلّ اللہ

بلندی کی طرف اُٹھتی ہوئی جب چشمِ پستی تھی   دکن کی سرزمیں سیراب ہونے کو ترستی تھی

شعاعیں علم کی بے تاب تھیں جب پھیل جانے کو   دکن کے قلب میں ذوقِ عمل بن کر سمانے کو

نئے پیرِ مغاں کو ڈھونڈتے تھے میکدے والے   کہ پی کر بادۂ علم و عمل بن جائیں متوالے

اُبلنا چاہتے تھے نورِ سلطانی کے فوارے   چمکنا چاہتے تھے آسمانِ علم پر تارے

اندھیرا رات کا اک صبحِ صادق کی نشانی تھا   دکن والوں کی خاموشی میں بھی جوشِ جوانی تھا

سکونِ خواب میں ایک جوش تھا کروٹ بدلنے کا   سلیقہ آگیا تھا گرنے والوں کو سنبھلنے کا

تھی کوئی مُردنی سی جینے والوں میں مگر دم تھا　　تھا کوئی خواب لیکن نیم بیداری کا عالم تھا

ہراک گُل تھا بہشتی رنگ کا جوڑا پہننے کو　　گلستانِ دکن بے چین تھا فردوس بننے کو

خموشی میں لئے اک محشرِ خاموش رہتی تھی　　ہوا نغموں میں سننے کے لئے بے چین رہتی تھی

دکن جب بھی رواداری کے سُندر گیت گاتا تھا　　جہاں میں آفتابِ ہند بن کر جگمگاتا تھا

مگر اہلِ دکن کو ایک طرزِ نو، دکھانا تھا　　اسی دُنیا میں رہ کر اک نئی دُنیا بسانا تھا

بہ اندازِ دگر اہلِ دکن میں عید ہونی تھی　　دکن کے طالعِ بیدار کی تجدید ہونی تھی

رُکا تھا دستِ جُود و فیض داماں طلب بھر کر　　نئے انداز کی تھیں خواہشیں لب ہائے سائل پہ

برس کر تھم گیا تھا مینھ کہ پھر ابرِ بہار آیا　　دکن کی سرزمیں پر رحمتوں کا جُوبار آیا

سراپا خادمِ مخلوق، اک مخدوم کو دیکھا　　نگاہِ دل نے ظلِ اللہ کے مفہوم کو دیکھا

دُعائیں اک تقدس سے لبِ خاموش پر آئیں　　اُٹھیں گہوارہ دل سے، اثر کے دوش پر آئیں

کہ یارب شاہ عثمان ظلہ ایک مدت تک رہیں زندہ

یہی خواہانِ دولت کا ہے ان سے بخت تابندہ

(صاحبزادہ) میر محمد علیخان میکش (عثمانیہ)

ارضی جنّتیں

دکن کے چند دلفریب مقامات

ساحل مرینہ (مدراس)

مرینہ کا ریتیلا ساحل، مدراس کا مایۂ ناز تفرج گاہ ہے، جس کے کناروں پر اونچی، اونچی موجیں ایک ہنگامۂ تلاطم کے ساتھ ٹکرا کر فضائے بسیط کو اپنی ترنم ریزیوں میں غرق کرلیتی ہیں۔ نگاہوں کے سامنے آب وار لہروں کا ہیبت ناک، غیر منقطع سلسلہ، اپنے آغوش میں دنیائے نظارہ لئے اٹھکھیلیاں کرتا ہے۔

اس سحر آفریں مقام کو صبح میں دیکھا نسیم سحری اتراتی پھر رہی تھی حسن صبیح کی جلوہ گری تھی۔ نور کا سیلاب تھا۔ سمندر کے کنارے نیلگوں آسمان کے کنارے پیوست ہو کر رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہے تھے اور ہم ایک روح پرور کنج میں بیٹھے اپنی بے تاب روح کے لئے لذائذ سرود کا سامان مہیا کر رہے تھے۔ شفق آلود، افق کے آبی پردے سے، ایک دلفریب شان کے ساتھ، ایک جہاں سوز حسن نمائی کے ساتھ، ایک ناز آفریں نقاب کشائی کے ساتھ آفتاب عالم تاب نے اپنا چہرہ دکھایا۔ لیکن اس میں ابھی شان نخوت نہیں تھی۔ اس کا حسن ابھی خیرہ کن نہ تھا۔ اس کا جمال ابھی جلالی شان کا آئینہ دار نہیں تھا۔ جیسے جیسے دن

بڑھتا گیا، غرورِ حسن کا نشہ بھی چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ آنکھ اُٹھا کر دیکھنا مشکل ہوگیا۔ وہ اپنی دلربائیوں کے ساتھ، رعنائیوں کے ساتھ آتشیں جادہ ریزیوں کے ساتھ چمکتا رہا۔ اور ہم نے سمندر کے سکونِ مطلق پر، ماحول کے سناٹے پر، متین و سنجیدہ شعاعوں پر ایک حسرت آمیز نظر ڈالی اور چلے گئے۔

سرِ شام اس وسیع ساحل کی باریک ریت پر ہزاروں نظارہ پرست انسانوں کا سیلاب نظر آیا، مختلف شکل و صورت، مختلف وضع و لباس، مختلف قوم و ملت کے لوگوں کا مجمع تھا۔ مرینہ روڈ پر موٹر کاریں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ سواریوں میں اور پیدل آدمیوں کی آمد کا تانتا بندھا تھا۔

وسط میں نشرِ صوتی آلہ اپنی نغمہ سازیوں اور سامعہ نوازیوں سے موسیقی کے جادو جگا رہا تھا۔ ہم ساحل کی مسلسل جھومنے والی موجوں کے قریب پہنچے اور کھڑے ہوگئے۔ امواج ایک اندازِ دلربائی کے ساتھ آکر ہمارے قدم چوم رہی تھیں اور ایک شانِ استغنار کے ساتھ لوٹ جا رہی تھیں تھوڑی دیر تک ان سے مسرت اندوز ہوتے رہے اور پھر ذرا دُور ساحل پر کھڑے ہوگئے تیز ہوا نے گیلے کپڑے خشک کر دیئے۔

شام کی تاریکیاں بڑھنے لگیں۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا مگر ہماری شوق وارفتگی سے سرشار آنکھیں سمندری مناظر پر گڑی رہیں۔ سامنے پردۂ تلاطم تھا جس میں سے انقلابِ طوفان کی جھلکیاں نظر آرہی تھیں۔ جہاں تک آنکھیں کام کرتی تھیں نگاہیں دوڑائیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ نورانی اژدھے تاریک سایہ میں لہراتے ہوئے ہماری طرف آتے ہیں۔ وہ مستانہ وار آتے ہیں لیکن جب ساحل کے کناروں سے متصادم ہوتے ہیں تو پاش پاش ہوجاتے ہیں۔ نگاہیں بھی ان کے ساتھ آتی ہیں۔ اور ان نورانی مجسموں کو ظلمت کی گھٹاؤں میں غرق ہوتے دیکھ کر پھر آگے بڑھتی ہیں تو وہی منور لہروں کے سلسلے۔

ہم اسی طرح فطرت کی وسعت میں محو تھے کہ چاند کی ہلکی ہلکی شعاعیں اُفق سے نمودار ہوئیں۔ پھر تخیل کی دنیا میں ایک سبک جنبش ہوئی، ایک نازک لرزش۔ سمندر کا مدوجزر فزوں ہوتا گیا۔

آہ ۔ وہ سمع شکن شور کے ترنم آفریں نغمے
وہ موجوں کا اُٹھ اٹھ کر چاند سے اٹھکیلیاں کرنا
وہ منظر کا نور ——— وہ نور کا منظر

نندی ہل (بنگلور)

صبح کے کوئی ساڑھے چار بجے، جب کہ عالم پر ایک پُر کیف سرشاریت کا غلبہ رہتا ہے۔ ہم نندی ہل کی جانب روانہ ہوئے۔ ہر قدم پر دل کش مناظر اور روح افزا کیفیتیں، ہمارا خیر مقدم کر رہی تھیں، ہر معمولی چیز میں ہمیں مسرت و شادمانی کی جھلکیں نظر آ رہی تھیں۔ اندھیرا ہمارے سامنے چھٹتا گیا۔ نور ہمارے سامنے پھیلتا گیا۔ شفق ہمارے سامنے پھولی۔ مہر عالم تاب ہمارے سامنے طلوع ہوا۔ الحاصل آٹھ بجے منزل مقصود پر پہونچے۔

اوپر نظر ڈالی۔ جرأت آزما چڑھائی تھی ہمت کرلی اور بغیر کسی مدد کے پا پیادہ جانے پر تیار ہوگئے۔ رگوں میں دوڑنے والے نوجوان خون نے مجبور کیا کہ اس مہم کو ذرا اور دلچسپ بنایا جائے۔ لہذا سب سے پہلے انتہائی چڑھائی پر جانے والے کو انعام دینا قرار پایا۔

سطح زمین سے ڈھائی میل بلند دنیا پر ہر طرف پہاڑیاں اور جنگل نظر آئے۔ البتہ ان میں، مسافر بنگلہ، دواخانہ، پولس اسٹیشن، اور تین رہائشی مکانات، دیول اور ٹیپو کی تاریخی عمارتیں، انسانی بستیوں کے مظہر ہیں۔

انواع و اقسام کے درخت اور گل ہائے رنگارنگ، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس تفریح میں ہماری چھ شخصی جماعت نے پھول جمع کرنے کا دلچسپ مشغلہ اختیار کیا۔ ہم نے (۸۵) قسم کے تازہ بہ تازہ، نو بہ نو پھول جمع کئے۔

مولسری کے درختوں کے عطر بار سایہ میں بیٹھ کر شراب نکہت بار سے مخمور ہوئے۔ فلک بوس درختوں کے تلے فرش خاکی پر دراز ہوگئے۔ دیواریں پھاندیں۔ بھاگ دوڑ کی۔ بیت بازی کا مقابلہ کیا۔ غرض اس "یوم مسرت" کو "محبوب مشاغل" میں گذار کر سر مغرب ابر کی چھاؤں میں نیچے اترے۔

اس جنت مقام کا چپہ چپہ حسن آباد ہے۔ چڑیوں کی شیریں لحنی، پھولوں کی نکہت آفرینی، موسم کی خوشگواری جذبات جو مضمحل تھے، موسیقی کی جاذبیت سے ہیجان میں آگئے۔ تسلی آمیز احساسات کے سرچشمے کی بند سوتیں ابل پڑیں۔ دنیا کے تصنع سے بیزار آنکھیں کشش فطرت کے باعث، ہر تن پیکر بن کر رقص کرنے لگیں۔

تمدن کی ساری ہنگامہ خیزیاں، اس تصنع نا آشنا سادگی پر قربان!

جی چاہتا ہے کہ یہی نشۂ وارفتگی رگ رگ میں سرایت کر جائے۔ جو اس چھوٹی سے دنیا کے ذرہ ذرہ سے ہویدا ہے۔

آبشارِ کاویری (میسور)

میسور کے اس باصرہ افروز اور نظر فریب مقام پر جب ہم پہونچے ہیں۔ اس وقت نیلگوں آسمان پر اودی اودی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ شام کی زرد اور اذیت ناآشنا، شرمیلی دھوپ، چھاؤں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی کبھی ابر کی چادروں میں روپوش ہوجاتی۔ ابابیل قبل از وقت، آشیانوں سے نکل کر نور آمیز دھندلی فضا میں توازنِ پرواز کے ساتھ، فلک پیمائیاں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی زاغ دشتی کی ٹولیاں، زناٹے سے سائیں سائیں کرتی ہوئی۔ گذر جارہی تھیں، دُور، نگاہوں سے مستور آموں سے چھائے ہوئے بن سے کوئل کی کوکو نوازیاں، فردوس گوش بن رہی تھیں حسنِ موسم کی یہ ننھی مطلوب معنوی اپنے کنج خلوت سے اعترافِ شوق کے نغمے الاپ رہی تھی۔ لہریاں لیتی ہوئی ہوا میں اس کی والہانہ جذبات سے معمور شیریں آواز، نقشِ ترنم مرتسم کر رہی تھی۔

ابر کے ٹکڑوں نے اپنی خانہ بدوش آوارگیوں سے بیزار ہو کر آخر پڑاؤ، ڈال ہی دیا۔ قوس قزح اپنی رنگا رنگیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوگئی۔ ہم نے ناہموار پگڈنڈی پر سے نیچے کا رُخ کیا۔ بے تاب نظریں، پرشوق وارفتگی کے ساتھ، آسودہ آنکھوں سے نکلیں اور محوِ نظارہ ہوگئیں۔

پہاڑوں کا زمردین سلسلہ حدِ نظر بن گیا۔ ان کا نشیب و فراز تارِ نظر کو اپنی ناہمواریوں سے ہچکولے دینے لگا۔ کہیں اُن کی سربلند نکیلی چوٹیاں، کہیں اُن کے تنگ آغوش درختوں کا سکوت بے قرار ترنم پاش تھا۔ پودوں کا سکونِ اضطرار، نغمہ بدوش، خوابیدہ سبزے کی لہلہاہٹ، سازِ بے آواز۔ خاموشی میں بہار کی شیریں راگنیاں۔ غرض حسن خاموش تھا اور نغمہ بے تاب۔

آبشار کی شور آفریں روانی، اس کے تموج کا ترنم اور اس کے ترنم کا تموج۔ فضا میں آبشارِ نغمہ کا سماں نظر آنے لگا۔ اُفقِ بعید سے شفق کے پیمانے، ارغوانی شراب چھلکانے لگے۔ آئینہ تمثال سطحِ آب پر اس کی آتش رنگیاں، آتشیں پلکوں کا دھوکا دینے لگیں۔

ہم پہاڑ کے ناہموار، راستوں سے نیچے کی طرف اُترتے ہی گئے اور انجام کار، اس چٹان کے قریب پہونچ گئے۔ جہاں پانی کسی حرماں نصیب کی طرح اپنا سر پھوڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے پانی گر رہا تھا اور دونوں کا پُرطاقت بہاؤ، ہم آہنگ ارتعاش کے ساتھ مس کرکے ایک ہی جانب بہہ جارہا تھا۔

سنگین فرش پر، ہم حسن کی لامحدود وسعتوں اور فطرت کی وسیع حسن نمائیوں سے حظ اُٹھاتے رہے۔ دفعتاً کسی نے کہا،

"وہ دیکھو"، سب کی نگاہیں، بہ یک وقت اٹھیں۔ آبشار سے کچھ دور کوہستانی سلسلے کے ایک غیر مسطح گوشے میں ایک سفید چبوترہ نظر آیا۔ اور اس پر کسی کا مزار۔ گرد و پیش کی اشیا نے زبان بے زبانی سے کہا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

منظر کی اس درخشانی میں، حسن کی اس ہم آہنگی میں، فطرت کی ان غیر مکلف مخلوں میں، ماحول کی ان نازک و لطیف دلفریبیوں میں آزاد اور سچی موسیقی کی ان روح نوازیوں میں جانے کون محو خواب ابدی ہے ؟ اُف دنیا سے کنارہ کش ہونے کے بعد بھی یہ خلوت زائیاں۔ یہ تنہائی پسندیاں۔ دنیوی علایق سے یہ بیزاریاں !!

آسمان سے ننھی ننھی بوندیاں گر کر موتیوں کی طرح بکھرنے لگیں۔ تھوڑی دیر تک بھیگتے رہے جب مینھ کی تیزی بڑھتی گئی تو بچاؤ کا خیال ہوا۔ نیچے سے اوپر آنا، جب کہ بارش نے پتھروں کو چکنا دیا تھا، ایک جرأت آزما کام تھا۔ بچتے بچاتے سہارا لیتے اور سہارا دیتے، اوپر چڑھ گئے۔ جہاں ٹین کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا سائبان تھا۔ اس سائبان میں کھڑے ہو گئے۔ بارش سے محفوظ بھی رہے اور منظر سے لطف اندوز بھی ہوئے تھوڑی دیر کے بعد پانی ختم ہو گیا۔ گرد و غبار صاف ہو گیا۔ حسن فطرت کی منظر آفرینی میں گویا چار چاند لگ گئے۔

رات کی تاریکیاں، اپنا بھیانک چہرہ دکھانے کو تھیں اس لئے بادل نخواستہ، منظر کی دلچسپیوں سے، فطرت کی جلوہ سامانیوں سے روح پرور موسیقی کی لذتوں سے دیدۂ دل نے نگاہیں ہٹائیں اور ہم بس میں سوار ہو کر اپنی جائے رہائش کو روانہ ہوئے

کرشنا ساگر (میسور)

طے پایا کہ کرشنا ساگر کی سیر کے لئے "شاہ پسندوں" کی خدمات حاصل کی جائیں۔ چنانچہ روانہ ہوئے بس اور شاہ پسند میں جو فرق ہے، ظاہر ہے۔ وہ تیز رفتار، یہ سست رفتار۔ اس کے چلانے والے خاموش اور کم سخن۔ اس کے چلانے والے [illegible] اور لفاظ۔

خاموش اور صاف سڑکوں پر سے ہمارے شاہ پسند ٹانگے گزر رہے تھے اور ٹانگے چلانے والے گفتگو کے سلسلے کو کسی طرح منقطع کرنے کے روادار نہیں۔ ہر عنوان پر گل افشانیاں ہو رہی تھیں۔ ساگر کے نام سے ہمارے تخیل کی دنیا میں "عثمان ساگر" کے حدود کے

نقوش اپنا عکس ڈال رہے تھے۔ نگاہوں کے سامنے تالاب کی سیال خاموشی کا سیلاب موجزن ہوگیا۔ دُور تک پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔ تخیل کی فراوانیوں اور گنتگر کے لامتناہی سلسلوں کے لئے کرشنا ایک روک ثابت ہوا۔ شاہ پسند ایک جنبش آمیز تڑپ کے ساتھ رُکے اور ہم اشتیاق آفریں انداز میں اتر پڑے۔ صدر دروازہ پر ٹکٹ خریدا اور اندر داخل ہوئے۔ اس حد تک ہمارا تخیل، ہمیں بالکل صداقت کے آغوش میں تفریح سے لطف اندوز کر رہا تھا۔ "کٹے"، کی سڑک، "تالاب کی لہروں کا خاموش اضطراب دور تک پانی کی چادروں کی لہریں۔ لیکن ہم اس منظر کو چھوڑ کر "مد کٹے"، کے دوسرے کنارے پر پہونچے اور نیچے کی طرف اس کے زینے طے کرنے لگے۔

آنکھوں نے کیا دیکھا؟

حُسن کی دُنیا!

پلکوں کے گہوارۂ جنبش میں ارتعاشِ نگاہ جھومنے لگا۔

سبزہ کے زمردیں میدانوں میں چھوٹی چھوٹی سڑکیں بہار دے رہی تھیں۔ اس ارضی فردوس کے نشیب وار تختے دل فریب تھے۔ ایک میدان اس پر چھوٹا سا چمن مختلف اشکال و اوضاع کے حوض اور حوضوں میں گل ہائے آبی نچھاور کرنے والے فوارے پھر اس سے نشیب میں دوسرا میدان۔ ان دونوں میدانوں کو ملانے والی سیڑھیوں کے وسط میں ایک سنگین آبشار سے پانی کی متوالی روانی۔ دوسرے میدان میں بھی وہی جنت نمائیاں اور اسی طرح دوسرے میدان۔

ان میدانوں کو طے کرکے ہم ایک مقام پر پہونچے، جہاں قدرت اور صنعت کا امتیازی فرق نمایاں نظر آتا ہے، پانی بڑی سرعت اور پُر شور تلاطم کے ساتھ بہ رہا تھا۔ امواج کا تصادم عجیب موسیقی آمیز ہنگامے برپا کر رہا تھا۔

فواروں کی سرور آگیں پھواریں اور پانی کے اس طوفان خیز بہاؤ کو دیکھتے ہوئے ہم کھڑے رہے۔ مغرب ہوگئی۔ آفتاب غروب ہوگیا۔ برقی قمقمے جگمگانے لگے۔ ان مناظر کو اوپر سے دیکھنے کے لئے ہم "کٹے"، پر چلے گئے۔ ایک طرف پانی کے ناپیدا کنار وسعت اور دوسری طرف حوضوں کی دلفریبیاں، چمن کی خوشنمائیاں، فواروں کی گوہر بیزیاں۔

اس والہانہ جذبہ کے رقص پیہم میں کون ہے؟ جو اپنے آپ کو نہیں کھو دیتا۔ مظاہر قدرت کے اس محبوب و حسین منظر کی آفرینی میں کس کی آنکھیں محو نہیں ہو جاتیں؟ موسیقی کی زہرہ گداز اداؤں میں کس کے کان واجد نغمہ نہیں ہو جاتے؟ یہی ارضی جنتیں ہیں جہاں انسان سرُور سے سکر اور سکر سے سرشاریت کی انتہا تک پہونچ جاتا ہے۔

چومندی ہل (میسور)

رات کے گیارہ بجے، جی چاہا کہ چومندی ہل کی تفریح سے دن بھر کی تھکاوٹ دور کی جائے۔ موٹر ٹیکسیاں لیں اور چلے پہاڑیوں، غاروں اور درختوں کے درمیان سڑکیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سڑکیں پیچ وخم کھاتی ہوئی اوپر چلی گئی تھیں۔ مگر اس موڑ توڑ والے خطرناک راستے پر، رات کی تاریکیوں میں موٹرراں عجیب اطمینان، دلجمعی اور استقلال سے زود رفتاری کے ساتھ گاڑیاں چلارہے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شاید مشق متواتر نے ان کا خوف زائل کردیا ہے۔

رات کی اُمنڈ پڑنے والی تاریکیوں میں ہم راستہ طے کرنے لگے جیسے جیسے بلندی کی طرف بڑھتے گئے۔ سرد ہوا کی اذیت رسانی بھی اپنی قوت بڑھاتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سطح جسم پر ہوا کی چنگاریاں چرکے لگا رہی ہیں۔

ایک مقام پر ہماری موٹر کاریں رُکیں اور ہم دیکھنے لگے۔ ایک طرف تیرہ وتار فضا میں رات اپنا سیاہ اور ڈراونا چہرہ دکھا رہی تھی اور دوسری طرف، میسور اپنے منور منظر کی دوشیزگی کا اظہار کررہا تھا۔ سطح زمین پر نورانی گل کاریاں اپنی سادگی میں ڈوبی ہوئی طلعت ریزیوں اور بے ترتیب دستوں سے سیمابی شباب کا نمایش کررہی تھیں کہیں کہیں روشنی کا ایک خط مستقیم دور تک چلا گیا ہے، کہیں روشنی کا دائرہ ضوافگن ہے۔ کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ، ان کے درمیان، قصر مہاراجہ کے سُرخ قمقموں کی لال روشنی بڑی بھلی لگتی ہے۔

غفلت وخواب کی کروٹوں میں بسر کرنے والوں کو نیند کے ماتے تھپک تھپک کر سُلاتے رہے لیکن ہماری بیداریوں نے ہمیں حسن فطرت کے عمیق مطالعہ سے دلکشی کی گہرائیوں میں غرق کردیا دور تک سُنہری برقی قمقمے بہار دے رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر کو کسی نے آگ لگادی ہے۔ آسمان پر جگمگاتے تارے اور زمین پر درخشاں قمقمے۔ ان دونوں کی درمیانی فضا میں ہم ایستادہ تماشا بینی اور منظر پرستی میں مستغرق۔ خاموشی کی ان محفل طرازیوں میں میسور ایک پیکر ضیا تھا ایک مجسمہ نور۔

ہماری موٹریں پھر بلندی کی طرف روانہ ہوئیں اور اس بلند وحسین دیول کے قریب جاکر رکیں جو چومندی ہل کی انتہائی بلندی پر وقوع پذیر ہے۔ دیول تعمیر کاری کی جان ہے اور حسن کاری کی روح۔ ماحول نے اس کو اور بھی خوش منظر بنادیا ہے۔ روشنی کی ہرجہتی ضیا پاشیوں نے تو سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ دیول گویا روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔

سردی اس بلا کی تھی کہ جسم بید لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ زیادہ ٹھہرنا تکلیف دہ در تمنائے دیدہ بے تاب اسی اضطراب انگیز کشمکش میں واپسی پر مجبور ہوئے۔ جاتے جاتے پھر جائزہ حسن کی آخری ساعت میں

اپنے دقیقہائے شوق کو تحلیل کر دیا۔

باب الہند (کلمبی)

کاروباری دنیا کی ہنگامہ آرائیوں سے نکل کر جب ہم اس مقام پر پہونچے تو سکون نا آشنائی نے یہاں بھی ہمارا ساتھ دیا۔ ہر طرف شور و شغب تھا۔ روحانی لذائذ کی وسعتیں مادی معصیتوں کی حدوں سے ٹکرا کر ارتعاش خیال کا باعث بن رہی تھیں ایک طرف سمندر کی لامحدود وسعت تھی اور دوسری حسن انسانی کا رنگین سیلاب۔

کتنا جمیل وقت تھا؟ جب کہ دو شامیں مل رہی تھیں افسردگی آمیز سُرور کی سی کیفیت، فضا میں پھیلی ہوئی۔ سمندر کا سکون مطلق، بے تاب تلاطم لیکن دلوں کی دھڑکنیں اضطراب بدوش!

حسن کی ان رنگا رنگیوں میں کون ہے جس کی نگاہ پُر شوق مخمور تماشا نہیں ہو جاتی؟ رنگین قہقہے، ہلکی مسکراہٹیں، نرم و نازک گفتگو، گداز رفتار، جھینپی ہوئی نگاہیں، بے باک ادائیں۔

کبھی تو ہم نے گنگنایا۔

تم نے کیوں انجمن ناز میں تیور بدلے
دل دھڑکنے کی صدا ہے کوئی فریاد نہیں

اور کبھی، گایا۔

شریر آنکھ، نگہ بے قرار، چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

لیکن شکستہ بربط کے ان ٹوٹے ہوئے نغموں نے کسی کو مائل کرم کیا نہ کسی کو شرمندہ سکوت۔ وہی محشر بپا ہوا کئے اور وہی قیامتیں اٹھا کیں۔

بمبئی کی تاجرانہ سرگرمیاں اس تفرج گاہ میں بھی ختم نہیں ہوتی رہ رہ کر آوازیں آرہی تھیں۔ یہ لیجئے اور وہ لیجئے بعض دلکش پیرایہ میں چیخ رہے تھے اور بعض وہی دقیانوسی انداز میں۔

ہم نے اسٹیمر کے ذریعہ سمندری تفریح کی۔ ہماری کشتی پانی کی نازک لہروں سے کھیلتی ہوئی لہرا رہی تھی۔ دوسری

تفریحی کشتیاں بھی ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد ہمیں جہاز ملے۔

کشتی میں بیٹھ کر جہاز کا نظارہ ———

اس بحری دنیا میں بھی وہی کہتری اور عظمت کے امتیازات ہیں۔ چھوٹی لہریں بہت نازک انداز میں مچلتی ہیں لیکن جب ایک بڑی موج شور انگیز انداز میں اٹھتی ہے تو ان چھوٹی لہروں کو فنا کر دیتی ہے۔ وہی درس فنا ہے۔ کئی حباب ابھرتے ہیں لیکن آنکھ جھپکنے تک فنا ہو جاتے ہیں۔ کئی حلقے بنتے ہیں لیکن بننے نہیں پاتے کہ مٹ جاتے ہیں۔

باب الہند اپنی آغوش میں انسانوں کی متحرک دنیا لئے ہوئے دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ لوگ ادھر، ادھر پھر رہے تھے۔ اس کی سیڑھیوں سے کئی کشتیاں نکل رہی تھیں اور کئی اس کی طرف واپس ہو رہی تھیں۔ ہر ایک کے لئے یہی ساحل تھا۔ تاج محل ہوٹل اپنے غرور تعیش کے ساتھ ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے حسن میں ایک نشۂ دولت تھا۔ ایک امیرانہ گھمنڈ۔

اتوار بمبئی میں اپنے ساتھ اسباب مسرت کا ایک سیلاب لاتا ہے۔ برقی قمقموں کی جگمگاہٹ ادھر گیسوئے شب پر موتیوں کی طرح چمکنے لگی۔ ادھر آراستہ اسٹیمر نے سمندر میں اپنا لنگر ڈالا۔ اسٹیمر کو بوقلموں رنگ کاریوں سے سجایا گیا تھا۔ اس میں دعوت قلب دگوش کا سامان بھی تھا۔ ادھر سازندوں نے سریلے نغموں سے لطافت پیدا کی، ادھر مہوشان فرنگ نے رقص شروع کیا۔ رقص نغمہ ہی کیا کم تھا کہ نغمۂ رقص برپا ہوا موسیقی پر حسین اداؤں کی رنگینیاں اور ہر ادائے رنگین پر موسیقی کی بارش، اسٹیمر ایک فردوس رقصاں کی طرح سمندر کی لہروں پر حسن بکھیرتا ہوا اور فضاؤں میں موسیقیاں پھیلاتا ہوا جا رہا تھا۔

وہ جب منظر میں اپنی رنگینیاں بکھیر کر لوٹا تو کنارے پر وہی حسن کی وسعتیں تھیں اور شوق کی پابندیاں۔

رات گئے حسن کی ان بے پایاں رنگینیوں سے جن کو روحانیت کے اجزا نے کیف سامان بنا دیا تھا۔ جب ہم لوٹ کر بازار پہنچے تو وہ دنیوی مکروہات، وہی سمع شکن چیخ پکار، وہی ہنگامہ خیز چہل پہل۔

وقت کبھی دنیا کو خارزار بنا دیتا ہے کبھی گلستاں۔

آسودگی کے چند لمحے غنیمت ہیں اگر قسمت یاوری کرے۔

———

مقبرہ رابعہ دورانی (اورنگ آباد)

رابعہ دورانی کا مقبرہ، فرخندہ بنیاد کے لئے باعث ناز ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوشیزہ

خمار حسن میں انگڑائیاں لے رہی ہے۔ شاید سطح ارض پر کوئی فردوسی محل ہے جو مرمریں پردوں میں فرشتوں کا تقدس لئے اپنے حسن کی بالیدگی کا اظہار کر رہا ہے۔ صبح کی روپہلی کرنیں جب اس کا بوسہ لیتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مست شباب اپنے گیلے بالوں کو شرمیلی دھوپ میں سکھا رہا ہے۔ اس کا نکھار منظر میں ایک کیف پھیلاتا ہے۔

نظارہ پرست اس کیف میں ڈوب کر اپنے آپ کو سرشاریت کی اس بلندی پر دیکھتا ہے جسے بیخودی کہتے ہیں دوپہر کے تمتماتے ہوئے آفتاب کی شعاعیں جب اس پر پڑتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی نازک عورت تپتے ہوئے چٹانوں پر ننگے پاؤں چل رہی ہے۔ چاندنی کی لطیف کرنیں جب اس کو ردائے زریں اوڑھاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی نئی نویلی دلہن اپنے رنگین گھونگٹ میں عروسانہ حجاب کے انتہائی جذبات لئے شرما رہی ہے۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیاں جب اس کو نہلاتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی شرم وحیا کی دیوی کسی کو دیکھتا پاکر بدن چرا رہی ہے۔

سرو کے درخت، صحن میں کھڑے خاموشی کے ساتھ اس کے جلوہ کی بہار لوٹ رہے ہیں۔ فوارے اچھل اچھل کر اس پر نثار ہو جانا چاہتے ہیں لیکن آئین ضبط انہیں قدم بڑھانے نہیں دیتے اور وہ تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ آسمان کا ہر تارا اور زمین کا ہر ذرہ اس سے اکتساب حسن کا آرزومند ہے۔

صحن مقبرہ گلستاں بدوش ہے۔ سرو کے آغوش میں مستطیل حوضوں کے رقصاں فوارے گوہر آب پھینکتے ہیں۔ ہریالی کی سبزی آنکھوں میں طراوت پیدا کرتی ہے پھولوں کی رنگین قبائیں منظر کی وسعتوں پر چھا جاتی ہیں۔

ایک طرف مسجد ہے۔ ان کیف افزا منظر آفرینیوں میں ذوق جبہ سائی، لذت بندگی کی سرشاری کا ایک لطیف جذبہ ہے ہم نے بدر کامل کی چاندنی رات، مقبرہ کی روح افزا فضا میں گذاری۔ یہ ایک یادگار رات ہے جس کے اثری نقوش ہمیشہ دیدہ و دل پر مرتسم رہیں گے۔ ماہتاب کا انتہائی نور، مقبرہ کی حسین عمارت، منظر کا سکوت آفریں انداز۔

بہت دیر تک چمن میں طویل حوض کے کنارے خاموشی کے ساتھ بیٹھے حسن مقبرہ کے نکھار کی پرستش کی۔ ہر طرف وجدانی کیفیت تھی۔ سناٹا تھا اور اس سناٹے میں ایک خاموش موسیقی تھی۔ ماحول لطیف تھا جو بھیگی چاندنی کے نور سے مجسم شعریت بن گیا تھا۔ چاند ضیا پاش تھا۔ اس کے اطراف چند تارے ٹمٹما رہے تھے۔ مینار پر ایک تارا البتہ پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ زبان پر بے ساختہ یہ شعر آیا ؎

محبت میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

ان لطافتوں میں ہمارا ہر سانس ایک پیغام حسن تھا، جو فطرت دے رہی تھی۔ اس پرسکون فضا میں جو زرین لمحے گذرے ہم اس کو اپنی زندگی کا بہترین حصہ تصور کرتے ہیں۔

نظام ساگر (نظام آباد)

نظام ساگر پر جب ہم پہنچے ہیں، آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اس کے سطح آب پر عجیب گنگا جمنی کیفیتیں رونما تھیں۔ ابتدائے شام کی دھندلی نورپاشیاں، منظر کی خلد نمائیاں اور شعریت پسند طبیعت کی ترنگیں ان سب کے باہمی امتزاج نے ہمیں نظارہ فردوس کا سنہری موقع دیا۔

"ساگرنما" ایک جرمن وضع کا ہفت پہلو بنگلہ ہے جس میں نظام ساگر کے خوشنما مناظر کی تصویریں سلیقہ سے لگائی گئی ہیں۔ ساگرنما کی چاندنی پر چڑھ کر اطراف کے لطیف ماحول کا جائزہ لیا جائے تو عجیب فردوسی مناظر دکھائی دیتے ہیں۔

اس خطۂ شعر و موسیقی کا چپہ چپہ شباب حسن کی غمازی کرتا ہے۔ ایک طرف پانی کا سیال سمندر ہے جو ناپیداکنار انداز میں حد نظر بنا ہوا ہے اور دوسری طرف اپر بیٹ کا چھوٹا سا تالاب زبان حال سے اپنی بے بضاعتی کا اظہار کر رہا ہے۔ سرسبز کھیتوں کے درمیان پانی کے چشمے چھلک رہے ہیں۔ جھلسا دینے والی دھوپ میں لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی شادابی نظام ساگر کی مسیحا نفسیوں کا خاموش ترانہ گا رہی ہے۔

ہموار اور صاف سڑک سے اتر آنے کے بعد ایک مثلث نما پارک ملتا ہے جو ندرت اور سلیقہ کا مظہر ہے۔ فرش زمردیں پر پھولوں کے تختے کسی حسین گل اندام کی طرح مسکرا رہے ہیں۔

"کٹے" پر سے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تالاب کیا تھا؟ ایک چادر سیماب، ایک سمندر رنگین، جہاں موسیقی رقصاں اور شعریت عریاں دکھائی دیتی ہے۔ پانی میں لنگم پلی کی گڑھی، ڈوبی ہوئی بستیوں کی دبی زبان سے نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔

دوسرے دن سویرے، ہم گلگشت کی سیر کے لئے روانہ ہوئے طلوع آفتاب کا نظارہ وجد آفریں تھا گلگشت کی منظر آفرینیاں من موہ رہی تھیں۔ آفتاب کی دوشیزہ کرنیں، فضا کی رنگینیاں، صبح کا سہانا پن، منظر کی صبیح لطافت، غرض ؎

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

نہر نظام ساگر بھی قابل دید ہے جو اژدھا کی طرح بہت دور تک چلی گئی ہے۔ ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں سطح زمین پر ندی ہے

اس پر نہر بہہ رہی ہے اور نہر پر ایک پل ڈالا گیا ہے تاکہ عبور و مرور میں آسانی ہو۔

اس ارضی جنت کا جوبن تو کچھ ساون کی رت میں دیدنی ہوتا ہوگا۔ گرما کی محشر زائیوں میں جب یہ عالم ہے تو برسات کی کیف سامانیاں خدا جانے کیا رنگ لاتی ہیں۔

عثمان ساگر (حیدر آباد)

عثمان ساگر۔ ایک ایسا منظر آفریں مقام ہے جو شہر سے نزدیک بھی ہے اور دور بھی۔ جب کبھی کاروباری سرگرمیوں سے جی اچاٹ ہو جاتا ہے تو ہم اس کے روح پرور گوشوں میں جویائے سکون ہوتے ہیں۔

ساگر کے کنارے خوشنا باغ سلیقے سے لگائے گئے ہیں، جن کی شادابیاں روح منظر بنی رہتی ہیں رو پہلی لہریں ترنم آفریں تڑپ کے ساتھ آکر سرگیں پہاڑیوں سے ٹکراتی ہیں، چٹانوں کے درمیان، سطح آب پر خوب صورت مچھلیاں لہرا کر حسن کارانہ انداز میں حلقے بناتی ہیں۔

چمن کے گوشہ میں جھولے پڑے ہیں جہاں بے ساختہ پن کے ساتھ موج منانے کو جی چاہتا ہے۔ فضا میں شعر و شباب کی اتنی رنگینیاں ہیں کہ جدھر نظر پڑتی ہے حسن کا ایک دریا چڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ کشکول نگاہ میں ہر ذرہ کائنات حسن بن کر چمکتا ہے چاندنی راتوں میں، برسات کی کیف آفرینیوں میں اور شام کے شفق پرور دہ مناظر میں ہم نے کئی مرتبہ جی بہلایا۔ نگاہ منظر پرست کے لئے ہر فرصت نظارہ۔ سکون کی سینکڑوں کروٹیں لئے ہوئے آئی اور اضطراب دل کی بیداریاں چھوڑ گئی۔

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

میکش

اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ ناکام اور نامراد رہے گا۔

(ٹیگور)

سپاسنامۂ زبانِ اُردُو

بحضورِ پُرنور اعلیٰ حضرت خسروِ دکن سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

بانیٔ جامعۂ عثمانیہ

نتیجۂ فکر محترمہ "زخ ش" مرحومہ

ولادت سنہ ۱۸۹۶ء وفات سنہ ۱۹۲۲ء

(۱)

"میں شانہ سے درگذری، آئینہ سے باز آئی — وہ دل ہی نہیں جس میں ہو ذوق خود آرائی
"ہرچند کہ صورت میں ہوں نور کی مورت میں — ناظر نہ ہو جب کوئی، کس کام کی رعنائی
"ایک چاند ہوں بدلی میں، ایک لعل ہوں گدڑی میں — ایک حسن ہوں دیہاتی، ایک پھول ہوں صحرائی
"مشاطہ اگر کرتی، آراستگی و تزئین — ہر اہل خرد ہوتا اس زلف کا سودائی

"ہوں بزم حریفاں میں، جوں آئینہ حیراں میں
با ایں ہمہ زیبائی با ایں ہمہ رعنائی

"اس دُھن میں کہ ہاتھ آئے دامن کسی کامل کا
اس دُھن میں کہ ہو جائے شاید کہیں شنوائی

"ہر منہ میں زباں ہو کر میں چلتی رہی برسوں
کُل ہند کی وسعت میں کی بادیہ پیمائی

"پر اہلِ زباں میرا اس طرح تھے منہ تکتے
دی ہی نہیں خالق نے گویا انھیں گویائی

گر ہو بھی گیا مائل پردیس میں کوئی دل
گھر والوں کی نخوت نے کی حوصلہ فرسائی

"دلّی کی یہ تمکینی، یہ لکھنوی شیرینی
تھیں وقفِ سخن چینی، کیا ذکر دل افزائی

(۲)

"آخر درِ محسن تک قسمت مجھے لے آئی
ہاں تجھ کو بشارت ہو، اے ذوقِ جبیں سائی

"جوں شمس و قمر روشن ہے اسم شریف اس کا
ہے نام خدا جس میں نورین کی یکجائی

"ہے آج بصد زینت ہر کان کا آویزہ
عثمان علی خان خلد اللہ ملکہ کا آوازۂ یکتائی

"عثماں کی "حیا" نے کی آکر میری غمخواری
دیکھی نہ گئی اس سے یہ ذلت و رسوائی

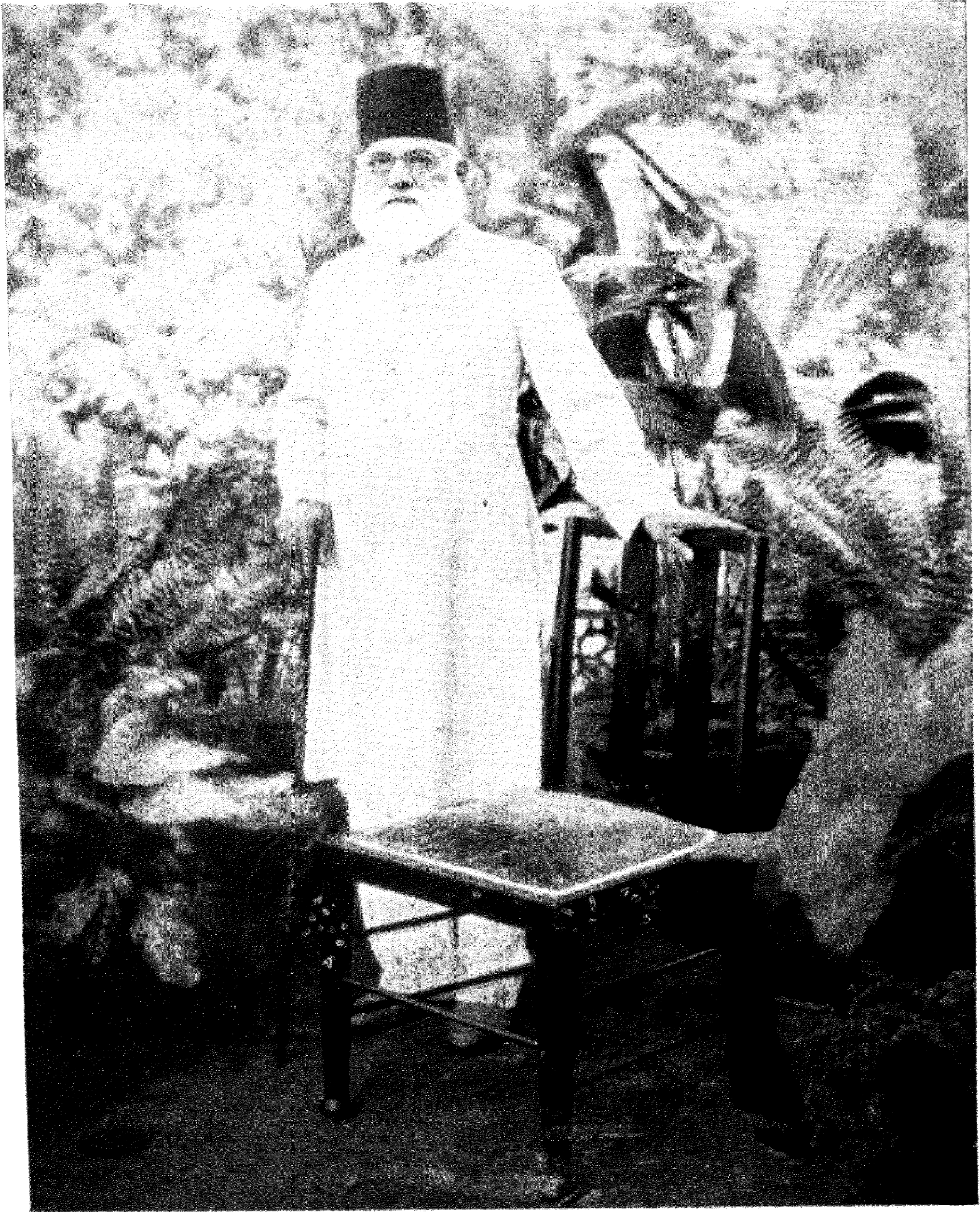
"کی بن کے "غنی" آخر شاہانہ ادا ظاہر
ایک جامعہ کی یعنی تاسیس ہے فرمائی

"جاں از سرِ نو بخشی میرے تنِ مردہ میں
پھر زندہ کیا اس نے اعجاز مسیحائی

قاصد ہوں ایک اُردو کی، اے شاہ نہیں مجھ کو
دعوائے زباں دانی ہشق سخن آرائی

زخ ش، ۱۹۱۷ء

عطا کردہ پروفیسر ہارون خان شیروانی صدر شعبہ تاریخ



ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام-اے (عثمانیہ)
پی-ایچ-ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو
مشیر حصہ اردو

اُردو ڈرامہ کا دورِ جدید اور حیدرآباد

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک

گو سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد اور دس سال تک ناٹک کمپنیاں دورے کرکے تماشے دکھلاتی رہیں مگر اس زمانہ میں ان میں وہ اگلی سی قوت اور طمطراق باقی نہ رہا تھا البتہ یہ کمپنیاں طوفان کے بعد کی ہلکی لہروں کی شکل میں گذشتہ دور کی یاد تازہ کرتی تھیں۔

سینما کی پیدائش اسٹیج کی موت تھی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جب ہندوستان میں سینما آیا تو آہستہ آہستہ عوام نے تھیٹروں سے بے رخی برتنا شروع کیا۔ ابتدا میں فلم خاموش تھے مگر ان قصوں میں اداکاری اور پس منظری تزئین کے اعتبار سے زوال یافتہ اسٹیج ہی کی نقل کی جاتی تھی اور پھر تھیٹر کے مقابلہ میں کئی گنا کم داموں میں سامان تفریح فراہم ہوجاتا تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ سینما کو عروج اور مقبولیت حاصل ہوتی گئی یہیں سے اُردو تھیٹر جس کی عمارت تجارت پر کھڑی ہوگئی تھی گرنے لگی۔ پانچ سات سال کے عرصہ میں یہ مٹی کے برابر ہوکر رہ گئی جس پر بولتے فلم نے اپنی نئی عمارت کھڑی کی۔

سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۷ء تک کا دور اُردو اسٹیج کی سکرات کا دور تھا جس میں ایک طرف تو معاشی اور تجارتی اسباب ایسے پیدا ہوگئے تھے جس نے اسٹیج کو لب گور پہنچا دیا دوسرے جامعات کے قیام اور جدید تعلیم کی نشر و اشاعت نے ناٹک کمپنیوں کی زبون اور

بتذل حالت کے خلاف شدید جذبہ منافرت پیدا کیا۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اسٹیج اور ڈرامہ کی اہمیت اور افادیت کا ایسا ہی معتقد تھا جیسے کہ منوب ہے مگر وہ اُردو ناٹک کمپنیوں کی غیر ادبی۔ طرز روش کو توڑ کر مغربی ڈرامہ کی طرح اُردو ڈرامہ کو بھی ادبی بنانا چاہتا تھا۔

اسٹیج اور ڈرامہ میں جسم اور روح کا سا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے سے ایسے وابستہ ہیں کہ بغیر اسٹیج کے ڈرامہ کا اور بغیر ڈرامہ کے اسٹیج کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ڈرامے اگر اسٹیج نہ ہو سکیں تو وہ ڈرامے نہیں ہیں۔ اگر کوئی ڈرامہ نویس اسٹیج اور گرد و پیش کی دقتوں کو پیش نظر رکھے بغیر ڈرامہ لکھے تو اس کا یہ فعل بے فیض اور فضول ہوگا۔ اس عقیدہ کا ایک امام اس دور کا انگریزی ممتاز ڈرامہ نویس جیمس بری ہے جو ڈرامہ کی طباعت کا بھی مخالف ہے۔

جدید اُردو ڈرامہ نے زبان کی صفائی مکالموں کی برجستگی کے لحاظ سے ناٹک کمپنیوں کے مقابلہ میں قابل لحاظ ترقی کی کیونکہ اس تحریک کے حصہ دار ایسے تعلیم یافتہ تھے جو مغربی اور مشرقی علوم و فنون میں کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ مگر اس دور کے ابتدائی ڈرامے فنی نقطۂ نظر سے نسبتاً کمزور اور اسٹیج کئے جانے کی کم اہمیت رکھتے ہیں۔ کردار سازی میں ایک حد تک لحاظ رکھا جاتا تھا مگر دوسرے ان اجزا کی جس سے ڈرامہ تشکیل پاتا ہے کمی ہے (مثلاً عمل۔ واقعات کا انتظار۔ ذہنی اور عملی کشمکش۔ قصہ کا تدریجی ارتقا اور پلاٹ کا توازن)

۱۹۰۵ء کی اصلاحی تحریک دراصل پیش خیمہ تھی اس جدید دور کا جو عبدالماجد کے ڈرامہ "زود پشیماں" سے شروع ہوتا ہے اُردو ڈرامہ میں زبان۔ خیال اور فنی اعتبار سے جس قسم کے تغیرات واقع ہوئے ان پر اس مضمون میں بحث کی جائے گی۔

"زود پشیماں" از عبدالماجد (ناظر) ۱۹۱۷ء

مولوی عبدالماجد نے یہ ڈرامہ اس وقت لکھا ہے جبکہ اُردو ڈرامہ ناٹک کمپنیوں کے ہاتھوں ابتذال کی آخری منزلیں طے کر چکا تھا۔ معاشرہ کا رنگ یہ تھا کہ کسی شائستہ انسان کا خود کو ڈرامہ سے منسوب کرنا نہایت ہی معیوب اور بتذل سمجھا جاتا تھا مولوی عبدالماجد چونکہ مغربی ادب سے آشنا اور فن ڈرامہ کے حقیقی مرتبہ سے واقف تھے وہ یہ جانتے تھے کہ تمام اصناف ادب میں ڈرامہ ہی ایک ایسی صنف ہے جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ افراد معاشرہ کو ذہنی غذا پہنچا سکتی ہے۔ ناظر نے اجتہاد سے کام لے کر تمام مصنوعی، رواجی اور رسمی معتقدات کی بندھنوں کو توڑ کر فن ڈرامہ نویسی کو جو اس زمانہ میں تمام اصناف ادب میں سب سے زیادہ بتذل اور حقیر سمجھی جاتی تھی اپنے لئے پسند کیا اور "زود پشیماں" لکھا۔

یہ ایک معاشرتی حزنیہ ہے جو تین ابواب پر مشتمل ہے اس کا نفس مضمون (Theme) انتخاب ازدواج ہے۔

معاشرتی مسائل کو ناظر سے پہلے کسی نے سنجیدہ ڈرامہ کا موضوع نہیں بنایا تھا۔ ان سے پہلے کے تمام ڈرامے ہندو دیو مالا۔ اسلامی قصص شکسپیر اور دوسرے مغربی مصنفین کی ناولوں اور ڈراموں سے ماخوذ ہوتے تھے۔ ہم عصر سماج پر اگر تنقید ہوتی بھی تو وہ نقلوں میں۔ زود پشیماں اُردو کا پہلا ڈرامہ ہے جس میں ہماری زندگی کے ایک اہم مسئلہ کو واقعات کے پیرایہ میں پیش کیا گیا۔

مغربی تعلیم کی اشاعت کی وجہ سے ہمارے قدیم تمدن کا جدید مغربی تمدن سے ایسا تصادم ہوا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں آثار انقلاب پیدا ہو گئے۔ مذاہب کی تنقیح ہونے لگی اور معاشرت کی ہر رسم ناقدانہ نظر سے دیکھی جانے لگی تعلیم یافتہ گروہ نے ہر اس چیز کو جو غیر معقول تھی اپنے معتقدات اور اپنی معاشرت سے نکال پھینکنے کا تہیہ کر لیا اور نئے سانچوں پر معاشرہ کو ڈھالنا چاہا۔ زود پشیماں،، اس ذہنی کش مکش کا ایک اچھا آئینہ ہے۔

اس ڈرامہ کا مرکزی کردار یوسف ایک تعلیم یافتہ نوجوان ہے جس پر علمیت کا نشہ چڑھا ہوا ہے۔ شادی کو معاشرتی ضرورت سمجھتا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی ایقان ہے کہ انفرادی نقطہ نظر سے اگر کوئی شخص خود کو علمی کام میں مشغول رکھ کر معاشرہ کی خدمت کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے تجرد ضروری ہے۔

حسنی ہیروین ہے جو بچپن سے اپنے چچا زاد بھائی مشرف سے منسوب ہے۔ حسنی اسکول میں تعلیم پاتی ہے انتخاب ازواج کے معاملہ میں آزاد خیال ہے۔ گانا بجانا بھی جانتی ہے اسے داغ کی غزلوں میں مزہ آتا ہے۔ مثنوی زہر عشق سے بھی دلچسپی ہے مشرف سے Comic Relief کا کام لیا گیا ہے۔ حسنی جتنی شائستہ اور اعلیٰ مذاق لڑکی ہے مشرف اسی مناسبت سے بے وقوف اور بدتمیز ہے مشرف کو خود اس کی زبان سے ظاہر کرنے میں ناظر کامیاب نہیں ہوئے۔

حسنی سے ملنے کے بعد یوسف کی معقولیت اور علمیت جذبہ عشق کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہ جاتی ہے۔ جب ناکامی ہوتی ہے یوسف خودکشی کر لیتا ہے۔

جہاں یوسف پر علمیت غالب ہے وہاں ناظر برنارڈ شا کے پیرو معلوم ہوتے ہیں اور جہاں جذبات کی حکومت ہے وہاں شکسپیر کا اثر نمایاں ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس وقت رومیو اور جولیٹ سے متاثر ہے۔ مکالمے روزمرہ میں ہیں۔ بعض اوقات خود کلامی سے کام لیا گیا ہے جو بیسویں صدی میں متروک ہے۔

یوسف کے کردار کی تکمیل میں بہ ظاہر ڈرامہ نگار کامیاب نظر آتا ہے ہیرو کی خودکشی کا فعل اس کے عالمانہ کردار کی عظمت کو زبردست دھکا پہنچاتا ہے۔ وہ شخص جس پر مدرسہ کی راہبانہ زندگی کا زبردست اثر ہو جو ہر بات کی علمی توجیہہ

کرکے زندگی کو اپنے خیالات و معتقدات کے محور پر چلایا کرتا ہو۔ اس کا جذبات سے مغلوب ہوکر مایوسی سے یوں اثر لینا اور
اور اس کا خودکشی کی صورت میں انجام پانا افسانوی حیثیت سے کوئی غیر معمولی فعل نہ سہی مگر یوسف جیسے کردار کے لئے اجنبی
ضرور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاتمہ بالکل رومیو اور جولیٹ کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا۔

ابتدا میں ڈرامہ جس قدر واقعی اور روزمرہ زندگی سے قریب تھا آخر میں اتنا ہی تصوری اور شاعرانہ اور غیر واقعی ہوگیا ہے
اس ڈرامہ میں مروجہ عوامی دلچسپیاں نہیں ہیں اس لئے تجارتی اسٹیج پر پیش نہیں کیا جاسکا۔

جن محرکات کی بنا پر جدید ڈرامہ کا آغاز ہوا تھا اس کا نتیجہ تھا کہ دوسرے ممتاز اردو انشا پردازوں نے بھی اس صنف
ادب کی طرف توجہ کی۔ ان میں مولانا شرر، کیفی، کشن چند۔ زیبا۔ امراؤ علی اور شوق قدوائی قابل ذکر ہیں جن کے ڈراموں میں اس
وقت معاشرتی اور سیاسی اضطراب کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

شرر کی ناولوں کا محبوب موضوع تاریخ اسلام رہا ہے۔ معتقدات کے لحاظ سے یہ جدید تحریکات کے ہم نوا تھے۔
ان کے دو ڈرامے "شہید وفا" اور "میوہ تلخ" ان دونوں خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "شہید وفا" حسن و عشق کی چاشنی
کے ساتھ اسپین کی اسلامی تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ اس پر ڈرامہ کی بجائے ناول کا زیادہ اطلاق ہوتا ہے۔ میوہ تلخ کا
موضوع زود پشیماں کی طرح انتخاب ازدواج ہی ہے شادی کے معاملہ میں لڑکیوں کی رضامندی نکاح ثانی، تعلیم نسواں
جیسے معاشرتی مسائل جن پر رسم و رواج کا ایسا رنگ چڑھ گیا تھا کہ اصلی شرعی ہیئت باقی نہیں رہی تھی شرعی حدود میں رہ کر انھیں
مسائل کی اصلاح اس ڈرامہ کا پیام ہے۔

شرر نے اس ڈرامہ میں حسینہ اور صغریٰ کی دو متضاد زندگیوں کے تقابل سے اپنے پیام کی تلقین میں کامیابی تو حاصل کی
ہے مگر ڈرامہ کا عملی اور اظہاری پہلو کمزور رہ گیا۔ اصلاح کے بعد اسٹیج کیا جاسکتا ہے۔ بہ شرطیکہ ناظرین اپنی دلچسپی کا زیادہ خیال
نہ رکھیں۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کو اردو ڈرامہ سے خاص دلچسپی ہے۔ آپ شاعر ہونے کے علاوہ ڈرامہ کے نقاد اور ڈرامہ نویس
بھی ہیں راج دلاری اور مراری دادا دو ڈرامے آپ کی جدت طبع کا نتیجہ ہیں۔

راج دلاری ایک معاشرتی ڈرامہ ہے جس میں مغربی اور مشرقی تمدن کے اختلاط کے باعث پیدا شدہ مختلف النوع
معاشرتی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ پردہ۔ تعلیم۔ گانا۔ بجانا۔ رفاہ عام۔ ہمدردی۔ آزادی نسواں جیسے مسائل زیر بحث

لائے گئے ہیں۔

وحدت موضوع برقرار نہ رہنے کی وجہ سے مجموعی طور پر عام دلچسپی اور اثر آفرینی مجروح ہوگئی ہے۔ کردارکشی میں واقفیت نہیں ہے اس ڈرامہ کا ہیرو اخلاق و عادات کے اعتبار سے ایسا بے عیب اور پاک ذات ہے اور اس میں زندگی کے تمام محاسن اپسے چن چن کر شامل کئے گئے ہیں کہ وہ انسان نہیں معلوم ہوتا۔ اسٹیج کئے جانے کے لئے اس ڈرامہ میں بھی تنسیخ و ترمیم کی ضرورت ہے۔

شوق قدوائی نے اپنے شاعرانہ عروضی کمالات کے مظاہرہ کے لئے ڈرامہ کو بھی آلہ بنایا۔ قاسم وزہرہ آپ کا ایک منظوم ڈرامہ ہے چونکہ یہ ابواب اور مناظر پر منقسم ہے اس لئے ڈرامہ کہلایا جاتا ہے ورنہ ایک عشقیہ مثنوی میں اور اس میں کچھ فرق نہیں۔ شوق اچھے شاعر ہیں مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر شاعر اچھا ڈرامہ نگار بھی ہو۔ اس ڈرامہ کی صرف تاریخی اہمیت ہے رسوا کے مرقع لیلیٰ مجنوں کی طرح یہ ڈرامہ بھی لسانی اصلاح کے سلسلہ میں یاد کیا جا سکتا ہے۔

جدید دور درحقیقت اردو ڈرامہ میں تحریک رومانیت کا آغاز تھا۔ مغربی اثر کے تحت شاعری اور دیگر اصناف ادب میں نمایاں انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔ ملک کی اجتماعی ضرورتیں ادب پر اثر انداز ہو رہی تھیں گردوپیش کے سماجی اور سیاسی تغیرات سے ملک کا ہر صاحب بصیرت شخص ذہنی طور پر متاثر تھا۔ جس کا اظہار اس دور کے بعض ڈراموں میں بھی ہوتا ہے تین ڈرامے "زخمی پنجاب" "بیداری" اور "البرٹ بل" اس باب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

"زخمی پنجاب" کشن چند زیبا کی تصنیف ہے سیاسی ہونے کی وجہ سے حکومت کی جانب سے ضبط کیا گیا۔ اور ملک کا مرکز توجہ بن گیا۔

"بیداری" سالہ تحریک کے ... حکیم اظہر دہلوی کی تصنیف ہے جو شائستہ مزاح اور طنز کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ ایک نیم تمثیلی اور نیم واقعی ڈرامہ ہے جس میں مسٹر ہارش۔ مسٹر براڈ، مسٹر اینگرا اور مسٹر برجوڈس اور جنڈال بابو کے پردے میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کی کمزوریوں کو لطیف طنزیہ انداز میں نکتہ چینی کیا گیا ہے۔

زبان اور موضوع کے اعتبار سے تغیر پیدا ہونے کے بعد اردو ڈرامہ ارتقار کے منزلیں طے کرتا ہوا زبان اور خیال کے ساتھ ساتھ فن کارانہ کمال بھی حاصل کرتا گیا۔ جامعاتی تعلیم کے زیر اثر ایک ایسا طبقہ اردو انشا پردازوں کا پیدا ہو جو عروض ڈرامہ کی واقفیت میں اپنے پیش رو بزرگوں کے مقابلہ میں زیادہ ممتاز ہے۔ ادبی تحرکات میں ریاضی کی طرح قطعی حدود کا تعین کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ہم آسانی کے لئے متذکرہ بالا بیان کو دور جدید کے بانیوں سے تعبیر کر کے ذیل میں جدید ترین دور کا ذکر کریں گے جو طبعزاد ڈراموں کے علاوہ مغربی تراجم پر مشتمل ہے مگر ان میں اپنے پیشروں کے مقابلہ میں زیادہ مہارت فن اور صحت ترجمہ کا خیال رکھا گیا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے (۱۹۱۹ء) اُردو ادب اور زبان نے جس سُرعت اور اعتماد کے ساتھ ترقی کی اس کی مثال نہ ہم عصر زبانوں میں ملتی ہے اور نہ خود اُردو کے ماضی میں۔ اُردو زبان کی وسعت و ترقی کی اس مستحکم اور باقوت کوشش نے احیائے علوم و ادب کی ایک ایسی وسیع تحریک پیدا کر دی کہ ملک میں نشر و اشاعت کے متعدد مرکز قائم ہوگئے جس میں حیدرآباد۔ پنجاب اور یوپی کو خاص اہمیت حاصل ہے انہیں مقامات پر اور اصناف ادب اور مختلف علوم و فنون کی اشاعت کے ساتھ ساتھ صنف ڈرامہ میں ترقی ہونے لگی۔ ہم عصر اور قدیم اساتذہ مغرب کے شاہکار تصانیف اور تراجم کے علاوہ جدید اصولوں پر طبع زاد اچھے ڈرامے بھی لکھے اور شوقیہ اداکاروں کے ذریعہ کالجوں اور مدرسوں میں دکھلائے جانے لگے۔

موجودہ دور میں کوئی ایسا تھیٹر نہیں ہے جو تجارتی اور پیشہ ور طور پر ان جدید ڈراموں کو پیش کرتا ہو۔ عموماً کالجوں کے طالب علم کالجوں ہی میں سیدھے سادے ساز و سامان کے ساتھ ان تماشوں کو دکھلاتے ہیں۔ ایسے مظاہرے پنجاب کے کالجوں میں بھی ہوتے ہیں مگر اس ضمن میں جس قدر منظم کوشش حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے طلباء کی جانب سے ہو رہی ہے وہ ملک کے کسی اور مقام پر نظر نہیں آتی۔ حیدرآباد کی شوقیہ انجمنوں نے جامعہ کی حدود سے قدم بڑھا کر شہر کے تعلیم یافتہ طبقہ۔ امرا۔ روسا۔ اور خود خانوادہ شاہی کی سرپرستی حاصل کی ہے۔

دیگر صوبوں کے مقابلہ میں پنجاب کو اُردو صحافت کے سلسلہ میں قیادت کا درجہ حاصل ہے۔ ماہوار رسالوں نے اردو ڈرامہ کو فروغ دینے میں بہت حصہ لیا۔ یوں تو کوئی رسالہ بھی ڈرامہ کے ذکر سے خالی نہیں رہتا مگر خصوصیت کے ساتھ رسالہ تحریک اور ہزار داستان کی خدمات قابل ستائش ہیں جو بالکلیہ اردو ڈرامہ کی ترقی کے لئے وقف تھے۔

ڈرامہ کی جدید تحریک کی تبلیغ میں "ہزار داستان" اور اس کے مدیر احمد شجاع اور ان کے رفقائے کار امتیاز علی تاج سالک اور پطرس جیسے نوجوان انشا پردازوں کا زیادہ حصہ ہے۔

پارسی اور جدید دور کی حدود کا مقام اتصال ہم احمد شجاع کی ذات کو قرار دے سکتے ہیں جن کے ڈراموں میں جدید اور قدیم دونوں عناصر کا اشتراک ہے یہ امتیاز علی تاج کی طرح انقلابی نہیں ہیں جنھوں نے پرانے اصولوں اور روایات کو خیرباد کہہ جدید روشنی پر "انارکلی جیسا ڈرامہ لکھا بلکہ آغا حشر اور جدید طرز کے بین بین رہ کر ایسے ڈرامے لکھے جو خاص و عام کی دلچسپی کا سامان بن سکیں جس کی اچھی مثال ان کا ڈرامہ "باپ کا گناہ" ہے۔

"باپ کا گناہ" تمثیل نگار کے پیش نظر یہ بات تھی کہ جو تبدیلی مدارج و منازل سے بے نیاز ہو مقبول عام نہیں ہو سکتی۔

خود مصنف کے الفاظ میں اس ڈرامے میں "طرز تحریر اور بیرونی حیثیت میں بہت زیادہ تغیر روا نہیں رکھا گیا۔ گو اس تمثیل میں بڑی حد تک رسمیات سے گریز کیا گیا ہے مگر لیا کہ دیکھنے والوں کو یہ روش اجنبی معلوم نہیں ہوتی۔

ڈرامہ مکالموں۔ ڈرامائی لمحات، کش مکش۔ کردار انکشاف اور تناسب کے اعتبار سے ایک دل آویز مجموعہ ہے۔ مکالمے مستعمل اور داقمی طرز میں نہیں لکھے گئے بلکہ غیر معمولی شاعرانہ طریقۂ اظہار اختیار کیا گیا ہے روزمرہ زندگی کی غیر دلچسپ گفتگو کی بجائے تصوری گفتگو نے ڈرامہ کے اثر کو بہت بڑھا دیا ہے۔ جذبات کو انتہائی قوت احساس سے محسوس کرکے پُرزور انداز میں بیان کرنے کی وجہ سے کم سے کم دقت اور کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ واقعات اور حرکات و سکنات پیش نظر ہو جاتے ہیں۔

اس ڈرامہ میں بعض بعض جگہ عبارت مقفیٰ اور مسجع بھی ہوگئی ہے اور ہر کردار پرانی طرز میں نثر کے بعد کچھ اشعار بھی کہتا ہے مگر جہاں جہاں شعر استعمال کئے گئے ہیں خوب ہیں اکثر مقامات پر فلسفیانہ اور شاعرانہ خیالات کا اظہار ماہرانہ طریقہ پر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف پڑھنے میں بلکہ اسٹیج پر بھی لطف آسکتا ہے اکثر فقرے اور اشعار اس قابل ہیں کہ انھیں اپنی بیاض میں نقل کرلیا جائے۔

قدیم اسلوب کی تقلید میں اس ڈرامہ میں دو مختلف پلاٹ خود کلامی اور اسائڈ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ ڈرامہ قدیم و جدید اثرات کا ایک خوشگوار مرکب ہے۔ اس ڈرامہ کو الگزنڈرا کمپنی نے بمقام لاہور ۱۹۲۳ء میں پیش کیا مصنف کے دوسرے ڈراموں میں بھارت کا لال، آخری فرعون، جاں باز۔ مشہور ہیں جن کی قیمت نقوش مینا اور تارا بنگالی ڈراموں کے ترجمے ہیں۔

انارکلی:۔ از امتیاز علی تاج

اُردو ڈرامہ کی صنف میں "انارکلی" کا بہ حیثیت فن و اسلوب بیان ممتاز درجہ ہے۔ تاج اس دور کے انشا پردازوں میں اپنی تخلیقی کارگذاریوں کی وجہ سے خاص امتیاز رکھتے ہیں اُن کی شاعرانہ اور ادیبانہ توانیوں کی نمائش کی اچھی مثال خود "انارکلی" ڈرامہ ہے جو اُردو ادب میں مستقل قدر و قیمت کی چیز ہے۔

یہ عشقیہ حزنیہ شہزادہ سلیم اور انارکلی کے دل گداز واقعہ عشق پر مبنی ہے تاریخی صحت و عدم صحت سے یہاں بحث نہیں ان روایات کو جو اس رومانس کے متعلق عوام میں مشہور تھے۔ تاج نے خیال آفرینی اور شاعرانہ قابلیتوں کی مدد سے ڈرامہ کا لباس پہنایا۔ انتخاب موضوع۔ روایات کے فراہم کرنے، ان کو حسن کارانہ انداز میں ترتیب دینے حذف و اضافہ کانٹ چھانٹ میں مصنف نے آٹھ سال صرف کئے ۱۹۲۲ء میں تاج نے اس ڈرامہ کو لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۰ء میں کہیں جا کر یہ ڈرامہ طبع ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ

یہ کتنے محتاط آرٹسٹ ہیں۔

انارکلی ایک مرصع غزل اور عہد مغلیہ کی شاہی زندگی کی زندہ تصویر ہے۔ سوز و گداز جو عشق کی جان ہے اس ڈرامہ میں جاری و ساری ہے۔ تاج کو مکالموں کے ذریعہ پس منظری فضا پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے جس کی مثالیں جابجا اس ڈرامہ میں ملتی ہیں۔ شاہان مغلیہ کی تمام افسانوی فضا آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ دوسرے کردار سے ہلکی شوخی اور ظرافت پیدا کی گئی ہے جو بہت دلنواز اور لطیف ہے۔ مکالموں کی زبان پاکیزہ ہے ان کا توازن اور تناسب کہیں بھی گرنے نہیں پاتا۔ پلاٹ چست ہے جس کی وجہ سے شروع سے آخر تک دلچسپی قایم رہتی ہے۔

ڈرامہ طویل ہے بعض منظروں کا اسٹیج پر پیش کیا جانا بہت مشکل ہے۔ جیسے آئینہ خانہ کا منظر ابھی ہندوستان کے اسٹیج نے اتنی ترقی نہیں کی جو اس شدید جزئیہ کو اپنے صحیح ماحول اور پس منظری آرایش کے ساتھ پیش کر سکے۔ خاموش فلم کے زمانہ میں اس کا فلم بن چکا ہے جس میں خود تاج نے اکبر کا پارٹ کیا تھا۔

تاج کے دوسرے ڈراموں میں دلہن اور سکندر اعظم قابل ذکر ہیں۔ سکندر اعظم غیر مطبوعہ ہے انگریزی کی وساطت سے آپ نے ایک بات کے چھوٹے چھوٹے دلچسپ ڈراموں کے ترجمے کئے ہیں

احمد حسین خاں مدیر شباب اردو نے ایک ڈرامہ حسن کا بازار، لکھا جو یکم مارچ ۱۹۲۴ء کو گلوب تھیٹر میں اسٹیج ہوا۔

چترا:۔ عبدالمجید سالک نے ٹیگور کی متعدد نظمیہ تصانیف کے ترجمے کئے ہیں انھیں میں چترا کا ترجمہ بھی ہے۔

[1] چترا:۔ شباب شعر اور موسیقیت سے بھرا ہوا اعلیٰ ترین کارنامہ ہے جو مہابھارت سے ماخوذ ہے کھیل کے ابتدائی منظر میں چترا کو مدن (خدائے محبت) اور وسانتا (خدائے شباب) سے محو مکالمہ تبلایا گیا ہے۔ چترا ان سے کہتی ہے کہ وہ ندی کے کنارے ہرن کے تعاقب میں پھر رہی تھی تو اس نے ایک نوجوان کو دیکھا جو سوکھے پتوں پر ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قوم کا ہیرو ارجن ہے جس کا خیال ہمیشہ چترا کے دل و دماغ پر چھایا ہوا رہا کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ارجن نے بارہ سال تک راہبانہ زندگی گذارنے کی قسم کھائی ہے۔ ایک جنگلی عورت ہونے کی وجہ سے چترا کی یہ آرزو تھی کسی نہ کسی روز مردانہ لباس میں ارجن سے مقابلہ کرے مگر پہلی ہی نظر میں یہ دل دے بیٹھتی ہے جب ارجن وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو چترا کے منہ سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔ وہ دم بخود دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئی۔

---

[1] راقم الحروف کی تصنیف "ٹیگور اور اس کی شاعری" سے ماخوذ صفحہ ۵۶ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

دوسرے دن وہ اپنا مردانہ لباس پھینک دیتی ہے اس کا وہ مردانہ گھمنڈ نسائی انفعالیت اور اعتراف شکست میں تبدیل ہوجاتا ہے چوڑیاں، کڑے، کمرپٹا۔ گلناری کی ساری زیب تن کئے مجسم نسائیت بن کر دھڑکتے ہوئے دل سے ارجن کی تلاش میں شو کے مندر میں جاتی ہے۔ اپنے محبوب کو مغلوب کرنے کے لئے اپنی ترکش کے پورے تیر چلاتی ہے مگر ارجن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ آخر وہ اپنی قسم یاد دلاتا ہے۔ چترا دل میں شکست اور خجالت کا احساس لے ہوئے مدن کی بارگاہ میں سر بسجود ہو کر مدد مانگتی ہے وہ ارجن کو اس کے قدموں پر لاڈالنے کا وعدہ کرتا ہے وہ وسانت کے حضور میں پہنچ کر التجا کرتی ہے کہ کم از کم ایک ہی دن کے لئے اس سے مردانہ پن چھین کر نسائی رعنائی عطا کرے تاکہ وہ اپنے مرکز محبت اور اپنی تمنا کو پاسکے چترا کے دعائیہ کلمات یہ ہیں۔

صرف ایک دن کے لئے مجھے حسین ترین بنادے مجھے مکمل حسن کا صرف ایک ہی دن عطا فرما"۔ بڑی محنت اور کامیابی کے ساتھ سالک نے اس کا ترجمہ کیا ہے اردو ادب میں اچھا اضافہ ہے

بنگالی ترجموں کے سلسلہ میں علاوہ احمد شجاع اور سالک کے سدرشن کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ آنریری مجسٹریٹ۔ قوم پرست۔ ماں کی پرتگیا۔ عورت کی محبت، بنگالی ڈراموں کے ترجمے ہیں جو بعض کالجوں میں پیش کئے جا چکے ہیں

اشاعت تعلیم نے مغربی ادب کے تمام ذخائر سے مستفید ہونے کے دروازے کھلوا دیئے تھے اس کا نتیجہ تھا کہ یورپ کے اعلی مفکرین۔ ادیب۔ شاعر اور ڈرامہ نویسوں کے نتائج فکر سے اردو میں معتدبہ اضافہ ہوا جہاں اور اصناف ادب کے تراجم اور مغربی اثرات اردو ادب میں منتقل ہوتے گئے وہیں مختلف مقبول اور مستند ڈرامہ نویسوں کے شاہکار سے اردو دار و شناس ہوئی۔

شکسپیر کا عہد ختم ہوچکا تھا جدید دور میں شلر۔ گوئٹے۔ مولیر۔ ابسن۔ شا۔ گالسورذی۔ وائلڈ۔ ایٹس۔ میٹرلنک۔ اور سامرسٹ مام وغیرہ نے اپنا اثر قایم کیا۔ جس سے نہ صرف نئے خیالات اور اسلوب کا اردو میں اضافہ اور جدید مغربی ڈرامہ سے واقفیت حاصل ہوئی بلکہ اس سرمایہ نے نمونہ بن کر اردو سے ڈرامے بھی لکھوائے جو فن کارانہ حیثیت سے ترقی یافتہ ڈراموں کی صنف میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔

ترجمہ اور تلخیص

شلر :۔ رابرس ۔ محمد عمر نور الٰہی صاحبان نے "قزاق" کے نام سے ترجمہ کیا جسے حیدر آباد کی ایک شوقین انجمن نے پیش کیا۔

گوئٹے :۔ فاسٹ ۔ مصنفہ گوئٹے ۔ ڈاکٹر عابد حسین نے راست جرمن سے اس کا ترجمہ کیا ہے اس ڈرامہ کو جامعہ عثمانیہ کے طلبا نے اسٹیج کیا۔

مولیر :۔ مولیر کے ڈراموں کو کئی حضرات نے اردو میں منتقل کیا ۔ "نکاح بالجبر" کی مولوی وہاج الدین (جامعہ عثمانیہ) نے مولیر کے ڈرامہ "فورسڈ میاریج" سے تلخیص کی جس میں فلسفی کردار کو کامیابی کے ساتھ اردو میں منتقل کیا گیا ہے ۔

زبان ڈرامائی اور پر شوکت ہے اصل ڈرامہ کی ظرافت ترجمہ میں مجروح نہیں ہوئی ۔ اس خوبصورتی اور مہارت سے اردو کا جامہ پہنایا گیا کہ ترجمہ نہیں بلکہ طبعزاد معلوم ہوتا ہے ۔ اس ڈرامہ کو اورنگ آباد کے عثمانیہ کالج اور جامعہ عثمانیہ کے طلبا نے کامیابی کے ساتھ پیش کیا ۔ وہاج الدین صاحب کا ایک اور ڈرامہ "انسپکٹر جنرل" گوگل سے ماخوذ ہے ۔

جان ظرافت :۔ مولیر کے ڈرامہ لینگ کو فارسی کی وساطت سے محمد عمر نور الٰہی صاحبان نے اردو میں "جان ظرافت" کے نام سے ماخوذ کیا ۔

تین ٹوپیاں :۔ از محمد عمر نور الٰہی صاحبان ۔ یہ بھی مولیر کے کسی ڈرامہ سے ماخوذ ہے ۔

تعلیم زدہ بیوی :۔ از فضل حق قریشی ۔ یہ ڈرامہ بھی مولیر سے ماخوذ ہے جس میں ظرافت کے ساتھ اصلاحی عنصر بھی شامل ہے

طبیب حاذق :۔ از مرزا ظفر الرحمٰن (عثمانیہ) مولیر سے ماخوذ ۔ اس ڈرامہ کو جامعہ عثمانیہ کے طلبا نے اسٹیج کیا ۔

لینگ ۔ کے ناتن درو ائزہے " کو محمد نعیم الرحمٰن نے راست جرمن سے ناتن کے نام سے ترجمہ کیا جو ہندوستانی اکاڈمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے ۔ ڈرامہ طویل ہے ۔

اسکر وائلڈ :۔ موجودہ دور میں وائلڈ کی تحریروں سے اردو ادب کافی متاثر ہوا ہے اس کی اکثر نظموں افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے اردو میں ہو چکے ۔ ڈورین گرے کو اکثر حضرات نے اردو میں منتقل کرنا چاہا مگر ان کی مساعی بارآور نہ ہو سکیں ۔

وائلڈ ایک ناقابل تقلید طرز نگارش کا مالک تھا اس کی تمام تر تصنیف مرصع سادگی رنگینی اعلیٰ تفکر ہلکی ظرافت اور

اسلوب بیان کے اچھوتے پن سے مملو ہیں۔ فطرت کی نزاکتوں اور موزوں رنگوں کی آمیزش سے لطیف اور دلکش تصویریں بنانے میں اسے بڑی قدرت حاصل تھی۔

وائلڈ کے ادبی معتقدات کی نمایاں خصوصیت جو اس کو دوسرے انشاپردازوں سے علیحدہ کرتی ہے یہ ہے کہ وہ آرٹ محض کا پیغمبر تھا۔ وہ اس کا روادار نہ تھا کہ آرٹ کو افادہ کی آلودگیوں سے ملوث کیا جائے وہ ہر چیز کو جمالیاتی عینک سے دیکھتا اور خیر و شر کا فتویٰ صادر کرتا اس کے نزدیک حسن ہی نیکی اور زشتی ہی بدی تھی۔

سلومی۔ ایک ایکٹ کی ایک شاعرانہ تمثیل ہے۔ اس چھوٹے سے ڈرامہ میں مصنف نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور قوت متخیلہ کا خوب اظہار کیا ہے۔ وائلڈ الفاظ کی قدر و قیمت خوب جانتا تھا انتخاب الفاظ میں اس کی نزاکت شناس طبیعت نے معجزے دکھائے ہیں جس کی اعلیٰ مثال خود زیر بحث تمثیل ہے۔ اس تمثیل کی واحد خصوصیت جو اسکو وائلڈ کے اور ڈراموں سے ممتاز کرتی ہے وہ اس کا چست متوازن پلاٹ ہے واقعات اور جذبات کی کش مکش سے ایسے ڈرامائی لمحے پیدا کئے گئے ہیں اور مکالمے سے ایسی طاقت بخشی گئی ہے کہ کہیں بھی دلچسپی سست نہیں پڑتی۔

۱۹۰۱ء کیم زائلڈ کی وفات کے بعد برلن میں یہ تمثیل پیش کی گئی جو مسلسل کئی راتوں تک دکھائی جاتی رہی۔ خود شکسپیر کا کوئی ڈرامہ اتنے دنوں تک نہیں چلا جتنا کہ سلومی۔ مجنوں گورکھپوری نے اس کا ترجمہ "سالومی" کے نام سے اور شاہد احمد مدیر ساقی نے سلمیٰ کے نام سے کیا۔ گو وائلڈ کی اسلوبی نزاکتیں ترجمہ کی متحمل نہیں ہوسکیں مگر مترجمین نے کوشش کی ہے کہ اصل ڈرامہ کا کوئی پہلو بھی مجروح نہ ہونے پائے۔

ارنسٹ کے نام سے تمکین اور سعیدی صاحبان نے ترجمہ کیا۔ ترجمہ توجیہہ کا محتاج تھا۔ موجودہ صورت میں قابل اصلاح ہے

البن۔ البن جدید مغربی ڈرامہ کا جد اعلیٰ ہے جس کا زبردست مداح اور مقلد شا ہے۔ البن فنی کارگذاریوں سے زیادہ سماجی مسائل کو قبول پذیر انداز میں ڈرامہ کے ذریعہ پیش کرنے میں مشہور ہے۔ مروجہ اخلاقی اصولوں سے انحراف۔ شدید انفرادیت۔ سماجی امتیازات، منافقت سے نفرت اس کی ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے بجا طور پر یہ فلسفی ڈرامہ نگار کہلانے کا مستحق ہے۔

اب تک اس کے صرف ایک ڈرامہ کا ملخص ترجمہ ہوا ہے۔ مترجم فضل الرحمن ہیں۔ اس ڈرامہ کو انجمن ترقی ڈرامہ حیدرآباد نے اسٹیج کیا۔ مگر کامیاب نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ جہاں ڈرامہ کی غیر معمولی سنجیدگی تھی جس کے عوام عادی نہیں۔ وہیں ڈاکٹر جاہد کے کردار کا عدم ارتقا ہے۔ اصل ڈرامہ کی کرداریت کو ترجمہ میں نباہا نہیں گیا۔

برنارڈ شا:- برنارڈ شا زمانہ حال کے ان چند متفکرین میں سے ایک ہے جنھوں نے عصر حاضر کے دماغ پر اپنی اشتراکی تعلیمات سے اثر ڈالا ہے یہ ایک مفکر ہے ڈرامہ اور اسٹیج کو اصلاح کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کے ڈرامے مقالے ہوتے ہیں جس میں سماجی۔ مذہبی۔ سیاسی ادبی اور مختلف النوع مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ پلاٹ اور کردار سازی سے زیادہ یہ مکالموں کے زور سے ڈرامہ کو کامیاب بناتا ہے ہجو اور سخت طنز اس کی خاص خصوصیت ہے۔

اس کے تین ڈراموں کے ترجمے اُردو میں ہو چکے ہیں۔

(۱) جون اف ارک۔

(۲) آغاز ہستی۔ بیاک ٹو میتھو سلا کے ابتدائی باب کا لفظی ترجمہ ہے۔ مترجم مجنوں گورکھپوری ہیں۔ اصل ڈرامہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں افرنیش کائنات۔ ہبوط۔ آدم اور مسئلہ ارتقا سے بحث کی گئی ہے اگر مترجم صاحب ڈرامہ کے ساتھ ہی شا کے مقدمہ کا ترجمہ بھی کر دیتے تو ڈرامہ کے زیر بحث علمی موضوع کے سمجھنے میں قارئین کو بڑی مدد ملتی۔

(۳) ہوش کے ناخن۔ شا کے سب سے پہلے ڈرامہ کا ملخص ترجمہ ہے۔ مترجمین راقم الحروف اور میر حسن ایم۔اے ہیں۔ اس ڈرامہ کو اس انداز میں ملخص کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ موجودہ حیدرآبادی زندگی پر منطبق ہو سکے۔ پہلی دفعہ جامعہ عثمانیہ میں اور بعد میں پبلک اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ ڈرامہ کی کامیابی کا راز بندہ علی کی ٹھیٹ دکھنی بولی اور مقامی رنگ میں ہے۔ جس کا اثر بعد کے ڈراموں پر بھی پڑا۔ یہ ڈرامہ طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

گالسوردی۔ دور حاضر کے سنجیدہ نگاروں میں پیش پیش تھا یہی ایک ایسا انگریز انشا پرداز تھا جس نے بہ یک وقت ناول اور ڈرامے کامیابی کے ساتھ لکھے۔ اس کے ڈرامے مسائلی اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے دو ڈراموں کے ترجمے اُردو میں ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی اکاڈمی کو اُردو ڈرامہ کے فروغ کا بھی خیال ہے۔ اس ادارہ سے ناتن کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ یہ دوسرا ترجمہ گالسوردی کا ہے۔ ترجمہ ,,فریب عمل،، کے نام سے جگت موہن لال رواں نے کیا ہے جو ہندوستانی اکاڈمی سے شائع ہو چکا ہے ترجمہ قابل اعتراض ہے جس کا اعتراف خود اکاڈمی کے سکریٹری تاراچند نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

,,ڈرامہ غلطی سے پاک نہیں ہے،،

(۲) انصاف۔ (Silver Box) کا ترجمہ یحیٰی صدیقی ایم۔اے (عثمانیہ) نے انصاف کے نام سے کیا۔ زیر طبع ہے۔

ایٹس۔ آئرستان کا شاعر ڈرامہ نگار اور عالمگیر شہرت کا مالک ادیب ہے۔ لطیف مذہبی احساسات شاعری اور ڈراموں کا

موضوع ہیں۔ یہ اپنی تعلیمی، سیاسی، شاعرانہ اور حسن کارانہ کارگذاریوں کی وجہ سے ائرستان کی غیر فانی شخصیتوں میں سے ہے۔ ایٹس کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ انیس احمد مارہروی نے "مجمل مرکب" کے نام سے کیا ہے اس ڈرامہ میں واجب الوجود کے مسئلہ کو ذہن نشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے عزرائیل کو خدا کے وجود کو منوانے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ترجمہ اچھا نہیں ہے۔

سامرسٹ ام :- قدیم طرز کا مقلد ہے۔ پامال شاہراہ سے ہٹنا گناہ سمجھتا ہے۔ نہ اس کے ڈرامے علمی مقالے ہوتے ہیں نہ اسے سیاسیات سے دلچسپی ہے بلکہ انگلستان کے متوسط طبقہ کی ہجو اور ان کی کمزوریوں کو پیش کرنا اس کی خصوصیت ہے۔ کردار سازی میں اسے غیر معمولی کمال حاصل ہے۔ اس کے ایک ڈرامہ کو اکبر وفا قانی (عثمانیہ) نے "زندگی" کے نام سے حیدرآباد کی شہری اور دیہی زندگی کے رنگ میں اردو میں منتقل کیا۔ بزم تمثیل حیدرآباد نے اسے کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا۔

میٹرلنک کے حسب ذیل ڈراموں کے ترجمے اردو میں ہو چکے ہیں

(۱) مونا دانا :- از جلیل قدوائی۔

(۲) پردمن وثریا۔ شاہد احمد اور ظفر قریشی۔

(۳) نرگس جمال :- جائزل کا ترجمہ ہے۔ مترجم شاہد احمد۔

مارس میٹرلنک بلجیم کا شہرہ آفاق تمثیل نگار ہے اور جائزل اس کی مشہور تمثیل ہے اس نے بہ حیثیت تمثیل نگار اور فلسفی اپنے نوجوان ہم عصروں پر اچھا اثر ڈالا ہے بعض نے اس کے نظریوں سے مفید نتائج پیدا کئے اور بعض عدم استطاعت کی وجہ سے بھٹک گئے۔ اس کے ڈرامے عموماً شاعرانہ فلسفیانہ اور استعارانہ طرز کے ہوتے ہیں۔ باطنی کیفیات لطیف محسوسات اور نفسیات کے دقیق مسائل کو مفروضہ انسانی شکلوں کے ذریعہ پیش کرنے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ پیش نظر ڈرامہ استعاروں میں لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے یکسر شعر ہو کر رہ گیا ہے کردار انسان کے چند باطنی احساسات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ جیسا کہ عموماً اس کے ڈراموں میں ہوتا ہے مکالموں کے ذریعہ ماحول اور فضا پیدا کی گئی ہے۔ یہ خود اپنے ڈراموں کو بیانی اور محاکاتی کہتا ہے اس ڈرامہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پلاٹ میں ہر جگہ ڈرامائی کش مکش اور حیرت آمیز انتظار موجود ہے۔

میٹرلنک شاہد صاحب کا محبوب ڈرامہ نگار ہے تمام ترجمے رفتہ اور شستہ ہیں۔

متذکرہ بالا بیانات کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جدید دور کے آغاز کے ساتھ ہی اردو میں اچھے ڈرامے پیدا تو

ہوئے مگر ان میں طبعزاد کے مقابلہ میں تراجم اور تلخیص کا پلہ بھاری ہے۔ سوائے چند ڈراموں کے باقی سب مغرب کے اساتذہ کے ڈراموں کے وہ ترجمے ہیں جن کا مرتبہ خود مغربی ادب میں لازوال ہے۔ مغربی ڈراموں کا یہ حسنِ انتخاب اُردو زبان کی زندگی کا پتہ دیتا ہے ہر زندہ زبان کو ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں تراجم کے دور سے گذرنا ضروری ہے۔ آزاد۔ آبجی اعلیٰ ادب کی تخلیق میں بھی سرمایہ محرکات کا کام دیتا ہے۔ اس ضمن میں موجودہ کوششیں ہمت افزا ضرور ہیں مگر اب بھی ہزاروں ایسے شاہکار ہیں جو اُردو کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو سمیٹنے کے لئے علاوہ انفرادی پریشان ہاتھوں کے ایک منظم اور اجتماعی ہاتھ کی بھی ضرورت ہے۔ مغربی ادب کے شاہکار تراجم کی تجویز انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد کے پیش نظر ہے۔ اگر یہ عملی صورت اختیار کرلے تو اس سے جو استحکام اُردو ادب کو حاصل ہوگا وہ ظاہر ہے۔

ڈراموں کی ترقی، ارتقا و فروغ میں حصہ لینے والے قومی اداروں میں ہندوستانی اکاڈمی اور جامعہ ملیہ بہت ممتاز ہیں۔ اوّل الذکر نے صرف دو ترجمے شائع کرکے نہ معلوم کیوں خاموشی اختیار کی مگر جامعہ ملیہ کی کوششیں تاریخ ڈرامہ میں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھی جائینگی خوش قسمتی سے جامعہ ملیہ کو ڈاکٹر عابد حسین۔ پروفیسر مجیب۔ اشتیاق حسین قریشی اور عبدالغفار جیسے قابل افراد مل گئے ہیں جو ڈرامائی ادب کی تخلیق میں ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ملک میں متین اور سنجیدہ ڈرامائی ذوق پیدا کرنے میں اس ادارہ کا بڑا حصہ ہے۔

جامعہ ملیہ کے ڈراموں کی، مابہ الامتیاز خصوصیت ان کی اصلاحی اور غیر جمالیاتی روش ہے جیسا کہ برناڈ شا کا خیال ہے معبدوں کا کام اسٹیج سے لیا جانا چاہئے۔ اس ادارہ میں ڈراموں سے کم ازکم وہی کام لیا جارہا ہے۔ یہاں کے ڈرامے سیاسی۔ مذہبی اور معاشرتی مسائل پر مبنی ہوتے ہیں مگر انتہائی زاہدانہ انداز میں کونین بھی کھلائی جائے مگر شکر میں لپیٹ کر تاکہ خوشگواری سے نگلی جاسکے۔ خالص اصلاح کی گولی بغیر ردمان اور ظرافت کی چاشنی کے قوم کے حلق سے نہیں اُتر سکتی۔ اس نفسیاتی گر کے انحراف سے ڈرامہ نگار کو ناکامی کی صورت دیکھنا پڑتی ہے اور ڈرامہ کا حقیقی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

جامعہ ملیہ کے ڈراموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان میں سے بعض ڈرامے مثلاً پردۂ غفلت۔ ہمزاد۔ صید زبوں اور انجام حیدرآباد کے اسٹیج پر مقامی بزموں کی جانب سے پیش کئے جاچکے ہیں۔ جس سے اس امر کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض ڈرامے اسٹیج کو پیش نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے جس کی اچھی مثال پردۂ غفلت ہے۔ اس ڈرامہ میں مصنف نے مکالموں کے توازن کا مطلق خیال نہیں رکھا۔ جیسے کسی ڈرامہ کی کامیابی کا دارومدار اور چیزوں کے علاوہ اداکار پر ہے۔ بالکل اسی طرح ایک اچھے اداکار کی

کامیابی خود ڈرامہ کے مکالموں اور ایکشن کے مواقع پر منحصر ہے۔ اگر کسی ڈرامہ میں چھ چھ صفحوں تک ایک ہی کردار اپنی رام کہانی سناتا چلا جائے تو ایکٹر سے قطع نظر تماشائیوں کا کیا حال ہو۔ پردہ غفلت میں تماشائیوں کی صبر آزمائی اور ایکٹروں کی ناکامی کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ ڈرامہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی تصنیف ہے۔ گوئٹے کے فاسٹ کا آپ نے راست جرمن سے ترجمہ کیا ہے اس کے علاوہ بچوں کے لئے ایک ڈرامہ "شریر لڑکا" لکھا جو جامعہ ملیہ میں اسٹیج کیا گیا۔

پروفیسر مجیب کے ڈرامے بھی اصلاحی اور حد درجہ خشک ہیں۔ ملّا اور مذہب آپ کا موضوع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے ڈرامے ایک ایسی خانقاہ معلوم ہوتے ہیں جہاں عورت کا خیال بھی نہیں کیا جاسکتا۔

دو ڈرامے "کھیتی" اور "انجام" آپ کی کاوش دماغ کا نتیجہ ہیں کھیتی میں ہمارے مذہبی پیشواؤں کی جو گندم نما جو فروش ذہنیت اور قومی کاموں میں ان کے ذاتی اغراض کی وابستگی معصوم پرجوش نوجوانوں کا قومی خدمت کے چکر میں ان بزرگوں کے دام فریب میں آنا اچھے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور "انجام" ایک راشی وظیفہ یاب حاکم عدالت کے ملامت زدہ ضمیر کا نفسیاتی مطالعہ ہے اس ضمن میں درگاہ کے متولیوں ملّاؤں اور مشائخین کرام کی ابلہ فریبیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ ڈرامہ باوجود رومانی اور ظرافتی عناصر سے معریٰ ہونے کے اسٹیج پر پڑھنے سے زیادہ دلچسپ اور کامیاب ہے ضعیف العقل لڑکے کا کرداریوں پڑھنے میں بے معنی معلوم ہوگا مگر اس کی اصلی خوبیاں اور کردار کی اداکارانہ نزاکتیں اسٹیج ہی پر نمایاں ہوسکتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ڈرامہ کی دلچسپی بہت متوازن ہوگئی ہے۔

اشتیاق حسین قریشی اس ادارہ کے سرگرم کارکن ہیں جنھیں اردو ڈرامہ کی ترقی کا خاص خیال ہے۔ آپ ڈرامہ کو موسیقی اور شعریت سے بے نیاز ایک آزاد فن مانتے ہیں۔ اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ الفاظ کی موسیقی اور مکالموں کے جوش اور قوت کو نظرانداز کیا جائے۔

"نقش آخر" کے علاوہ ان کے تمام ڈرامے معاشرتی مسائل پر مبنی ہیں جن کا مقصد اصلاح ہے۔ چھوٹے چھوٹے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھتے ہیں جن کی زبان صاف سیدھی سادھی ہوتی ہے۔ کردار موجودہ زندگی ہی سے منتخب کرتے ہیں۔

حسب ذیل ڈرامے قریشی صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔

(۱) علم اسود :۔ جدت موضوع کے لحاظ سے امتیاز رکھتا ہے خیر و شر نفس اور ضمیر کی کش کش اور انسان کے باطنی متضاد جذبات کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے۔

(۲) گناہ کی دیوار :۔ اس کا موضوع کسبن کی زندگی ہے اس امر کے اظہار کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کی گناہ آلود زندگی اختیاری نہیں بلکہ چند عیار بدمعاشوں کی چالاکی کا نتیجہ ہے۔

(۳) ہمزاد :۔ قریشی صاحب کا واحد کامیاب ڈرامہ۔ اس ڈرامہ میں کمسن بیوی اور مسن شوہر کے تعلقات اور اس کے نتائج سے کنائیتاً اصلاح کا پہلو موثر انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔ اقامت خانہ جامعہ عثمانیہ میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

(۴) صید زبوں :۔ مذہبی اصلاحی ڈرامہ جس میں طلاق اور خلع کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

(۵) نقش آخر :۔ اس ڈرامہ میں غدر کی داستان بیان کی گئی ہے پورا ڈرامہ غدر کے ماحول میں بہادر شاہ کے ایک درباری مصور میر عاشق کے خاندان کی تباہیوں پر مشتمل ہے۔

غدر اور تباہی کے مناظر اسٹیج پر نہیں بلکہ مختلف کردار کے ذریعہ دوران مکالمہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کے اکثر و بیشتر واقعات اسٹیج پر من و عن پیش نہیں کئے جاسکتے اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ڈرامہ نویس صرف بیانیہ طریقہ پر قانع ہو جائے چنانچہ اس ڈرامہ میں بھی فوجوں کی بغاوت۔ شہر کی تباہی۔ عوام کی پریشانی۔ لوٹ کھسوٹ غرض کہ پوری داستان غدر قصہ کے طور پر بیان کی گئی ہے۔ مگر چند کردار کا اسٹیج پر بیٹھ کر اسٹیج سے باہر کے واقعات کی رپورٹ کر دینا ہی ڈرامہ نہیں کہلایا جاسکتا کشمکش جذبات ڈرامائی لمحات اور پلاٹ نہ ہونے کی وجہ سے ڈرامہ بے جان اور غیر دلچسپ ہو گیا ہے۔ اگر اس میں قصہ ہی کو اہمیت دینا منظور تھا تو ضروری تھا کہ مکالمہ کو چست۔ پر لطف اور دلچسپ بنایا جاتا یا کردار سازی میں حسن کارانہ صلاحیت سے کام لیا جاتا۔ بدقسمتی سے سوائے موضوع کے اس ڈرامہ میں نہ تو قصہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے نہ مکالمہ، نہ کردار، البتہ ڈرامہ ختم اچھا ہوتا ہے اور مطالعہ کرنے والے کو ایک گہرے غور و فکر میں چھوڑ جاتا ہے

ان کا تازہ ترین ڈرامہ "نیم شب" ہے جس کا موضوع ۱۹۸۵ء کا ہندوستان ہے۔ اگر ہندوستان میں اس زمانہ میں اشتراکیت کا نفاذ ہو جاتا تو ملک کی کیا حالت ہو گی۔ اور کہاں تک یہ سیاسی اور معاشی مذہب ہندوستان میں کامیاب ہو سکے گا اس میں قدیم و جدید کشمکش کو بتلایا گیا ہے۔

بچوں کے لئے جامعہ ملیہ نے حسب ذیل ڈرامے شائع کئے۔

دیانت :۔ از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

شریر لڑکا :۔ از ڈاکٹر عابد حسین خاں

محنت :- از مولوی عبدالغفار مدھولی

اسکول کی زندگی :- " " "

بچوں کا انصاف :- " " "

قوم پرست طالب علم :- " " "

حیدرآباد :- حیدرآباد میں ڈرامائی تحریک کے دو دور گذرے ہیں ایک تو ۱۹۰۵ء کا اصلاحی اور دوسرے جامعہ عثمانیہ کے قیام کا جدید ترین دور۔ شوقیہ انجمنوں کے علاوہ گذشتہ دور میں یہاں اور پیشہ ور کمپنیاں بھی قایم تھیں جن میں حسب ذیل مشہور ہیں۔

(۱) ڈراماٹک کلب :- یہ حیدرآباد کی مشہور تھیٹریکل کمپنی تھی یوسف مارکٹ علاقہ سالار جنگ میں قایم ہوئی جسو، انجینی، اور بھکن مشہور ایکٹرسیں تھیں۔ کمپنی کے مالک احمد حسین صاحب تھے۔ اور ڈرامہ نگار امیر حمزہ، ان کے مشہور ڈرامے "اندر سبھا" اور "سحر سامری" ہیں۔

بال روم :- منتظم ابراہیم صاحب اور اس کمپنی کی مشہور ایکٹرس موتی تھی۔ گل باغ ترپ بازار میں قایم ہوئی۔

دال منڈی :- سدی عنبر کے بازار میں قایم ہوئی تھی۔ جگیا منتظم تھے۔ محبوب۔ مقبول ایکٹرس تھی۔

مدنی نواب کی کمپنی :- اس کمپنی کے مالک اور منتظم مدنی نواب تھے۔ حال حال تک یہ کمپنی اپنے ڈرامے پیش کیا کرتی تھی۔ اب ٹوٹ چکی ہے۔ مدنی نواب بڑے اولوالعزم کاروباری اور فن ڈرامہ اور اسٹیج کے سرپرست رہے ہیں۔ یہ کمپنی حیدرآباد کے علاوہ بربار، ہندوستان کے دوسرے شہروں میں دورہ کرکے اپنے تماشے دکھلایا کرتی تھی۔ یہ کمپنیاں ڈراموں اسٹیج کی منظریت اور اداکاری کے اعتبار سے پیش رو پارسی کمپنیوں کی پیرو تھیں۔

حیدرآباد کی جدید ترین تحریک ڈرامہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد سے شروع ہوتی ہے گو اس سے پہلے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی شوقیہ انجمنیں جو شکسپیر کے انگریزی ڈرامے کیا کرتی تھیں موجود تھیں جب جامعہ میں اردو ڈرامے اسٹیج کئے جانے لگے تو ان انجمنوں کے ایکٹروں اور قائدوں نے اردو ڈرامہ کی اداکارانہ انجمنیں قایم کیں۔

اس وقت حسب ذیل ادارے فن کارانہ ترقی میں مصروف ہیں۔

بزم ڈرامہ جامعہ عثمانیہ

۱۹۳۱ء میں اس انجمن نے سب سے پہلے ایک ڈرامہ "کالج کے دن" مصنفہ عزیز احمد عثمانیہ یوم کلیہ کی تقریب کے موقع پر

پیش کیا جس کے ساتھ مولوی وہاج الدین کا ڈرامہ "نکاح بالجبر" بھی شامل تھا۔

۱۹۳۲ء میں گوئٹے کے شہرہ آفاق ڈرامہ فاسٹ (اردو) کو اس انجمن نے دوسرے سال زیادہ اہتمام کے ساتھ پیش کیا منظروں کی تیاری میں انجمن نے خاص حسن کارانہ ذوق کا ثبوت دیا جس پر خاصہ روپیہ صرف کیا گیا تھا۔

۱۹۳۳ء میں تیسرے سال اس انجمن نے ڈرامہ "ہوش کے ناخن" جو راقم الحروف اور میر حسن صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ) کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھا پیش کیا۔ پہلی دفعہ اس ڈرامہ میں مقامی بولی کی نمائش کی گئی تھی جس کی وجہ سے زیادہ واقعیت پیدا ہوگئی اور ڈرامہ کو مقبول بنانے میں مدد ومعاون ہوئی۔ حیدرآباد کے پبلک اسٹیج پر بھی پیش کیا جا چکا ہے اور دو ڈرامے "پردۂ غفلت" از ڈاکٹر عابد حسین اور "بہزاد" از اشتیاق حسین قریشی بھی جامعہ ہی میں کامیابی کے ساتھ پیش کئے گئے

ان ڈراموں کی کامیابی نے ڈرامہ اور اداکاری کا عام شوق پیدا کیا۔ جامعہ سے باہر چند انجمنیں قایم ہوئیں جن کے ارکین جامعہ کے موجودہ اور سابقہ طالب علم ہی ہیں۔ مقامی تعلیم یافتہ طبقہ کی سرپرستی اور ہمت افزائی نے انجمنوں کی کارکردگی میں اضافہ کیا اس تحریک کی وجہ سے نہ صرف اردو ڈراموں میں اضافہ ہوا بلکہ ان کو اسٹیج کرکے ڈرامہ کا حقیقی مقصد بھی پورا کیا گیا۔ اسٹیج کرنے کی تنظیمی قابلیت کے تجربوں کے علاوہ اچھے اداکار بھی اسی دور کی پیداوار ہیں۔

انجمن ترقی ڈرامہ:۔ اس انجمن کی روح رواں فضل الرحمٰن بی۔ اے (آنرس) ہیں۔ ڈراموں کی نوعیت۔ ان کی مقبولیت ڈراموں کو سلیقہ سے پیش کرنے کا طریقہ اور اپنے اداکاروں کی وجہ سے یہ انجمن خاص امتیاز رکھتی ہے۔ تماشے ٹکٹ سے ہوتے ہیں۔ ڈرامہ نگار کو معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔ منتظمین اور اداکار اعزازی ہیں۔ اب تک اس انجمن نے حسب ذیل ڈرامے پیش کئے ہیں

(۱) ظاہر باطن:۔ از فضل الرحمٰن بی۔ اے (آنرز) یہ ڈرامہ شریڈین کے مشہور ڈرامہ "اسکول فار اسکانڈل" کا ملخص ترجمہ ہے جو کئی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔

(۲) غلط در غلط:۔ از عصمت اللہ بیگ۔ یہ ڈرامہ گولڈاسمتھ کے ڈرامہ کا ملخص ترجمہ ہے۔

(۳) نئی روشنی:۔ از فضل الرحمٰن۔ شریڈین کے دوسرے نامور ڈرامے "رائی ولس" کا ملخص ترجمہ ہے حیدرآباد کا یہ مقبول ترین ڈرامہ ہے جو متعدد مرتبہ اسٹیج کیا گیا۔

(۴) حشرات الارض:۔ از فضل الرحمٰن۔ البن کے ڈرامہ کا ملخص ترجمہ ہے۔ گذشتہ صفحات میں اس پر بحث کی جا چکی ہے

بزم تمثیل:۔ اس بزم کے روح رواں اکبر وفاقانی بی۔ اے (عثمانیہ) ہیں جنھیں آرٹ سے بہت شغف ہے۔

آپ ایک نیم ماہی رسالہ "حسن کار" کے مدیر بھی ہیں۔ جو ملک میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے۔

سب سے پہلے اس بزم نے عزیز احمد (عثمانیہ) کا لکھا ہوا ڈرامہ "مستقبل" پیش کیا۔ بعد میں اکبر وفا قانی صاحب کے دو ڈرامے "زندگی" اور "زمانہ" اسی بزم نے پیش کئے۔

ان کوششوں کے علاوہ حیدرآباد میں ابھی ایسے نوجوانوں کا انتظار ہے جو اپنی تجارتی اور کاروباری اولوالعزمیوں سے جدید ڈرامہ اور اسٹیج میں مطابقت کرکے اسٹیج میں جان ڈال دیں۔ باوجود سینما کی مسابقت کے حیدرآباد میں امرا، روسا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی ہمت افزائی اور سرپرستی کی وجہ سے اس کے امکانات موجود ہیں کہ بالکل جدید نظریوں اور ساز و سامان کے تھیٹر بنائے جائیں اگر یہ ہوجائے تو اردو ڈرامہ کی ترقی کی راہیں کھل جائیں گی اور اسی وقت ڈرامہ اپنے اصلی برکتوں سے معاشرہ پر اثر انداز ہوسکے گا۔

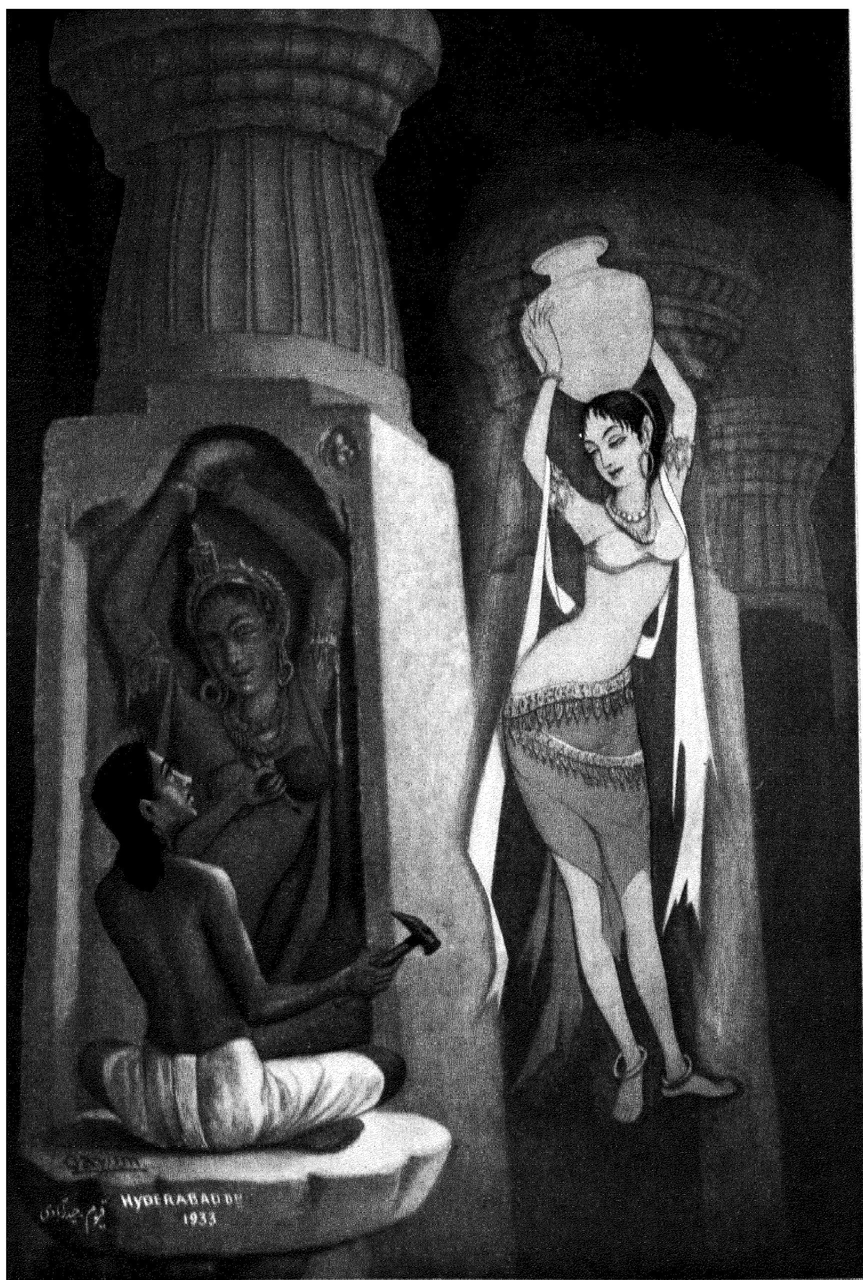
مخدوم محی الدین ایم۔ اے (عثمانیہ)

قوم، سماج اور ادب کی بہبودی کی سوگند جب تک ہر انسان نہ کھائے گا، اس وقت تک دنیا کا مستقبل روشن نہیں ہوسکتا۔ ایک سماجی انقلاب نسبتاً بہت زیادہ اہم ہے اور اس کے بغیر ادبی انقلاب کی کوئی حقیقت نہیں۔ ارتقا اگر رقص ہے تو انقلاب اُس کی حرکت ہے۔

(ڈے لیوس)

اجنٹہ

حسن کی بیداریاں ہیں خواب کے آغوش میں سحر ہے موسیقیوں کا منظر خاموش میں
حسن کے جادو پہ، یہ رنگینیوں کا ہی نقاب پردۂ تصویر میں رقصاں ہی یا موجِ شراب
ہو زمیں پر چرخ سے قوسِ قزح آئی ہوئی یا شباب و شعر کی ہیں مستیاں چھائی ہوئی
سادگی میں ہے فرشتوں کے تبسم کا نکھار چومتی ہیں جس کو حوروں کی نگاہیں بار بار
اس کی رفعت میں ہے عزمِ مستقل کی رفعتیں اس کی عظمت میں ہیں جوشِ زندگی کی عظمتیں
اس کی خاموشی پہ مضطر محشرِ خاموش ہے اس کے افسانوں کا ہر پہلو سراپا جوش ہے
اس کی رونق دیکھ کر حیران ہوتی ہے نگاہ عاشقوں کا دل ہے یا یہ حسن کی ہے بارگاہ



BIRTH OF AJANTA.

اس کے سائے میں کوئی اعجاز ہی سویا ہوا　　اس کی رنگینی میں ہے ذوقِ نظر کھویا ہوا

اس کے ہر گوشے میں مخفی رازِ ہست و بود ہے　　اس کی وسعت میں ثباتِ ذوق لامحدود ہے

یہ تقدس آفریں تہذیب کی ہے یادگار　　جھومتی ہے جس میں فردوسِ تخیل کی بہار

موم کی مانند پگھلایا تھا جس نے سنگ کو　　نغمۂ خاموش میں ڈھالا تھا جس نے رنگ کو

ذوقِ شعری کے لئے یہ کائنات حسن ہے　　اس کے ہر پہلو میں خوابیدہ حیاتِ حسن ہے

صبح کو پھرتی ہے اٹھلاتی ہوئی موج نسیم　　اپنے دامن میں لئے رنگین پھولوں کی شمیم

اس کے کیفِ حسن پر قربان کرنے کے لئے　　اس فضائے خلد میں دم بھر ٹھہرنے کے لئے

چھاؤں میں پڑتی ہیں یوں خورشید کی پرچھائیاں　　جیسے لیتا ہو کوئی مست شباب انگڑائیاں

اکتسابِ نور کو آتی ہیں کرنیں ماہ کی　　اس کی تاریکی میں بھی طلعت ہی جلوہ گاہ کی

ذرہ ذرہ رفعتِ تخئیل کی تفسیر ہے　　ارض کی بنیاد پر فردوس کی تعمیر ہے

عظمت ماضی ہے ان رنگین غاروں میں نہاں

حسن کی تخلیق ہے ان یادگاروں میں نہاں

زلف کی کالی گھٹاؤں میں ہے ارمان حجاب
ماہتاب حسن کی کرنیں ہیں لیکن بے نقاب

موجِ مے کی طرح بل کھائی ہوئی پتلی کمر
تال کے جل سے بھری مٹی کی گگری دوش پر

آنکھ میں مستی، نظر میں سحر، ہونٹوں پر سکوت
سر سے لے کر پاؤں تک معصوم فطرت کا ثبوت

ایک دوشیزہ کھڑی ہے پیکرِ معصومیت
جس سے منظر بن گیا ہے منظرِ معصومیت

یاد میں بیٹھا ہے "پی"، کی اک سراپا آرزو
ہے شرارِ زندگی جس کی ادائے جستجو"

جس کے ذوق بندگی میں ہے خدائی کا ظہور
جس کی خاموشی میں ہے تفسیرِ آتش زارِ طور

ان سراپا زندگی غاروں میں ایسے شاہ کار
جن کی خوبی میں ہے اظہارِ کمالِ حسن کار

دیکھنے والوں کو دیتے ہیں پیام زندگی
آنے والوں کو بتاتے ہیں مقام زندگی

میکش

پریم نگر کی رومانی کرنیں

اللہ اللہ حیدرآباد کی شان تو دیکھو۔ اس دیار کی بنا ہی پیت کی ریت ہے۔ اگلے زمانے میں ایک بادشاہ زادہ تھا جس نے ایک دن مجرا سنا۔ بزم میں نئی گائن آئی تھی۔ اُس پر نظر پڑی تو دل میں بجلی کوندی ع

آنکھوں میں جگمگا اُٹھے یہی زمین و آسماں !

یہ دیکھ کر دماغ نے ٹوکا:- شہزادے! یہ سمجھ داری کی بات نہیں۔ بھلا گانے والی کہاں؟ شاہانہ پیار کہاں؟ مگر دل نے کہا: نہیں! یہ پیت کی ریت ہے۔ یہاں میں اور تو کا نہ کو رہی نہیں۔ آؤ شہزادے۔ قدم بڑھاؤ۔ من کا بیٹا بن کر کیا لوگے۔ بادشاہزادہ دل کے کہنے میں آگیا۔ اب وہی گانا جو کچھ دیر ہوتا۔ آج گھڑی بھر رات گئے شروع ہوا تو سحر ہوگئی۔ اصل یہ ہے کہ راگ دل کی زبان ہے، جو دل کے ہی کانوں سننے کی چیز ہے۔ اور ہند میں تو سنگیت آسمان سے اُتری ہے۔ کہنے کو یہ تال سُر کی نزاکتوں کا تانا بانا ہو۔ مگر یہ نرا وجدان ہے۔ اسی لئے من موہن ہے۔ دور کیوں جاؤ یہی جو دیکھ لو کہ اس میں سات سُر سات چاند تارے ہیں۔ اور ساتوں آسمان طے کر گئے ہیں۔ مثلاً سرگم کا "سا" چاند کا پیارا ہے۔ پہلے آسمان سے اترا ہے۔ تو "نی" زحل دُلارا ہے۔ ساتویں آسمان کی خبر لاتا ہے۔ صوتی انداز کا بھی یہ عالم ہے کہ ان میں کہیں باوری کوئل کی کوک سمائی ہے تو کہیں متوارے پپیہے کی پی کہاں! ایک بزرگ کا قصہ سنا ہے کہ وہ راگ کی تانوں سے من کا مندر چراغاں کرتے تھے۔ یہی مضمون کسی اچھے مصور نے بھی اتارا ہے۔ بہت دن

ہوئے۔ ایک تصویر دیکھی تھی کہ سنسان جنگل ہے جس کی اونچی اونچی پہاڑیوں کو جگمگاتے بادلوں نے گھیر لیا ہے۔ دور دریا بھی بہتا ہو جیسے کسی نے دھانی مخمل پر روپہلی لہریا بنایا ہو! ایک پہاڑی پر خضر صورت بزرگ ترک دنیا کئے، شیر کی کھال بچھائے بیٹھے ہیں سامنے میاں تسدا نگ دو زانو بھیروں راگ الاپ رہے ہیں۔ صبح ہونے کو ہے۔ بنجارہ تارا ابھر آیا ہے۔ پچھلی رات کا چاند ڈوبتا ہے۔ کچھ تارے نظر سے اوجھل ہوئے۔ کچھ اب ہوا چاہتے ہیں۔ اس سمے ان بزرگ کے سیدھے ہاتھ میں تسبیح ہے۔ اُلٹے ہاتھ میں برچھا جس سے خواہش نفس کے ناگ کو زیر کیا ہے۔ جبیں پر نور عرفاں۔ لبوں پر ذکر یزداں۔ اور آنکھوں سے توبہ و استغفار کے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہہ رہی ہے! تو ہاں بزم شاہی میں بھی من کی بنسی بجی۔ لیکن لے دوسری تھی یعنی گانے والی نے راگنی کیا چھیڑی۔ گویا دل سے آہ نکلی جو بادشاہزادے کے دل میں ترازو ہوگئی۔ یوں دل سے دل کو راہ پیدا ہوئی! بات فسانۂ حسن بن گئی "مگر پچھلی رات سے تو بزم کا سماں ہی اور ہو گیا۔ جوں جوں رات گزری، راگ دیپی بھی کھل کھیلی۔ پریم کی آنچ بھی بھڑکی۔ لیکن ادھر سحر کا کھٹکا ہوا۔ اُدھر آرزوئیں مچلنے لگیں کبھی نیند سے منڈتیں۔ شمع شعور بجھتی۔ کبھی راگ کا جادو چلتا۔ من کا جو الاؤ کہ مٹھپتا تھا۔ ایسے وقت میں شمانت راگوں کی آس رحمت باری بن کر برستی ہے کبھی کومل سُروں کی گنگا بہہ جاتی۔ یہی سُر کبھی گہرے ہوتے، کبھی خند بیلے ہو کر ادھر کی لو لگا دیتے کبھی بہار رُت کا سماں کھنچ جاتا۔ اور معلوم ہوتا جیسے کرشن کنہیا جی جھولا بھی جھول رہے۔ بنسی بھی بجاتے جاتے ہیں۔ سُندر گوپیاں انھیں جھولا جھلا رہی ہیں جس کی پینگ آسمان سے باتیں کرتی ہے! خیر تو رات کا گانا کیا تھا ایک گلزار تھا جس میں گانے والی تیتری کی طرح کیاری کیاری مچلتی پھری۔ کسی راگنی سے خوشبو لی۔ کسی کی کلیاں چوم اُڑی۔ پیاری صورت پر پیارا گلا قیامت ہوتا ہے ان معنوں میں بھی یہ گائن قیامت تھی۔ مگر اس کا گانا۔ گانے میں بتانا۔ بتا کر ناچنا، قیامت پر قیامت بن گیا۔ دم میں رلاتی۔ دم میں ہنساتی نہ گانے سے تھکتی۔ نہ آواز میں پتی آتی۔ جہاں ذرا کی ذرا رُکی۔ جی چاہا کہ پھر گائے۔ غرض یونہی بھیروں راگ کا آستانہ آ گیا۔ جہاں بھیروں کے ٹھاٹھ تھے۔ جس کو ظلمن نے اس سج دھج سے چھیڑا جیسے فجر کی رنگین روشنی پھیل رہی ہے اور ایک خوش ادا ابھی ابھی اشنان کر کے پوجا کو آئی ہے۔ گیلے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ گلابی نفیس پوشاک ہے۔

ماتھے پہ بندی　　　ہاتھوں میں مہندی
ہونٹوں پہ مسی　　　آنکھوں میں کاجل

پجارن مندر گئی۔ ہاتھ جوڑے۔ ڈنڈوت کی۔ پھر چمپا کے پھولوں کا ہار مورتی کے گلے میں ڈال دیا! لیکن کب تک؟ مثل ہے کہ رات گئی بات گئی، آخر صبح ہوتی۔ بزم شاہانہ ختم ہوئی۔ گانے والی جانے لگی تو بادشاہزادے نے بلایا۔ پوچھا: تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کی: بھاگ متی

پوچھا: کہاں رہتی ہو؟ عرض کی: حضور ہی کی امان میں ہوں۔ ندی کنارے جس گاؤں کی طرف حضور شکار کھیلا کرتے ہیں۔ وہاں بسلام ہے وہیں دور سے اکثر حضور کے قدم دیکھے ہیں! دیکھنا! آنا کہا نہیں۔ جتنا خیال کو چھیڑ دیا۔ یہ سن کر باشاہزادے کو کہنا پڑا: اچھا کل پھر آئیں گے۔

دوسرے روز کسی سے کہا نہ سنا خاصے گھوڑے پر نکل کھڑا ہوا ندی کے کنارے آیا تو دیکھا بھرپور جا رہی ہے۔ گزر مشکل ہے یہاں ٹھٹکا تھا کہ خیال کھل کھیلا۔ یعنی جھٹ دل سے پیار جس میں حسن کی زیبائی، عشق کی گرمائی سموئی۔ پھر نلک سے مسی ملی شفق کی کی مہندی رچائی اور بھاگ متی کی تصویر اتار دی! اب بادشاہزادہ کیا دیکھتا ہے کہ ندی کے اس پار جیسے بھاگ متی مسکراتی کھڑی ہے، اور کہتی ہے۔

اچھے بادشاہزادے! لہو میں شاہانہ عزم کے ہوتے ندی کیا سمندر بھی کچھ چیز نہیں۔ ہو نہ ہو یہ میرے بھاگ کی خوبی ہے جو آپ نہیں آتے۔ اس خیال سے بادشاہزادہ چونک سا پڑا۔ ایک دفعہ ہی گھوڑے کو ایڑ دی، اور بھری ندی میں اتر گیا۔ بلکہ یہ کہو کہ پار اترا۔ بعد میں ندی پر پل بنا۔ وہیں اک شہر چراغاں ہوا جو بھاگ متی کے نام پر پہلے بھاگ نگر، پھر حیدرآباد کہلایا۔ آپ محبت کا نام لے کر اسے پریم نگر کہیں!

سچ یہ ہے دکن کے سے دیس میں ایسا نگر ہونا ہی تھا جیسے پھول میں خوشبو، آنکھ میں تپلی! کیونکہ خود یہ دیس روانی کرنوں سے پڑا جگمگاتا ہے۔ اس کی ہزاروں باتیں ایسی ہیں کہ واہ وا! مگر اس وقت کہیں سے کچھ کچھ نشان چن لینی ہے جس میں پہلی ہی بسم اللہ مہارانی سیتاجی کی رام کہانی ہے۔ دیکھنا! غرض بھی کیا بری بلا ہے کہ اس میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ سری رام چندر جی کی سوتیلی ماں اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے مہاراجہ دسرت جی کو الٹا سیدھا سمجھاتی ہیں وہ بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ اک اچھے حکمراں کو یہ شایان نہ تھا۔ اس کے نزدیک اپنا تو اپنا پرایا بھی اپنا ہوتا ہے۔ مگر وہ چوکے! اس سے سری رام چندر جی کو بن باس لینا پڑا۔ یہ ان کی بھلمنسائی تھی کہ انھوں نے باپ کا کہنا نہ ٹالا۔ خیر گھر سے بے گھر ہوئے تو انھیں دکن دیس ہی بھایا۔ لچھمن اور سیتا ساتھ ہیں۔ ایک چاہنے والا بھائی گویا قوت بازو کہ بھائی کی خاطر اپنا سکھ چین تج دیتا ہے۔ دوسری چاہنے والی بیوی۔ دکھ سکھ کی ساجھی! لیکن مصیبت تنہا نہیں آتی۔ یہ گھر سے نکلے تو جنگل میں بھی چین نہ پایا۔ پنچ وٹی آتے ہی ایک بھتنی سے پالا پڑا۔ سوروپ نکھا نام تھا۔ سری ناتھ پہاڑ پر رہتی تھی۔ یہ بہذات رام چندر جی کے درپے ہوگئی مگر لچھمن جی عین وقت پر آڑے آئے۔ یہ دیکھ کر بھتنی کے دو بھائی کار اور دوشن حملہ

کرتے ہیں۔ گر مارے جاتے ہیں۔ تیسرے بھائی راون کو خبر ہوتی ہے وہ بڑا لاؤ لشکر لے کر لنکا سے نکلتا ہے اور ہزار جتن کر کے سیتا جی کو لے جاتا ہے۔ بعد میں لنکا پر چڑھائی ہوتی ہے۔ راجہ سگروا بھی مدد دیتا ہے۔ اسی راجہ کا شاہی بانا بندر کی شکل کا تھا۔ جس سے یہ سمجھا گیا کہ لڑائی میں رام چندر جی کی مدد بندروں نے کی تھی! غرض یہ وہ لڑائی تھی جس میں آریوں نے تورانیوں پر فتح پائی۔ سری رام چندر جی کا کردار بنا اور سیتا جی نے بتا دیا کہ شوہر پرستی ان کا ایمان۔ خدا ترسی ان کا دھرم۔ اور عصمت کے مقابلے جان سی عزیز شے بھی کچھ نہیں! ویسے بھی دکن وہ دیس ہے کہ دور دور کے لوگ اس کے دلدادہ رہے۔ کسی نے اس کی طرز تعمیر اڑا لی۔ کسی نے اس سے آداب سیکھے۔ یہاں قطبیہ، بریدیہ اور بہمنیہ سلاطین کا ڈنکا بجا۔ جن میں تانا شاہ کا داغ تو ایک مثل بن گیا ہے۔ یہیں ٹیپو سلطان اور چاند بی بی نے راج رجا۔ جن کے حوصلے اور ناموری کے قصے اب تک بچہ بوڑھے کی زبان پر ہیں اور تو اور ایک زمانے نے اس دیس سے الف۔ ب۔ ت پڑھی ہے کہ تورانیوں نے یہیں ابجد کی ایجاد کی تھی! علمی انداز کا بھی یہ عالم ہے کہ نویں صدی میں تنکلا چاریہ اور بارھویں صدی میں راما نج کا آوازہ بلند ہوا۔ جو آج تک سنائی دیتا ہے یہیں ولی، ظہوری اور ملک قمی پرورش پائے۔ یہیں گیسو دراز خواجہ کی پالکی اتری۔ اسی سرزمین میں خان عالی موت کی میٹھی نیند سوتا ہے اسی خاک پاک سے تاریخ میں انسان کیا؟ "فرشتہ" پیدا ہوا! بس تو یہی رنگ مدتوں اس دیس کے ذرے ذرے پر رچتا رہا۔ آخر نیچر کے سگھڑ ہاتھوں یہ ذرے سمٹ کر اس طرح سالمات بنے کہ سرکار عالیہ آصفیہ کی طرح پڑی۔ یہ طرحدار سرکار حق یہ ہے کہ بڑی سرکار ہے۔ جس کی کو ہماری سرزمین میں زمانے کے نشیب و فراز ہیں۔ یعنی بڑے بڑے دریا، پہاڑ، جھیل، تالاب۔ بڑے بڑے جنگل جہاں کی صبح و شام کے آگے صبح بنارس اور شام اودھ بھی مات ہے۔ موسم بھی بڑے خوشگوار ہیں۔ کیونکہ گرمی میں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی میں زیادہ سردی۔ یہ بات دنیا کے اور ملکوں میں بہت کم ہے گرمی سردی تو خیر جیسی ہے ویسی ہے۔ یہاں کی بہار کو کوئی خوش کلام برقؔ کی نظروں آتا دیکھے تو دل کی کلی کھل جائے:-

اٹھلاتی لجاتی مسکراتی کس ناز سے ہے بہار آتی
بوٹا سا دہ قد بہار کے دن اٹھتی کونپل ابھار کے دن
اتری گلشن میں جب سواری سورج نے آرتی اتاری
شبنم بھر لائی کورے کورے شربت سے گلاب کے سکورے
نہریں ہر پھر کے لائیں پانی سبزے نے بچھایا فرش دھانی

غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں　　　بلبل نے چہک کے دیں دعائیں
بدلی پھولوں نے اپنی وردی　　　اودی، رنگاری، لاجوردی
بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی　　　کویل نے یہ پھیر دی منادی

معشوقۂ گلعذار آئی

آئی آئی بہار آئی ! !

بہار تو پھر بہار ہے۔ یہاں ہر دہان کا کھیت خود اک بہار ہے۔ کیونکہ اسے جب دیکھو آنکھوں میں ٹھنڈک۔ دل میں تراوٹ آتی ہے جب کبھی چاندنی راتیں ہوں۔ وہاں کی بُوباسی فصل کھڑی ہو۔ اس وقت کھیت میں نکلتے چاند کا منظر دیکھنے کا ہوتا ہے کہ چاند کا روشن گرد ائرہ فصل ہے۔ اور ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے سبز پری رُخ سر کھولے چلی آتی ہے ! کوہساری بھی ہے تو یہ مملکت فطرت کا سنگار دان ہی ہے ! بھلا کونسا جوہر ہے جو یہاں نہیں۔ ایک دن یہیں تو کوہ طور، توبہ ! کوہ نور نکلا تھا۔ جسے دیکھ کر آج تک دنیا حیرت میں ہے !! ویسے بھی یہاں "نل دمینتی" کے رومانی پیام سلام ہوئے۔ راج ہنس خوبصورت پیامی بنا۔ یہیں ادب کا ایک "پھول بن" کھلا، "پھولبن" ابن نشاطی کی ایک سجل نظم ہے جسے کہہ کر دو ڈھائی سو برس سے اونچے ہوئے۔ نظم کیا ہے دمکتا ہیرا، چمکتا تارا ہے۔ جس میں سادگی بھی ہے۔ پُرکاری بھی ہے اور جس کا سارا قصہ ایسا گجرا معلوم ہوتا ہے جس میں شاعر نے بڑی رومانی پھول پتیاں گوندھی ہوں۔ مثلاً کہیں زاہد کی بیٹی جلوہ گر ہے جو باپ کی بددعا سے پھول بن گئی تو کہیں سمن بر بادشاہزادی ہے جس کے بشرے پر گل شباب کھلا ہوا ہے !! اس عجمی حسین شہزادی پر مصر کا شہزادہ ہمایوں فال فریفتہ ہو جاتا ہے اور شہزادی کے فراق میں عجم آکر بادشاہ سے شطرنج کھیلتا ہے جس پر جان کی بازی لگتی ہے قصے میں یہ مقام بڑا رومانی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ زندگی کی سچائی بھی لئے ہوئے ہے جیسے مشرق کی قدیم رومانی بزم ادب میں اسی شاہانہ اور اتھاہ کھیل سے اجاگر کیا جاتا ہے کنایہ ہوتا ہے کہ دنیا بھی ایک بساط شطرنج ہے جہاں جان کی بازی ہو رہی ہے۔ مگر غائب ! بازی اُس حکمت اُستاد سے جس کی چالوں کو آج تک کوئی نہیں پہنچا۔ جسے دیکھو یہی کہتا ہے ع

جو یاں ہم چلے سو نہایت بُری چلے !

مگر جوابی ہر چال بچی تُلی، اٹل اور بڑے پردے کی ہے اسی لئے نوع انسان کے دل کی آواز ہمیں ان انمول بولوں میں بھی سُنا دی گئی ہے کہ ؎

مہرۂ شطرنج را انداز با فرزانگی
تو مداں عثماں کہ آساں نیست بازی باختن

ورنہ یاد رہے انسان چوکا کہ مارا گیا! تو بس ایسی ہی رومانی روشنی میں قصہ بڑھتا اور اخیر میں دونوں کے سنجوگ پر تمام ہو جاتا ہے۔ اچھا یہ تلم کا "پھولبن" ہوا۔ یہاں ایک موقلم کا "پھولبن" بھی ہے! یہ اجنتے میں کھلا ہے۔ جہاں نقش درنگ کی پریاں رہتی ہیں۔ کوئی دو ہزار برس ہوئے چند ہندی حسن کاروں نے انھیں اُتارا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن کہ سرکار عالیہ آصفیہ کے شمال مغرب میں یہ دعوت ذوق سجی ہوئی ہے۔ یہ پرستان غاروں میں ہے۔ وہ دیکھو ایک غار میں بڑا سا ایوان ہے جہاں راجہ مسند پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ سر پہ چڑاؤ مکٹ گلے میں بیجنی مالا۔ رانی بڑے انداز سے راجہ کے زانو پر سہارا دیئے بیٹھی ہے۔ داسیاں کھڑی مورچھل ہلا رہی ہیں پاس ایک اور خاتون چٹائی کی سوزنی پر بیٹھی ہے۔ ایوان کے بیچوں بیچ سجا سجایا مندپ ہے۔ جس کے فرش پر ارغوانی پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک فرد ناچ رہی ہے یہ بجلی بسنت پورے آستینوں کی نفیس سیاہ جاکٹ پہنے ہوئے ہے جس پر روپہلی گجائی کے پھول بوٹے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پہ لاکھا۔ عجب دلفریبی کا عالم ہے۔ سیاہ جاکٹ میں سے کندن سا جسم ایسا جھلک رہا ہے جیسے کسوٹی پر سونا! اسی ایوان میں پرے گوشہ پر ایک اور کامنی ناچ رہی ہے۔ جس نے نازک انگلیوں پر ٹھوڑی کو اس سبھاؤ سے رکھا ہے کہ میاں رفائل بھی دیکھا کریں! حسن کاری کے اس پرستان میں یہ اور ایسی بہت سی تصویریں ہیں جنھیں نروان کے رسیاؤں نے بدھ مت کی رینی میں رنگ دیا ہے۔ سو سنج کے نور میں آج بھی ان کی رنگارنگی سے اک گیانی کی الہٰی شان بڑی ٹپکتی ہے۔ اور یہ سندریاں بھگتوں کا وہ رنگین گیت معلوم ہوتی ہیں جن میں شرکتی بھی ہے۔ شانتی بھی ہے۔ اور یہ پیام بھی کہ :-

دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

ان پریوں کو اترے صدیاں ہی گزر گئیں۔ صدیوں کے بعد بھی ان میں جادو کا سا اثر ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ یہ فتوحات فن اعجاز ہیں! اور کیوں نہ ہوں کہ یہ اُس سورما گوتم کے دم قدم کا ظہور ہیں جس نے بادشاہت کو لات مار کر عرفان کی بھیک مانگی تھی! ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر شفق کا ایک رنگ آتا۔ ایک جاتا تھا۔ زمین کی سیج پر رات کی دُلہن انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ اجنتے کی پُر سکون چٹانوں پر اسرار سے منڈلا رہے تھے کہ ہم چند زائرین اجنتے سے موٹروں میں سوار ہوئے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے یہاں کی لال سبز پریاں خیر باد کہتی ہیں خموشی ان کی زبان ہے۔ حسن کاری اُن کا پیام! جو آج تک چتیے سے نہیں اترا! کیونکہ اب تک اُن کی رنگینیاں ذہن میں اس طرح اُبھر آتی ہیں جیسے سطح آب پر کنول کھلتا ہو! بس یہی اجنتے کا جادو ہے اور یہی فن کی سچائی پرکھنے کا گز بھی ہے کہ اس فن نے کیا اثر کیا

اگر اس نے روح کو گرمایا۔ خیال کو اکسایا۔ دل کو ابھارا یعنی آنکھ کان میں الجھ کر نہ رہ گیا تو سمجھو وہ فن سچا ہے۔ ورنہ نرا ڈھکوسلا ہی کیونکہ فن وہی سانچا اور بلند و بالا ہوتا ہے جس سے سوجھ کی پینگ بڑھے۔ جس کی قوت اتھاہ ہو۔ جو سدا دور کی خبر لائے۔ اور بچے بوڑھے، مرد عورت سب کو رجھا کر دلوں پر ایسا نقش چھوڑے کہ مٹائے نہ مٹے! اس کارن زیادہ نہیں شاعری کا ایک بند۔ مصوری کی ایک لکیر موسیقی کی ایک تان بھی دل میں گھر کر جائے تو بس ہے۔ مگر اجنتے میں اس کی بہتات ہے۔ پھر یہاں کی پریاں آپ کو رفعت خیال کی طرف لے اڑیں تو اُن کی مرتبت کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ کیونکہ حسن کاری میں جہاں ایسا موقع آیا تو کہتے ہیں حسن کی دیوی مصور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر تصویر اتروانی ہے۔ پر جبرئیل کا قلم ہوتا ہے۔ دھنک کے رنگ۔ کوثر کا پانی۔ پاؤں فرش زمین پر، اور منہ عرش بریں کے روبرو کہ نور خدا سے دمکتا ہو!! یہاں شام ہوتے دیکھی۔ تو اُس صبح کا بھی خیال آیا کہ اگلا زمانہ ہے اور فجر کی روشنی میں اجنتے کے اللہ والے لوگ اٹھ بیٹھے ہیں۔ پہلے ندی گئے۔ اشنان کیا۔ پھر بار سنگھار کے پھول توڑے۔ پوجا پاٹ کی۔ اور اب اپنے کام پر جاتے ہیں۔ دیکھنا! سب کے بیچوں بیچ ایک بڑے میاں ہیں۔ یہ دھیان گیان کے سجن اور سب کے اُستاد ہیں۔ سوسی کا انگرکھا۔ گزی کی دھوتی۔ سفید گاڑھے کا پگڑ۔ بشرے پر شانتی آنکھوں میں ذکاوت، انھیں سب نے گھیر لیا ہے ایک شاگرد کے ہاتھ میں موقلم ہے، ایک رنگ کی پیالی لئے ہے ایک برابر آکر کچھ پوچھ رہا ہے۔ بڑے میاں محبت سے بتا رہے ہیں دوسرا اس سے لگا لگا چلا آتا ہے کہ یہ ہٹے تو میں پوچھوں۔ سب مندر پہنچے دن بھر اپنا اپنا کام کیا جب اس شوق و خلوص کی بستی سے پلٹے تو ایک جگہ آجمع ہوئے۔ اب کوئی اپنی مشکلات سنا رہا ہے کوئی اپنی کامیابی پر باغ باغ ہے۔ بڑے میاں سب کی سن رہے ہیں۔ صلاحیں دے رہے ہیں۔ کبھی کسی کو سراہتے ہیں کبھی کسی پر جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ اتنے میں شام ہو جاتی ہے تو شفق کی رنگینی میں یہ اپنے ٹھئے ٹھکانے چلے جاتے ہیں۔

بن،، آپ نے دیکھ لئے، کچھ تالاب بھی دیکھئے۔ اب تک تال ہیں تال بھوپال تال مشہور تھا۔ مگر اب نظام ساگر آپ اپنی مثال بن گیا ہے۔ یہ تالاب کیا ہے؟ اچھا خاصہ سمندر ہے۔ ایک وقت عثمانین کا جتھا نظام ساگر پہنچا جس میں اکثر روحانی دنیا کے رہنے بسنے والے تھے کئی دن سیر و شکار میں گزرے۔ آتی گری تھی۔ صبح و شام مزہ دے رہی تھی۔ باقی صاحب اور میں روز سویرے اٹھ کر ساگر کنارے جا بیٹھتے تھے۔ ایک دن دوشیزہ سحر انگڑائیاں لیتی تھی۔ دور آنسودں جیسے تارے جھلملا رہے تھے کہ رنگین سپہر نے شبنم کی ردا اوڑھی! کبھی کبھی مرغابیاں بھی بول اٹھتیں جس سے تالاب میں جان سی پڑ جاتی تھی۔ ایسے سہانے وقت باقی صاحب دل سے باتیں کرنے لگے۔ یہ تو میں نہ سن سکا کہ دل نے ان سے کیا پوچھا؟ ان کا جواب البتہ سنا ہے آپ بھی سن لیں:۔

تا حشر بدلتی نہیں الفت کی نگاہیں   وہ چاہیں محبت کو نباہیں نہ نباہیں

باقی صاحب کہتے ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ:۔

اتنے میں کوئی زہرہ جبیں یاسمن اندام
پانی کی پری، عشق کی جاں، حسن کا پیغام

اک موج کی آغوش سے آئی مرے آگے
اک شمع دل افروز جلائی مرے آگے

کہنے لگی اے تشنۂ آوازِ محبت
سُن حسن کے ہونٹوں سے بھی اک رازِ محبت

اس آب سحر خیز پہ آنکھوں کو بچھا دے
اس عالم خاموش کے ارمان جگا دے

کہسار کے دامن میں ہے ٹھیرا ہوا پانی
دل اور محبت کے سکوں کی ہے نشانی

جاں عشق کے پہلو میں ہے بہتا ہوا دریا
بے تاب ہے ماہی کی طرح اس کی تمنا

محبوب ترا میری طرح نور کی تصویر
ہے گویا نگاہوں میں کوئی حور کی تصویر

ہاتھوں میں اسی طرح لئے شمع محبت
اور زیر قدم ایسی چمکتی ہوئی وسعت

چاہے تو تری عمر کو دامن میں چھپالے
اس شمع کو طوفاں کی ہواؤں سے بچالے

یا عشق کو اُمید کے پہلو میں سُلا کر
پرواز کرے میری طرح اُس کو بُجھا کر

لیکن ایک یہی ساگر نہیں، علی ساگر ہے۔ عثمان ساگر ہے، حمایت ساگر ہے، حسین ساگر ہے جو دیس کو ہریالا بنا رہے ہیں۔ حسین ساگر کی چاندنی راتیں بھی دیکھنے کی چیز ہیں۔ بڑی رومانی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ بسنت رُت تھی چاندنی راتیں، اکبر صاحب (عثمانیہ) سرشام حسین ساگر گئے۔ کچھ دیر میں سوتے تارے جاگ گئے۔ آنکھیں مل مل کے دنیا کو دیکھنے لگے۔ ادھر چاند نے بھی کھیت اور اگنی جل سے نورانی مکھڑا دھو کر:۔

اُٹھتا ہے افق کے بستر سے بادل پہ چلتا آتا ہے
تالاب پہ سایہ ڈالتا ہے جل تھل پہ چلتا آتا ہے

اندھیر تو دیکھو رات کو بھی بادل میں دھوپ اور چھاؤں ہے
اک ماہ لقا کی زلفوں کے ہر بل میں دھوپ اور چھاؤں ہے

ہے نور کا دھندلکا عالم میں نورانی مستی چھائی ہے
پتوں سے چاندنی چھن چھن کر چاندی سے جل پر کائی ہے

ہے جنبش ماتھے پر جل کے لہریں لڑ لڑ کر مٹتی ہیں
اور عکس قمر سے بہہ بہہ کر کیا دودھ کی نہریں چلتی ہیں

یہ رم جھم رم جھم لہریں ہیں، پاجن کی جھم جھم لہریں ہیں
عاشق کے دل کی موسیقی، اشکوں کا تلاطم لہریں ہیں

وہ دور پہ کالے کالے بن اور سامنے اُجلا اُجلا جل
یہ نور کے پیچھے ظلمت ہے یا روشن آنکھوں میں کاجل

غرض ایک طرف سرسبزی کے یہ آثار ہیں دوسری طرف خود شہر دُلہن بن رہا ہے۔ آرائش کے ہاتھوں اس کا وہ وہ سبھاد ہوتا جا رہا ہے کہ نظر لگتی ہے۔ ایک مشفق نے حال ہی میں ہوائی جہاز سے بلدہ کو دیکھا کہتے تھے چوطرف نئے نئے مکانات کا ہجوم ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بگلوں کی اُجلی اُجلی ٹکڑیاں اُتری ہوں! میں کہتا ہوں۔ ان مکانوں میں دیکھنے والا ایک نور بھی چمکتا دیکھتا ہے جو دراصل نورِ علم ہے اور جامعۂ عثمانیہ کے مبارک ہاتھوں گھر گھر پھیل رہا ہے: یہ لکھ رہا ہوں مگر خود بخود ذہن میں وہ رومانی تاریخ اُبھرے آتی ہے جب یورپ اور ایشیا سمدھیانے بنے ہیں۔ بارہ نومبر ۱۹۳۱ء کو حضور شہزادگان والاشان میں سے ایک شہزادے کا بیاہ حضرت عبدالمجید خان ثانی سلطان ترکی کی اکلوتی دختر نیک اختر حضور درشہوار دردانہ بیگم اور دوسرے شہزادے کا بیاہ حضرت سلطان ممدوح کی بھانجی حضور نیلوفر فرحت بیگم سے نیس میں ہوا۔ نیس جنوبی فرانس میں بڑا پُر فضا شہر ہے۔ کہتے ہیں یہ دریائے بیلاں کے دہانے پر ایسے موقع سے آباد ہے کہ کوہ آلپس کی پہاڑیاں اس پر چھتر کئے ہوئے ہیں اور یہاں گلابی جاڑوں میں لوگ تفریح کے لئے آیا کرتے ہیں۔ وہ لیجئے! دونوں شہزادگان والاشان کی برات روانہ ہوئی۔ دیکھنا کیا شاہانہ سج دھج سے جا رہی ہے۔ انگریز امرا کی بھوری بھوری ٹوپیاں، سُرخ سُرخ ترکی ٹوپیوں اور رنگین دستاروں کے ساتھ مل کر کیا بہاریں دے رہی ہیں اطو پہلو تماشائیوں کا ہجوم ہے جو دُلہاؤں کو دیکھنے کے لئے مشتاق ہیں نرم نرم دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ نوشاہ ایک شاندار موٹر کار میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ جو سفید سفید پھولوں کے خوبصورت گجروں اور مہین سفید ریشمین پردوں سے سجا ہوا ہے۔ موٹر کے چار گوشوں پر زرد گلاب کے چار گلدستے بھی لگے ہوئے ہیں۔ نوشاہ ارغوانی رنگ کی شیروانیاں اور زرد رنگ دستار پہنے ہیں جن پر نارنجی پھولوں اور زرد گلابوں کے سرپیچوں کی پھبن ہے۔ آخر دُلہن والوں کے ہاں یہ شاہانہ برات جا اُتری۔ حضرت سلطان ممدوح نے بنفس نفیس نکاح پڑھایا۔ آپ پست قد مضبوط جسم ہیں عمر تقریباً ساٹھ سال ہوگی۔ سر گلا۔ منہ بالا۔ جیسے اللہ کے نور! نکاح کے بعد عام طور پر اُسی دن جلوہ (آرسی مصحف) ہو جاتا ہے اور دولہا دُلہن کو وداع کرا لاتا ہے۔ لیکن ترکوں میں یہ دستور ہے کہ نکاح کے ایک ہفتہ بعد جلوہ (رشادوم) ہوتا ہے۔ یہ وقفہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہمارے ہاں نکاح سے پہلے مانجھے (مائیوں) بٹھا کر دولہا دُلہن کے لئے ایک خاص ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے تاکہ اس طرح تنہا وہ اپنی آنے والی ذمہ داریوں پر غور کر سکیں۔ بارے اُنیس نومبر کی شام کو قصر کارباسل میں یہ رسم بھی ادا ہو جاتی ہے۔ قصر کے دروازوں پر یورپین خواتین کا جمگٹھ ہے جو مشتاق تماشہ ہیں۔ دُلہنوں کی شاہانہ پوشاک

نہایت خوبصورت ہے۔ دونوں دلہنیں خاجی رنگ کے ریشمی لہریئے اوڑھے ہوئی ہیں۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے گلدستے گیسوئیں نارنجی پھول شہزادگان والاشان ہندوستانی ملبوس زیب تن فرمائے ہیں۔ جڑاؤ تلواریں لگائے ہیں۔ پیش خدمت زرق برق وردیاں، زرین پگڑیاں پہنے پھر رہے ہیں۔ غرض آرسی مصحف (جلوہ) ہوا۔ برات گشت کو نکلی۔ اور سات سمندر پار کرتی وطن آئی۔ دولہا دلہن، دلہنا، نامی مرکب آبی میں ہیں۔ جو بدر صاحب (عثمانیہ) کی شاعرانہ نظروں میں رعنائی خیال کی زہرا بنا ہوا ہے۔

خوشا آمد تری اے مایۂ شوقِ جبیں سائی فضائے نیلگوں میں یک بیک زہرا نکل آئی

ترے ماتھے پہ روشن ہند کا ہے نقش آزادی ترے باطن میں پنہاں ہے دکن کی خانہ آبادی

ترے سر پر ہوائیں رحمتوں کی اڑتی آتی ہیں ترے زیر قدم موجیں بھی دھن میں گنگناتی ہیں

"کرا پیش نظر داری؟ چرا مستانہ می آئی؟

فدایت باد دل و جانم عجب ترکانہ می آئی!!"

رومان میں رومان یہ بھی ایک رومان ہے مگر بڑا شاہانہ ہے۔ مثل ہے کہ راجہ کی خوشی پرجا کی خوشی ہوتی ہے۔ اس طرح دیس کا بچہ بچہ مگن ہوا۔ ہر ایک پر گہرا رومانی رنگ آیا جس سے دل و دماغ مدتوں خالی نہ ہوئے۔ آپ جانتے ہیں طبیعت پر یہ سہانا رنگ رچ جائے تو انسان جنت نگاہ، فردوس گوش بن جاتا ہے انہیں دنوں ایک مرتبہ میں قصر شاہی کی سمت سے گزرا صبح کا وقت تھا۔ برکھا رُت تھی۔ آسمان پر روم جھوم گھٹائیں آرہی تھیں۔ کبھی بوندیاں پڑنے لگتیں کبھی تھم جاتیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے رحمتیں منڈلا رہی ہیں برکتیں برستی ہیں۔ کویل بھی کوکتی تھی۔ پپیہا بھی بولتا تھا۔ ندری باغ۔ عدن باغ کی نکہت گل ہوا میں بس رہی تھی۔ اس وقت ارباب والی، روشن چوکی نے بھی شادیانہ چھیڑا۔ دھن میگھ راگ کی تھی جس کے میٹھے سُر دل کھینچے لیتے تھے۔ ایسے سے حسن کا رپکلے نہیں رہتے دیکھتے دیکھتے شہنائی نے ددن کی لی۔ ادھر راگ پھیلا ادھر تانیں مچلنے لگیں جن سے دل کی امنگیں اس طرح ابھرتی تھیں جیسے ساون ماس کی جھڑی زمین کی قوت نامیہ جگا دے! ساتھ ہی نوبت بھی پرن بجنے لگی ابھی دونوں ساز ساتھ تھے۔ ابھی بچھڑ گئے جیسے سنگیت کے دو دھارے یا کیف و سرور کی دو نہریں جدا جدا رواں ہوں اور زور شور میں ہوا سے باتیں کرتی ہوں! مگر چل پہ چل جب ان کا سنجوگ ہوا یا یہ کہو کہ سم آیا تو معلوم ہوا دل مل گئے!!

سید وزیر حسن (عثمانیہ)



سید اشفاق حسین بی-اے (عثمانیہ) مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو

جامعۂ عثمانیہ

مسرت کھیلتی ہے جامعہ کے سبزہ زاروں میں
نرالا کیف ہے عثمانیہ کے مرغزاروں میں

مناظر مست رہتے ہیں یہاں کے کوہساروں میں
ترنم بولتا ہے اس فضا کے شاخساروں میں

مہکتی ہی فضا ہر دم یہاں کے لالہ زاروں میں
تمنا رقص کرتی ہے یہاں کے جوئباروں میں

کبھی صورت خزاں کی دیکھنے پاتا نہیں ہرگز
وہ نخلِ آرزو جو پرورش ہوان بہاروں میں

ہر اک ہی اپنے پائے کا فنون و سائنس میں یکتا
بہت نیوٹن، گرسے، پٹ ہیں نہاں یاں خاکساروں میں

ہوا ہے چار سو شہرہ ہمارے نونہالوں کا
عجب اوصاف ہیں ہمدم ہمارے ماہ پاروں میں

مئے علم و عمل ہے اور ساقی دورِ عثمانی
زہے قسمت کہ نیّر ہیں یہاں کے بادہ خواروں میں

محمد علی نیّر

حیدرآباد کا ایک یادگار مُباحثہ

دنیا کیوں پیدا کی گئی، یہ تو وہی جانے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی۔ لیکن اس سوال کا جواب کہ کیسے پیدا ہوئی، ممکن ہے سائنس دے سکے۔ خواہ اس کے نظریے قیاس آرائیوں کی حد تک ہوں۔

اگر یہ صحیح ہے، کہ سچائی کی تلاش ہی حصول حق کے مماثل ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ دورِ جدید کے سائنس دانوں کی یہ تگ و دو جو بظاہر قدرت کے عمیق سمندروں اور بسیط فضاؤں کی پیمائش میں جاری ہے کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔ تجسس کبھی نہ ختم ہونے والے سوالات کا نام ہے جس کا سائنس سے چولی دامن کا ساتھ سمجھئے پھر اگر یہ ختم ہو گئی تو سائنس کی دوکان بھی اُٹھ جائے گی۔

لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہماری تحقیقات کا دائرہ عمل نہایت تنگ اور اس کی بنیادیں انتہا سے زیادہ متزلزل ہیں۔ صحیح مشاہدوں کی عدم موجودگی میں فیصلہ کن نتائج قایم نہیں ہو سکتے۔ اور تحقیقات میں عملی دشواریاں، ہماری لاچاری اور بے بسی میں روزافزوں اضافہ کرنے لگیں۔ بایں ہمہ وجوہ اگر سائنس دانوں میں اختلاف رائے کی کثرت ہے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ حصول مقصد میں شاید یہ ایک فال نیک ہو۔

ہندوستان قدیم نے کبھی سائنس کی ترقی میں پہل کی ہو تو ہو۔ اب اُس کا ذکر ایک افسانۂ ماضی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا لیکن فی الوقت تو وہ اس میدان میں کہیں پیچھے ہے۔ چنانچہ اوروں تک پہنچتے پہنچتے ممکن ہے اُسے صدیاں درکار ہوں۔

پھر بھی اس عرصۂ قلیل میں دنیا کے آگے ہندوستان نے اپنے کام کا جو معیار رکھا ہے وہ بہرحال اوروں سے پست نہیں۔ اب اس نومولود بچے سے بہت سی توقعات بندھ گئی ہیں۔ اور اگر مسموم ہوائیں اسی طرح کچھ عرصہ تک اس نونہال سے پرے رہیں تو وہ دن بھی آتا ہے جب یہ اپنی پرانی عظمت دوبارہ حاصل کرے گا۔

یوں تو ہند کے سارے صوبوں نے ملک کی علمی تحقیقات میں اپنے امکان بھر اضافہ کیا لیکن شاید اس سے آپ بہت پہلے واقف ہوں کہ بنگال کا اس باب میں زبردست حصہ ہے اس صوبہ نے ہندوستان میں صحیح طور پر سائنٹفک تحقیقاتوں کی داغ بیل ڈالی جو رفتہ رفتہ اتنی مستحکم ہوئی کہ آخر کار اس کے اثرات کے تحت ایک خالص علمی ادارہ قائم ہو گیا جسے رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کہتے ہیں ایسے ادارے ہر متمدن ملک میں موجود ہیں اور ان کے احسانات سے سائنس کا کوئی شعبہ بے نیاز نہیں۔ چنانچہ اس سوسائٹی کا ایک احسان عظیم یہ بھی ہے کہ اس نے ملک کے سارے سائنس دانوں اور سائنٹفک اداروں کو ایک زنجیر میں منسلک کرنے کی کامیاب کوشش کی تاکہ وہ ایک دوسرے کی علمی تحقیقاتوں سے وقتاً بہ وقتاً کما حقہ معلومات حاصل کر سکیں۔ انڈین سائنس کانگرس انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے جس کے سالانہ اجلاس ملک کے تمام صوبوں کا ہر سال دورہ کرتے اور ذیلی کمیٹیاں منعقد کرتے ہیں۔

خوش قسمتی سمجھئے کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد اس سال اس ادارہ کی جولانیوں کا مرکز رہا اور شاید جامعہ عثمانیہ کی تاریخ میں یہ اہم ترین واقعہ تھا کہ اس کی دعوت پر کانگریس کا چوبیسواں اجلاس جامعہ کی نوتعمیر اور دیدہ زیب عمارتوں کے احاطہ میں منعقد ہوا اس موقعہ پر حیدرآباد نے بھی اپنی روایتی مہمان نوازی کا جی کھول کر ثبوت دیا۔ معزز نمائندوں کی رہائش کے لئے اقامت خانوں کی پرشکوہ عمارتیں تھیں۔ ہر قوم کے لحاظ سے بہترین طعام کے انتظامات تھے نہ تھکنے والے عثمانیین رضاکار ان کے لئے جملہ آرام و آسایش مہیا کر رہے تھے اور تفریح کے لئے مضافات بلدہ کا جنت نگاہ منظر ان کے آگے تھا۔

بہرحال اس موقع پر سائنس دانوں نے بھی ان نادر مواقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا طویل کمیٹیاں ہوئیں۔ بصیرت افروز مقالے پڑھے گئے۔ پراز معلومات توسیعی لکچروں کا تانتا بندھا رہا۔ اور مفید ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ لیکن سب سے زیادہ اہم ان مباحث کا سلسلہ رہا جنھوں نے سائنس کی کئی ایک پیچیدہ اور دقت طلب گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش کی نیز ان مباحثوں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں مختلف مضامین کے مجتہدین نے حصہ لیا اور وہ نکات واضح کئے جنھیں علمی تجرہی روشناس کرا سکتا ہے چنانچہ جس مباحثہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ شاید ان سب میں دلچسپ اور مشکل بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس اجلاس کا اہم ترین مناظرہ کہلایا جا سکتا ہے۔

وہ ایک روز پیشتر سے ہی اس بحث کی آنے والی سرگرمیوں کی دھوم تھی اور ہر شخص اس موقع پر موجود رہنے کا خواہشمند تھا۔ اس لئے کہ اس علمی مجادلہ میں دورِ جدید کے چار اہم مضامین ارضیات، نباتیات، حیوانیات اور جغرافیہ زیرِ بحث آرہے تھے پنجشنبہ کا روز اس بحث کے لئے مقرر ہوا تھا نیز یہ کانگریس کے میقات کی آخری تاریخ بھی تھی۔ اس لحاظ سے اس ہفتہ کی ساری دلچسپیاں اسی کے ساتھ ختم ہو رہی تھیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وقت مقررہ سے کچھ قبل ہی لوگ جمع ہونے شروع ہوئے اور ایک بجتے بجتے ہال میں خاصا ہجوم ہوگیا اس اجتماع میں خاص بات یہ تھی کہ یہاں ہر قسم کا آدمی نظروں سے گزر رہا تھا۔ چوڑے میز کے مقابل صدرِ مباحثہ پروفیسر ـــــــــ بصدر متمکن تھے۔ اُن کے آگے ان اساتذہ کا سلسلہ تھا جو اس مباحثہ میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کے پہلو میں مختلف قومیت اور مقامات کے نمائندوں کا گروہ تھا اور سب سے آخر میں ایک خاموش ناظر کسی ڈرے ہوئے بچے کی طرح سہا بیٹھا تھا اور اگر آپ مجھے کسی عصبی بیماری کا مریض نہ سمجھنے لگیں تو عرض کروں گا کہ ان بلند مرتبہ عالموں کی موجودگی نے کمرہ کی فضا میں وہ کیفیت پیدا کر رکھی تھی جو کسی معبد کی چوکھٹ پر قلب محسوس کرتا ہے۔

اس مناظرہ کا مبحث (Wagener) کا وہ مشہور مفروضہ تھا جسے مفروضہ "حرکت انقطاع ارض" کہتے ہیں اور جو ایک عرصہ سے سائنس دانوں میں وجہ اختلاف رہا ہے بات یہ ہے کہ (Wagener) نے ان مسلسل مشکلات کی توجیہہ میں جو ایک عرصہ سے کرۂ ارض کے مشابہ حیاتیہ اور نباتیہ کی ابتدا کے متعلق پیش آرہی تھیں اپنے مفروضہ "حرکت انقطاع ارض" کی بنیاد ڈالی اس کا یہ قیاس ہے کہ کرۂ ارض کے دو براعظم جواب وسیع سمندروں کی وجہ سے علیحدہ ہیں۔ ابتداً قریب قریب اور آپس میں ملے ہوئے تھے اور یہ کہ رفتہ رفتہ ارضی تبدیلیوں نے انھیں دور کر دیا مثلاً آسٹریلیا، ہندوستان، جنوبی امریکہ ابتدا، عالم میں ایک ہی جنوبی براعظم بناتے تھے جو شمالی براعظموں سے ایک زبردست فاصل آب کے ذریعہ علیحدہ تھا لیکن پیچیدہ تبدیلیوں نے اس قطعہ ارض کو آپس میں متصل نہ رکھا چنانچہ اس کے ٹکڑے ہوگئے اور اُن متحرک قطعات نے اپنے کروڑہا صدیوں کے سفر کے بعد جس کی سمت شاید جنوب اور شمال کی طرف تھی وہ صورت اختیار کر لی جسے آج ہم دیکھ رہے ہیں۔

مزید براں اس کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ علیحدگی اور حرکت اب بھی جاری ہے اور اس کی وجہ سے ہمارے جغرافیہ میں عجیب تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔

اپنے مفروضہ کے ثبوت میں (Wagener) نے جو دلائل مہیا کئے وہ واقعی معقول ہیں مثلاً یہ کہ

(۱) اس مفروضہ کے لحاظ سے کرۂ ارض کے مشابہ نباتیہ و حیاتیہ کی ابتدا کی شکل آسان ہو جاتی ہے۔

(۲) نیز یہ کہ اگر موجودہ براعظموں کو آپس میں ملا دیا جائے تو ان کے ساحلی خطوط اس طرح مل جائیں گے گویا وہ ایک ہی قطعہ ارض کے حصے ہیں مثلاً اس کیفیت کو شکل ذیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔



ان براعظموں کی حرکت جس میں ایک عرصہ طویل صرف ہوا جنوب سے شمالی سمت ہوئی۔ اور وہ علیحدہ ہو کر رفتہ رفتہ شمالی سمت میں خشکی سے مل گئے



اس میں شک نہیں کہ اس سے پیشتر بھی ابتدار انواع عالم کی توجیہہ میں ایک ایسا ہی نظریہ پیش کیا جاتا تھا جس کے لحاظ سے یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ موجودہ براعظموں کے درمیان کئی خشکی راستے یا خاکنائے موجود تھے جن کے ذریعہ انواع کی ہجرت عمل میں آئی چنانچہ یہ گمان کیا جاتا تھا کہ ایسے ہی راستے کیمپٹکا اور الاسکا نیز ہندوستان کو جزائر ملایا اور اسٹریلیا سے ملاتے تھے ۔

(Wagener) کا نیا مفروضہ اس نظریہ سے بالکل ایک علیحدہ حیثیت رکھتا ہے لیکن عہد حاضر میں سب سے زیادہ تنقیدوں کا شکار بھی رہا ہے چنانچہ آج کے اجلاس میں واقعات اور مشاہدات کی کسوٹی پر یہی نظریہ جانچا جانے والا تھا پروفیسر Wuest نے مباحثہ کی ابتدا کی اس لئے کہ صدر نشین مجلس ہونے کے علاوہ وہ (Wagener) کے مفروضہ کے ایک پر زور مخالف بھی تھے ۔ استاد مذکور میانہ قد انسان ہیں، مضبوط جسم، مسکراتا ہوا چہرہ اور پست پیشانی ہے ۔ چہرہ سے نوعمر معلوم ہوتے ہیں لیکن عینک ہمیشہ چڑھی رہتی ہے انداز بیان نیز آواز دھیمی ہوتی ہے اور مخاطبت میں اکثر زمین کی طرف نگاہیں ہوتی ہیں پہلی مرتبہ انھیں دیکھا تو خیال ہوا کہ ان نوعمر کاندھوں سے انقطاع عالم کا بوجھ سنبھالا نہ جائے گا ۔

انتہائے سادگی سے جس میں مشرقی صاف گوئی کی جھلک تھی انھوں نے بیان کیا کہ یہ مفروضہ اول تو اس لئے قابل قبول نہیں ہے کہ (Wagener) کوئی ماہر ارضیات نہیں بلکہ ایک عالم موسمیات تھا اس لئے اسے ارضیات کے مسائل پر کافی عبور نہ تھا دوسرے یہ کہ مفروضہ حرکت انقطاع ارض بالکل ناقابل قیاس ہے بنا براں کہ ان قطعات کی حرکت میں جو توانائی صرف ہوئی ہوگی وہ بہت ہی زیادہ ہے اس قدر کہ موجودہ سائنس اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتی ۔ برخلاف اس کے ان کا یہ خیال تھا کہ قدیم مفروضہ جو دو براعظموں کے درمیان ارضی تعلقات کی موجودگی ثابت کرتا ہے زیادہ قرین عقل ہے ۔

اپنی مختصر تقریر کے بعد جب وہ بیٹھنے لگے تو انھوں نے دیگر اساتذہ نیز پروفیسر ساہنی استاذ جامعہ لکھنؤ سے استدعا کی کہ وہ اپنی عالمانہ شہادتوں سے اس بحث پر روشنی ڈالیں ۔

پروفیسر وسٹ بیٹھ گئے تو ڈاکٹر بیربل ساہنی نے اسٹیج کا رخ کیا ۔ ایک دراز قامت ہندوستانی سر سے پیر تک قومی لباس میں نظر آیا آنکھیں بصیرت علم سے روشن ۔ اونچی پیشانی بلند نظری کی دلیل ستواں ناک ۔ متناسب اعضاء یہ اس مشہور سائنسداں کا حلیہ ہے جس پر ملک بجا طور پر ناز کرتا ہے ۔

ایک عالی مرتبہ سائنس داں کے قطع نظر ڈاکٹر بیربل ساہنی کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت ہے آنکھیں پر تجسس ہیں لیکن انتہا سے زیادہ عمیق گویا اپنے اندر معنویت کے ناقابل پیمایش سمندر پوشیدہ رکھتی ہیں ۔ لبوں پر ہمیشہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی ہے جیسے

زندگی ان کے یہاں اتنی سنجیدہ نہیں جس قدر لوگ سمجھتے ہیں۔ یقین مانئے "ڈاکٹر ساہنی کا دل ابھی بچوں کی طرح جوان ہے گو دماغ کو پیر ہوئے زمانہ گزر گیا۔

معلوم ہوا کہ وہ ایک اچھے مقرر بھی ہیں اور حاضرین پر اپنا اثر جمانا خوب جانتے ہیں چنانچہ آتے آتے ہی انھوں نے تختہ سیاہ پر ایک بڑی علامت استفہامیہ بنا دی پھر اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ وہ اس علامت کی قریب ترین وضاحت پیش کریں گے۔

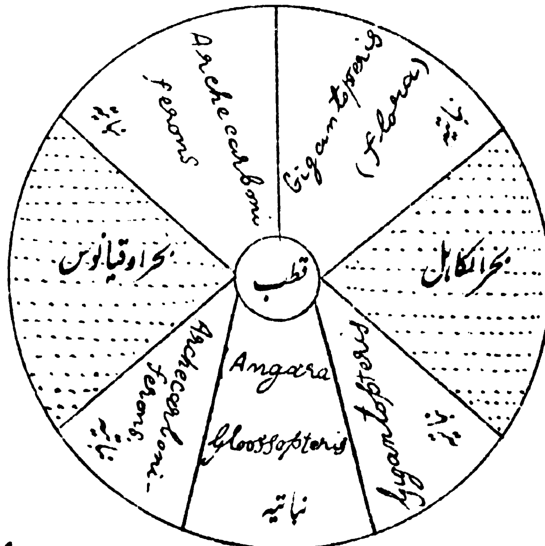
چونکہ اس اجلاس کا مقصد (Wagener) کے مفروضہ کے محض اسی حصہ سے بحث کرنا تھا جو ہندوستان سے متعلق ہے اس لئے ان کی ساری بحث اسی ملک اور اس سے ملحقہ ممالک کی ارضی کیفیات پر منحصر رہی۔

کہنے لگے کہ عہد (Paleozoic) کے رکازی نباتیہ (fossil flora) کے مطالعہ سے ہم دو نتائج اخذ کرسکتے ہیں۔

(۱) مشابہ نباتیہ والے ممالک ایک دوسرے کے مد مقابل سمندروں سے علیحدہ ہیں۔

(۲) غیر مشابہ نباتیہ والے ممالک بالکل ہم پہلو ہیں۔

اگر (Wagener) پر یقین کیا جائے تو ان مشابہ نباتیہ کے ممالک کا مقام عملاً ممکن ہو جاتا ہے نیز ایسی صورت میں کسی خاکنائے کے موجودگی کے تصور کی بھی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی مثلاً



مذکورہ بالا خاکے سے واضح ہوگا کہ (Gigantopteris) نباتیہ بحر الکاہل کے دونوں رُخ اور (Archecarboniferons.)

بحر اوقیانوس کی دونوں جانب واقع ہیں نیز (Glossopteris) نباتیہ اُن کے درمیان۔

اس میں شک نہیں کہ اس سے قبل بھی جنوبی رکازی پودوں کا مذکورہ ممالک کے نباتیہ سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن بدقسمتی سے یہ تدبیر اس لئے بارآور نہیں ہوئی کہ ان رکازی پودوں کی نسبت ہماری معلومات نہایت ناقص تھیں۔

ان کے علاوہ ایک اور دلیل بھی اس حجت کی تائید میں موجود ہے وہ یہ کہ چین اور ساترا اپنے رکازی (Gigatopteris) نباتیہ کے اعتبار کرتے ہندوستان آسٹریلیا وغیرہ کے (Glossopteris) نباتیہ سے بالکل مختلف ہیں۔



ظاہر ہے کہ یہ دونوں نباتیہ مختلف ماحول کے اثرات کے تحت رونما ہوئے ہوں گے یعنی (Glossopteris) نباتیہ ایسے ملک کی آب وہوا میں پیدا ہوا تھا جو زمانہ برف سے ابھی ابھی باہر نمودار ہوا تھا برخلاف اس کے (Gigantopteris) نباتیہ کو گرم آب وہوا کی پیداوار کہنا چاہئے جو اس عہد کے یورپی نباتیہ سے قربت رکھتا ہے کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ایسے دو مختلف و متضاد ماحول کے پودے ایک ہی طول البلد پر موجود ہوں بڑھیں پھلیں پھولیں اور وسیع جنگل بطور باقیات چھوڑ جائیں۔

(Wagener) کے نظریہ کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں خشکی کے حصے ابتدا میں ملے ہوئے نہ تھے بلکہ ایک عظیم فاصل آب اُن کے درمیان حائل تھا۔ سینکڑوں صدیوں کی آہستہ لیکن مسلسل حرکت کے بعد جو مخالف سمت میں وقوع پذیر ہوئی تھی انھوں نے موجودہ صورت اختیار کرلی اور متصل ہوگئے چنانچہ ان کے تصادم کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کی درمیانی سطح ارض بہت بلند ہوگئی

اور غالباً یہی ہمالیہ کی ابتدا ہے۔

اس دعوے کے ثبوت میں پروفیسر واڈیا کی تحقیقات کے نتائج پیش کئے جا سکتے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ کشمیر و آسام کے شمال میں دو سطوح مرتفع کا حال حال میں پتہ چلا ہے شاید ان کا تعلق مذکورہ جنوبی حصے سے تھا۔ مزید براں ان خشکی کے ٹکڑوں کے اتصال کے دوران میں دباؤ کے زیر اثر شمالی طبقے آخر الذکر کے اطراف لپیٹ دیے گئے ملاحظہ ہو شکل ذیل۔



بنا براں (Kingdon ward) کا یہ خیال کہ سلسلہ کوہ ہمالیہ تبت سے چین کی جانب بڑھتا چلا گیا ہے صحیح نہیں بلکہ یہ زنجیر دریائے برہم پتر کی بیرونی جانب ہوتی ہوئی جنوب کے رخ مائل ہو گئی ہے نیز اس بیان کی تصدیق میں نباتیہ موجود ہے۔

ان کے علاوہ پروفیسر ساہنی کے دوران تقریر میں اور بہت سے ایسے دلائل پیش کئے جو بہت ہی زیادہ پیچیدہ اور دقت طلب ہیں اس لئے میں ان کی تفصیلات چھوڑتا ہوں۔

ختم کرتے ہوئے انھوں نے (Gondwana Land) کے برفانی سلسلہ کا تذکرہ کیا۔ پھر ان تمام امور کو دہرا کر کہنے لگے کہ یہ گتھیاں بغیر (Wanegen) کے مفروضہ کی مدد کے کبھی نہ سلجھیں گی۔

ڈاکٹر ساہنی کے بعد مباحثہ کچھ پھیکا پڑنے لگا تھا کہ ایک لحیم و شحیم شخص نے آگے کا رخ کیا یہ کلکتہ کے ماہر حیوانات ڈاکٹر سندر لال ہورا تھے جن میں اس کے سوائے کوئی خاص بات نہ تھی کہ چہرہ اور گردن پر برص کے سفید سفید دھبے نمایاں تھے پروفیسر ہورا زیادہ عمر نہیں ہیں چالیس پچاس کے درمیان ہی ہوں گے۔ لیکن سنا کہ اپنے مضمون میں مجتہدانہ حیثیت رکھتے ہیں، خصوصاً ہندوستانی مچھلیوں پر ان کی تحقیقات بہت وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ آواز نہایت بھاری اور لہجہ وزنی ہے۔ اس مجمع میں اس طرح بولتے تھے گویا سب کچھ وہی اکیلے جانتے ہیں۔

مچھلیوں کی ہجرت کے بارے میں ایک طویل مقالہ پڑھنے کے بعد انھوں نے کہا کہ ہندوستان و افریقہ کی مچھلیوں کے بغور مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان انواع کی ہجرت مشرق سے مغربی رُخ ہوئی بایں وجوہ کہ ان کا مبدا صل ہند چینی کے اطراف و اکناف کا علاقہ ہے اور افریقہ دسیون کی انواع انھیں سے حاصل ہوئی ہیں۔

علاوہ ازیں انواع کی ایسی مشابہتوں کے طویل تذکرے کے بعد جو ماحول کے اثرات کے تحت اور موافق حالات زندگی میں پیدا ہوتی ہیں انھوں نے اشارتاً کنایتاً ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان بر اعظموں کے درمیان خشکی کا کوئی ایسا راستہ ضرور موجود تھا جن کے ذریعہ ان مچھلیوں کی منتقلی عمل میں آئی۔

یہ سلسلہ ابھی ختم ہو رہا تھا کہ پروفیسر اگھارکر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مباحثہ میں حصہ لینے والے سب سے معمر آدمی یہی تھے۔ صاحب موصوف نہ صرف اپنے مضمون میں انفرادی شخصیت کے مالک ہیں بلکہ ان کی خدمات سائنس کانگریس کے سابق معتمد کی حیثیت سے بھی نہایت بلند رہی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ سائنسدانوں میں بچے کی طرح ہر دلعزیز ہیں گویا کہ کوئی اجلاس اگھارکر کی موجودگی کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ شاید اسی لئے وہ اس مباحثہ میں بھی موجود تھے۔

اپنے خاص انداز میں ہندوستان کے مغربی ساحلی نباتیہ پر نظر ڈالتے ہوئے انھوں نے چند افریقی انواع کا تذکرہ کیا جنھیں (Paleo African) انواع کہا جاتا ہے۔ اگھارکر کی رائے میں ان کی ہجرت (Jurassic) یا (Cretaceous) عہد میں ہوئی اور اس کا راستہ شاید عرب کے ساحلی علاقوں پر سے گزرتا تھا۔ اس لئے کہ جنوبی ایران۔ بلوچستان، سندھ اس نباتی تقسیم میں شامل ہیں۔

پروفیسر اگھارکر کے خیالات زیادہ تر ذاتی تجربوں پر مبنی تھے اس لئے باوجود مسلسل کوششوں کے لوگ انھیں بے راہ نہ کرسکے انداز بیان اتنا شگفتہ تھا کہ خشک علمی مسائل میں افسانوں کی دلکشی پیدا ہو رہی تھی اور طبیعت اس پستہ قامت چھوٹے سے انسان کی دلچسپ گفتگو سے سیر نہ ہوتی تھی۔

اپنے پیشروں کے برخلاف اگھارکر اس مفروضہ کے عین موافق تھے کہ ہندوستان ابتدا میں ان جنوبی ممالک سے متصل تھا۔

قصہ یہیں ختم ہو رہا تھا کہ ایک صاحب کرسیوں کی قطاروں پر سے اچکتے چھلانگیں مارتے آگے بڑھے اور منبر کے قریب پہونچ کر تیز تیز جملوں میں کچھ بیان کرنا شروع کیا۔ اول تو کوئی ان کی بات نہ سمجھ سکا اس لئے کہ کانوں سے زیادہ حاضرین کی آنکھیں ان صاحب کی بوالعجب حرکات کے مشاہدے میں مصروف تھیں۔

معلوم ہوا کہ یہ آسام کے ماہر ارضیات ڈاکٹر داس ہیں سرخ سپید چہریرے آدمی تھے لیکن بولنے میں کچھ اس طرح منہ بناتے تھے کہ بیاختہ ہنسی آجاتی تھی۔ غالباً گفتگو کے دوران میں خیالات کا ایک ہجوم اُن کے دماغ میں اُمنڈ آتا جو لبوں تک آتے آتے قدم قدم پر رُکتا اور گھٹتا تھا۔ پھر بھی آدمی بہت قابل تھے۔ شمال و مشرقی ہمالیہ کے طبقات کے بارے میں اُن کی معلومات نہایت وسیع سمجھی جاتی ہیں۔

شاید ان کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ ساہنی نے آسام کے جس بڑھتے ہوئے حصّہ کی جانب اشارہ کیا تھا اس کی موجودگی ان کے مشاہدوں سے ثابت ہوتی تھی۔ لیکن نیل کے چشموں کی بناوٹ میں دقت اور فاصلہ کا لحاظ کرتے ہوئے گو وہ مفروضہ حرکت انقطاع ارض کے موافق تھے تاہم ان کی رائے میں (Gutenberg) سے زیادہ (Wagener) کے خیالات میں معقولیت تھی۔

اس قصّہ کے اختتام تک شام کے چھ بج چکے تھے گویا مسلسل پانچ گھنٹوں تک اس مباحثہ کا بازار گرم رہا لیکن دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ گھنٹے منٹوں کی طرح ختم ہو گئے۔

ڈاکٹر ساہنی کے جواب الجواب کے بعد جس میں اُنھوں نے ہو را اور دیگر معترضین کے خیالات کی تردید کرنے کی کوشش کی پروفیسر دست نے بحیثیت صدر مباحثہ جملہ امور پر از تو تبصرہ کیا۔ ان کی روش صلح کارانہ تھی کہ اس کے سوائے فیصلہ کن مواد کی عدم موجودگی میں کوئی اور چارہ کار بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ کثرت رائے دیگر (Wagener) کے مفروضہ کے موافق ہوتے ہوئے بھی فیصلہ نیا نظرثانی کی گنجائش عمداً چھوڑ دی گئی۔

یہ وہ نتیجہ تھا جو برابر پانچ چھ گھنٹوں کی دماغی کاوشس کے بعد برآمد ہوا اور لطف یہ کہ اس مناظرہ میں کسی اوشمانے حصّہ نہیں لیا اور دلائل محض قیاسی و عقلی پیش نہیں ہوئے بلکہ ایسے ذاتی مشاہدات و تجارب کی مدد سے جس میں زندگیاں صرف ہوئی تھیں اتصال عالم کا مسئلہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن کیا کیجئے کہ رموز کائنات انسان کی بلند ترین پروازوں سے بھی اُدھر ہیں اور رازہائے وجود اس کے دائرۂ علم سے پرے۔

چنانچہ یہ سربستی وہ معمہ نہیں جو حل ہو جائے اور یہ عقدہ وہ گتھی نہیں جسے ناخن عقل انسانی سلجھائے۔

کہ کس نہ کشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

مہندر راج سکسینہ بی ایس سی (عثمانیہ)

"عہد عثمانی میں ملک سرکار عالی کی دیہی تنظیم"

یہہ مضمون بزم معاشرت و عمرانیات کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا

ملک کی معاشی تنظیم میں کسان کی فلاح و بہبودی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ہر متمدن ملک اس اہمیت کو تسلیم کرتا ہے درحقیقت کسان کی خوش حالی ملک کی خوش حالی اور کسان کی مفلسی ملک کی مفلسی ہے۔

موجودہ زمانے میں ہندوستان کی آبادی کا تقریباً (۷۵) فی صدی حصہ زراعت سے زندگی بسر کرتا ہے۔ یہاں کی آبادی کثرت سے زراعت میں لگی ہوئی ہے۔ آبادی کا لحاظ کرتے اُن کے حصہ میں زمین کافی نہیں ہے۔ کاشتکار کو جو زمین ملتی ہے وہ اتنے چھوٹے رقبوں میں منقسم ہوگئی ہے کہ اسکو تمام وقت مصروف رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ آلات و اوزار بہت ناقص اور دقیانوسی ہیں۔

بقول مورلینڈ اکبر کے زمانہ میں جو آلات و اوزار استعمال ہوتے تھے موجودہ زمانہ میں بھی وہی استعمال ہوتے ہیں ہندوستان میں مویشی کی حالت بھی بہت خراب اور قابل رحم ہے ان کے تحفظ نسل اور نگہداشت کے تدابیر کا فقدان ہے کاروبار کے لحاظ سے مویشیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ان کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جس سے ہم کوئی معاشی کام نہیں لے رہے ہیں۔

ہندوستان میں آبپاشی اور ذرائع نقل و حمل کی سہولتیں مفقود ہیں۔ کاشتکار اپنے افلاس کی وجہ سے مصنوعی کھاد استعمال نہیں کر سکتا قدرتی کھاد کا بھی استعمال نہیں ہوتا۔ جانوروں کا گوبر بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مہاجنی لین دین کی خرابیاں کثرت سے

موجود ہیں۔ ناقابل برداشت قرضہ، جہالت اور عام ناواقفیت اور باضابطہ منڈیوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے کاشتکاران کو اپنی پیداوار کی واجبی قیمت نہیں مل رہی ہے۔

ہمارے کاشتکار قدرت پر بھروسہ کرتے ہیں۔ حوصلہ مندی، بلند ہمتی اور اپنی محنت پر بھروسہ کرنے کی قوت یہاں کے کاشتکاروں میں مفقود ہے۔ وہ تنگ نظر قدامت پرست اور قسمت پرست ہوتے ہیں۔ دیہاتی آبادی میں غربت وافلاس ہے۔ اُن کے بچے بیمار اور میلے کچیلے نظر آتے ہیں۔

دیہات کے رہنے والوں کو اس کا علم ہی نہیں کہ کوئی چیز غلط ہے یا اس میں کسی قسم کی اصلاح ممکن ہے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے وہ فارغ اور رسم ورواج میں جکڑے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کی نوّے فیصدی سے زیادہ آبادی ان پڑھ ہے۔ دیہاتی آبادی میں صرف تین فیصدی آبادی پڑھ لکھ سکتی ہے ایک ترکی شاعر کے خیالات ہمارے دیہات پر بہت بڑی حد تک صادق آتے ہیں۔

اگرچہ کہ یہ ایک شاعرانہ تخیل ہے۔

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ تم نے مشرق کی اتنے عرصہ تک سیاحت کی ہے آخر تم نے کیا دیکھا میں کیا بتاؤں کیا دیکھا میں نے اس سرے سے اس سرے تک ویران بستیاں، بے سری قومیں، ٹوٹے پھوٹے پُل، بے آب نہریں، سنسان سڑکیں دیکھیں۔ میں نے جھریاں پڑے چہرے، جھکی ہوئی کمریں، خالی دماغ، بے حس دل، الٹی عقلیں دیکھیں۔

میں نے ظلم، غلامی، خستہ حالی، ریاکاری، قابل نفرت برائیاں، طرح طرح کی بیماریاں، جلے ہوئے جنگل، ٹھنڈے چولھے، بنجر کھیت، میلی صورتیں ننگے ہاتھ پاؤں دیکھے۔

میں نے بے جماعت کے امام دیکھے، بھائی کو بھائی کا دشمن دیکھا۔ دن دیکھے جن کا کوئی مقصد نہیں۔ راتیں دیکھیں جن کی کوئی صبح نہیں[1]"

غرض ہندوستان کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے۔ بہت سی خامیاں موجود ہیں۔ اگر ہمیں موجودہ حالت میں اپنی معاشی ترقی منظور ہو تو ان برائیوں اور خامیوں کو دور کرنا لازم ہے۔ تاہم ناامید ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں۔ ہم بھی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ

---

[1] "ترکی میں مشرق ومغرب کی کشمکش" خالدہ ادیب خانم مطبوعہ جامعہ ملیہ۔

سکتے ہیں۔

ڈنمارک بھی پچاس ساٹھ سال قبل ایک مفلس ترین ملک تھا۔ پیداوار بالکل قلیل تھی لیکن اہل ڈنمارک نے تعلیم کی اشاعت کرکے زراعت کی ترقی کے لئے ازحد کوشش کی جس کا نتیجہ اب ہم دیکھتے ہیں کہ آج وہی ملک یورپ میں نامور ہو رہا ہے۔ اس کا مجموعی رقبہ ہمارے صوبہ اورنگ آباد سے بھی کم ہے۔ مردم شماری ہماری ریاست کی چوتھائی ہے۔ مگر آمدنی ہماری ریاست سے کئی گنی بڑھی ہوئی ہے۔

ہندوستان کی طرح ڈنمارک میں بھی ایک صدی قبل فطری اور قدرتی موافعات موجود تھے۔ یعنی زراعتی غلامی، ملک کے دریا کے سطح کے تقریباً برابر ہونا زمین کا کمزور ہونا۔ ملک میں ریتلی، چٹیل میدانوں اور دلدلوں کی کثرت، سمندر کی برباد کن تند ہوائیں، ذرائع آبپاشی کا فقدان، موسم کی خرابی۔ ان مشکلات کا اہل ڈنمارک نے مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔ ۵۰ یا ۶۰ سال کی مدت میں ڈنمارک کو یورپ کا بہترین زراعتی ملک بنا دیا۔ ڈنمارک میں جہاں آج سے ۵۰ یا ۶۰ سال قبل چٹیل میدان تھے وہاں آج لہلہاتے ہوئے کھیت اور بڑے بڑے درختوں کے گھنے جنگل نظر آتے ہیں اور ان میں جا بجا وہ صورتیں دکھائی دیتی ہیں جنہوں نے اپنی عمریں اس کام کے لئے وقف کر دی تھیں اور بلا کسی اجر و صلہ کے محض قوم کی نجات کے لئے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا تھا[1]۔

ملک کی معاشی تنظیم میں کسان کی فلاح و بہبودی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں سررشتہ جات آبپاشی، زراعت، علاج حیوانات اور امداد باہمی کا افتتاح عمل میں آیا تھا۔ ملک سرکار عالی میں آخرالذکر تینوں سررشتوں کی ابتدا عہد عثمانی کی درخشاں یادگار ہے۔ سررشتہ آبپاشی کی تنظیم بھی اسی مبارک عہد میں پوری ہوئی جس کی نمایاں کارگذاری "عثمان ساگر" "حمایت ساگر" اور "نظام ساگر" وغیرہ کی صورت میں ملک کے لئے رحمت ثابت ہو چکی ہے۔

مفاد عامہ کے لئے جو سررشتے سرکار کی جانب سے قائم کئے جاتے ہیں ان کا نمایاں اثر اسی وقت مرتب ہو سکتا ہے کہ افراد رعایا میں ان سے مستفید ہونے کی صلاحیت موجود ہو۔ خشکی زمینات کو تری میں تبدیل کرنا، زراعت کے سائٹیفک طریقوں پر عمل پیرا ہونا، بہترین مویشی کی پرداخت، اور اتحاد عمل کی بدولت معاشی اصلاح کرنا یہ ایسے امور ہیں کہ جاہل قدامت پرست اور لکیر کے فقیر دیہاتی نہ اس کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ انہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ کسان کی تعلیم

---

[1] از "ڈنمارک کے زراعتی حالات"۔ مصنفہ سید محمد حسینی صاحب جعفری

د تربیت پھر اس کی معاشی حالت بیماریوں کا انسداد اور اس کے رہائشی طریقوں میں جب تک اصلاح نہ ہو اس وقت تک طبیعت میں امنگ پیدا نہ ہوگی اور مفاد عامہ کے لیے جو سررشتے قائم کیے جائیں گے ان سے کوئی نمایاں فائدہ نہ ہوگا۔

اسی حالت کو مدنظر رکھکر ۱۹۲۰ء میں برین F. L. Brayne نے صوبہ پنجاب کے ضلع گڑگاؤں میں اصلاح دیہات کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ یہ تحریک صرف ایک ضلع تک محدود تھی۔ حکومت کی نمایاں امداد کے بغیر کلکٹر ضلع نے جو کارگذاری اپنی ذاتی کوشش سے ملک کے سامنے پیش کی وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئی لیکن برین کی ان تھک اور مسلسل کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ دیہی تنظیم کا کام کسی ایک کی انفرادی کوشش سے عمل میں نہیں لایا جاسکتا۔ اس کام میں دکھاوا اور نمائش نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے بعد پنجاب کے دیگر اضلاع اور صوبہ متحدہ میں بھی دیہی تنظیم کا کام آغاز ہونے لگا۔ متعدد تجاویز بھی ملک کے سامنے پیش کی گئیں۔

جنوبی ہند میں بھی یہ تحریک بارآور ہونے لگی۔ ۱۹۲۷ء میں نیشنل کونسل آف وائی۔ یم۔ سی۔ اے نے متعدد مراکز اصلاح دیہات کے لیے صوبہ مدراس میں قائم کیے۔

سر رابندر ناتھ ٹیگور نے شانتی نکیتن میں اس کام کا آغاز کر دیا ہے۔

صوبہ بمبئی میں ۱۹۳۲ء میں سر فریڈرک سائیکس کے عہد گورنری میں اصلاح دیہی کا کام آغاز کیا گیا۔ کمشنروں اور کلکٹروں کی کانفرنس گورنر موصوف کی زیر صدارت پونہ میں منعقد ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر ہر ضلع میں اصلاح دیہات کی تحریک کو جاری کرنے کے لئے انتظامی کمیٹیوں کا انعقاد عمل میں آیا اور سرکاری امداد بھی مقرر ہوئی۔ اب تقریباً صوبہ بمبئی کے ہر ضلع میں زور شور سے اس تحریک کو عملی جامعہ پہنایا جارہا ہے۔ یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ دیہاتیوں کی اصلاح کے بغیر ملک کی معاشی تنظیم ممکن نہیں ہے۔

حکومت ہند نے بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کر کے سال حال ایک کروڑ روپیہ کی رقم صوبجات میں اصلاح دیہات کی تحریک جاری کرنے کے لئے مرکزی موازنہ سے عطا کی ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

بمبئی ۶ لاکھ، مدراس ۱۴ لاکھ، بنگال ۱۶ لاکھ، صوبہ متحدہ ۱۵ لاکھ، پنجاب ۸ لاکھ، ۵ ہزار، صوبہ متوسط ۵ لاکھ، برہما ۵ لاکھ بہار اڑیسہ ۱۲ لاکھ، ۵ ہزار، شمالی مغربی سرحدی صوبہ ۳ لاکھ آسام ۵ لاکھ، دہلی، اجمیر، کورگ، مارواڑ، ہر ایک کو پچاس پچاس ہزار۔

حفظان صحت، انسداد ملیریا، دیہات کی آبرسانی انتشار اراضی کی اصلاح اور دیہی سڑکوں کی درستگی پر یہ رقم صرف ہوگی۔ اس کے علاوہ ۱۵ لاکھ تحریک امداد باہمی کی ترقی کے لئے محفوظ کیے گئے ہیں۔

علاوہ ازیں مقامی عہدہ داروں کی اختیار تمیزی پر ایک رقم محفوظ کی گئی ہے جو ذیلی مقامی اصلاحات میں صرف ہوگی۔ حکومت ہند

نے یہ امر بھی واضح کر دیا ہے کہ یہ عام اسکیم کا خاکہ ہے۔ صوبہ واری حکومتیں اس نظریہ کے تحت اپنے مقامی ضروریات کا لحاظ رکھ کر عمل کر سکتی ہیں اس سے مقصد یہ ہے کہ دیہاتی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی اور زندگی کے آثار پیدا ہوں۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اخبار ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۷ ڈسمبر ۱۹۳۵ء)

گاندھی جی اور کانگریس نے بھی اصلاح دیہات کی تحریک کو اپنے لائحہ عمل میں اب اولین جگہ دے دی ہے۔ ہندوستان کی اس سیاسی جماعت نے بجا طور پر یہ یقین کر لیا ہے کہ کسان کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑیوں، ویران اور پسماندہ دیہات کی اصلاح ہندوستان کی معاشی اور سیاسی تنظیم کا پہلا زینہ ہے۔

گذشتہ اپریل کی ۲۳ تاریخ کو بمقام اندور تنظیم دیہی کے سلسلے میں مسٹر گاندھی نے ایک معرکۃ الآرا تقریر کرتے ہوئے بیان کیا کہ ہندوستان کی معاشی ترقی صرف دیہاتی صنعتوں کے زندہ کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جسمانی صحت کی خرابی کی وجہ سے ہندوستان کے عمر کا اوسط دیگر ممالک سے گھٹا ہوا ہے ہم اس خرابی کی ساری ذمہ داری برٹش گورنمنٹ یا حکومت اندور اور طبقہ زمینداروں پر عائد کرتے ہیں ان کی ذمہ داری خواہ کچھ بھی ہے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ رعایا کی موجودہ حالت خود رعایا کی پیدا کردہ ہے۔ اس خرابی کی زیادہ تر ذمہ داری خود ان ہی کے سر ہے۔ سلسلہ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے مسٹر گاندھی نے بیان کیا کہ ہمیں اسباب آسائش سے لطف اٹھانے کا حق حاصل نہیں ہے تا وقتیکہ دیہاتیوں کو سادی آرام میسر نہ ہو مسٹر گاندھی نے یہ بھی بیان کیا کہ ہندوستان میں آبادی کی ابھی ایسی کثرت نہیں ہے۔ سیدھے راستے پر مسلسل جدوجہد سے ہم اپنی دولت کو اس قدر بڑھا سکتے ہیں کہ رعایا اس سے آسودہ اور خوش حال ہو جائے گی۔ انہوں نے حاضرین سے استدعا کی کہ حفظان صحت کے معمولی اصولوں کا مطالعہ کر کے ان پر کاربند ہونے کی کوشش کریں۔ سخت محنت اور پھر کاہلی کے دور کرنے سے ہندوستان خوشحال ہو سکتا ہے۔"

غرض ہندوستان کے ۱۲ کروڑ کسانوں اور اُن کی اصلاح کے سلسلے میں ہندوستان کے پانچ لاکھ مواضعات کی اصلاح و ترقی وہ اصل راز ہے جو ہندوستان کی معاشی حالت کے سدھارنے میں ممد و معاون ہوگا۔

یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ اصلاح دیہات کے سلسلہ میں قطع نظر اس تحریک کے جو اصلاح برٹش انڈیا کے بعض اضلاع میں افسران ضلع کی انفرادی کوشش سے عمل میں آئی یا وائی۔ ایم۔ سی۔ اے جیسی غیر سرکاری انجمنوں نے اس کا آغاز کیا۔ ہندوستان میں اگر اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جا کر سرکاری طور پر اس کا آغاز کیا گیا تو ممالک محروسہ سرکار عالی اس صف میں نمایاں ہے۔ بسال ۱۳۴۱ف میں امپیریل ٹرسٹ فنڈ کی امداد سے پٹنچرو میں مرکز ترقیات دیہی کا افتتاح عمل میں آیا اس طرح اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے عہد مبارک میں

جو اصلاح دیہات کی اسکیم مرتب ہوئی اس کو ہندوستان میں ایک طرح کی اولیت حاصل ہے۔

دو تین دفعہ میں نے بھی اس مرکز دیہی کا معائنہ کیا ہے۔ اس مرکز کا مقصد یہ ہے کہ دیہاتی زندگی میں مناسب اصلاحیں کی جاسکیں۔ جس میں گھریلو صنعتوں کی اصلاح بھی شامل ہے۔

"خالص نسل کی مرغیوں کے انڈے کثیر مقدار میں بٹائی کے اصول پر تقسیم کئے گئے ہیں اور خالص نسل کی مرغیوں کی تقسیم عمل میں آئی ہے تاکہ اس اختلاط سے دیہاتی مرغیوں کی اصلاح ہو۔ عمدہ میوہ جات کے تخم اور درخت مہیا کئے گئے ہیں تاکہ دیہاتوں میں ان کی کاشت کی جائے۔ نوجوان اشخاص کے لئے چار مدارس شبینہ، ایک گشتی کتب خانہ اور ایک دارالمطالعہ کا افتتاح کیا گیا ہے۔ نمائش اطفال منعقد کی گئی اور پلیگ، ہیضہ، چیچک کے متعلق تبلیغی کام کیا گیا۔ مکانات مسکونہ کے اصلاحات کے متعلق سہل الحصول بالوں کو رواج دیا جا رہا ہے۔ دیہات کے تمام مناظر کو صاف رکھنے اور پینے کے پانی کی باولیوں کی حفاظت کے متعلق مختلف طریقے اختیار کئے گئے ہیں۔ عمدہ تخم، کھاد اور زرعی آلات کے متعلق عملی مظاہرات کئے جاتے ہیں۔ غیر موزوں بیلوں کو آختہ کیا گیا۔ جانوروں کو عمدہ حالت میں رکھنے کی تعلیم و نیز متعدی بیماریوں کو روکنے کے لئے انسدادی تدابیر بتلائی گئیں۔ امداد باہمی کے اصول پر ایک شہر کے فارم کا قیام عمل میں آیا۔ فضول خرچی کے انسداد کے لئے ایک انجمن کفایت شعاری قائم کی گئی۔ سات دیہات میں مجالس آرائش دیہی قائم کی گئیں تاکہ مرکز کے تحت دیہی ترقی کے کام کو انجام دیں۔ سرکار نے اس مرکز کے مشورہ کے لئے ایک کمیٹی قائم کی ہے جس میں سررشتہ زراعت، صنعت و حرفت، علاج حیوانات، امداد باہمی، طبابت اور تعلیمات کے نظمار شریک ہیں۔"

اس سال حسب ذیل مزید کاموں کا اضافہ ہوا ہے "اکثر غلیظ اور منہدم شدہ باولیات کی درستی کی گئی جن سے وہ صاف ستھری نظر آ رہی ہیں۔ باولیات کی درستی کا کام جاری ہے۔ اور اس کا یہ مقصد ہے کہ موضع کے تمام باولیات کو درست کر دیا جائے۔ دوسری نئی اصلاح یہ ہے کہ کھاد کے متعدد باقاعدہ گڑھے تیار کئے گئے ہیں اور تمام کوڑہ کرکٹ جو سابق میں ادھر ادھر بکھرا ہوا پڑا رہتا تھا ان گڑھوں میں بھرا جا رہا ہے۔ قابل تعریف یہ امر ہے کہ اہل دیہہ خود اپنی ذاتی محنت و نیز اس چندہ سے جو در بدر پھر کر وہ خود فراہم کرتے ہیں اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ ایک اور دلچسپ اصلاح میوہ، ترکاری اور پھولوں کی کاشت ہے جس کو حال ہی میں مدرسہ تحتانیہ کے لڑکوں نے اپنے سکونتی مکانات میں شروع کیا ہے"[۱]

" از تنقید، رپورٹ ناظم صاحب زراعت بابتہ ۱۳۴۲ ف "

[۱] از رسالہ حیدرآباد فارم بابتہ آذر ۱۳۴۵ ف

پٹنچرو کے علاوہ تنظیم دیہی کا کام ممالک محروسہ سرکار عالی کے مختلف اضلاع میں شروع ہو چکا ہے ۔ اب ہم سطور ذیل میں ان کا مختصر ذکر کریں گے ۔

ضلع اورنگ آباد میں دیہی تنظیم کا کام موضع چکل تھانہ میں ہو رہا ہے جس کو میں نے متعدد بار دیکھا ۔ سال گذشتہ سررشتہ علاج حیوانات کی جانب سے جو مظاہرہ ہوا تھا اس کا بھی معائنہ کر چکا ہوں ۔ مجھ کو اس موضع میں خاص قسم کی ہل چل اور صفائی نظر آئی ۔

چکل تھانہ میں گذشتہ دو سال سے تنظیم دیہی کا کام مولوی غلام احمد خان صاحب اول تعلقدار کی کوشش سے آغاز کیا گیا ہے موضع چکل تھانہ جو ریلوے اسٹیشن ہے اورنگ آباد سے ۴ میل جالنہ روڈ پر واقع ہے ۔

یہاں اس غرض سے دو سال قبل عہدہ داران سررشتہ جات کی ایک کمیٹی منعقد ہوئی تھی جس میں یہ طے پایا تھا کہ پبلک مفاد کے سررشتہ جات اپنی اپنی امداد سے چکل تھانہ کو ایک نمونہ کا موضع بنانے کی کوشش کریں ۔ ایک مقامی کمیٹی بھی قائم کی گئی ہے جو صفائی وغیرہ کی نگرانی کرتی ہے ۔ اس کے علاوہ یہی کمیٹی امداد باہمی کی انجمنوں کا کام چلاتی ہے ۔ سیول سرجن صاحب موضع کی آبادی کا طبی معائنہ کرتے ہیں جو مریض بیمار ہو جاتے ہیں ان کو رجوع دواخانہ کیا جاتا ہے یا ضروری ادویات فراہم کر دیے جاتے ہیں ۔ دیہات کے بچوں کو چیچک کے ٹیکے لگوائے گئے ہیں ۔ سررشتہ علاج حیوانات ہر سال جانوروں کی نمائش کا انتظام کرتی ہے دیہات کے مویشیوں کو مانع Rinder Pest ٹیکے لگوائے گئے ہیں ۔

سررشتہ زراعت خواہش مند کاشتکاروں کو عمدہ تخم فراہم کرنے کا انتظام کرتا ہے ۔ کھاد کی تیاری کے لئے گڑھے بنائے گئے ہیں ۔ جدید اصول پر کافی مقدار میں کھاد تیار ہو رہا ہے ۔ جدید آلات کا اسٹاک بھی رکھا گیا ہے ۔ رعایا بلا معاوضہ ان سے مستفید ہوتی ہے ۔ جدید اصول پر آبنوشی کی باؤلی تیار کی گئی ہے ۔ ایک کمیٹی حال اور کتب خانہ بھی تیار ہو چکا ہے ۔ مدرسہ شبینہ اور بازی گاہ قائم کی گئی ہے ۔ گھریلو صنعتوں مثلاً کمبل بافی اور جاروب کی صنعتوں کو ترقی دی جا رہی ہے اور اس کی تنظیم کی کوشش ہو رہی ہے ۔

ڈویژن جالنہ میں موضع گولا پانگری میں دیہی تنظیم کا کام ہو رہا ہے ۔ یہ موضع بیڑ کی سڑک پر جالنہ سے ۸ میل پر واقع ہے یہاں ایک کمیٹی ہال اور ایک مدرسہ تعمیر ہوا ہے ۔ بازی گاہ بنائے گئے ہیں ۔ سڑک سے موضع کو ملحق کر دیا گیا ہے ۔ انتظام کے لئے یہاں بھی ایک سب کمیٹی ہے ۔ ضلع ناندیڑ میں موضع اردہاپور میں دیہی تنظیم کا کام ہو رہا ہے یہ ہنگولی ناندیڑ روڈ پر واقع ہے ۔

ضلع پربھنی میں ہر تعلقہ سے ایک ایک موضع کو منتخب کر کے اسی سال کام آغاز کیا گیا ہے ۔ چنانچہ تعلقہ پربھنی میں ٹاکلی کمگرن

اور تعلقہ ختور میں قصبہ جبری اور تعلقہ پاتھری میں موضع کولہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ قصبہ جبری دودھنا ندی کے کنارے آباد کیا گیا ہے موضع کولہ اسٹیشن مانوت روڈ سے آدھے میل پر واقع ہے۔ دونوں مقامات کا کام تحصیلدار صاحبوں کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔

ٹاکلی کھنگرن کا کام دوم تعلقدار صاحب پربھنی کے زیر نگرانی انجام پا رہا ہے۔ جس کا میں نے سرمائی تعطیلات میں معاینہ کیا ہے جس قدر تفصیل سے اس موضع کے کام کی صراحت کی جاتی ہے۔

ٹاکلی کھنگرن سڑک تعمیرات سے ایک فرلانگ جانب شرق واقع ہے۔ اس لئے تعمیرات کی سڑک سے گاؤں تک توکلفنڈ کی سڑک بنائی گئی ہے۔ اس موضع میں اب ایک خوبصورت مسافر خانہ بنادیا گیا ہے۔ اس موضع میں ایک ٹپہ خانہ قائم کرنے کی تجویز ہو سررشتہ ٹپہ کے قواعد کے لحاظ سے ایک سال خرچہ ٹپہ خانہ سے لے کر ٹپہ خانہ امتحانی قائم کرنے کی تجویز ہوئی ہے۔

رعایا کے آرام و سہولت کے لئے اور مستقر پربھنی کی رسد کے لئے یہاں ہیزم سوختنی کا ڈپو قائم کیا گیا ہے۔ یہاں سیندھی کے درخت بکثرت ہیں۔ اس لئے جاروب، بوریا، اور ٹوکرے بنانے کا انتظام ہوا ہے۔

سررشتہ آبپاشی کی جانب سے یہ انتظام کیا جا رہا ہے کہ آبادی سے باہر ایک کنٹہ اس گاؤں کے نالے کے پانی کو روکا جائے تاکہ اس پانی سے باغات کی کاشت ہو بہترین قسم کی پیداوار کے لئے ہر وقت پانی مل سکے اسکے علاوہ جانوروں کو آب نوشی کے لئے بھی سہولت ہو۔

صفائی اور حفظان صحت اور جانوروں کے ٹیکوں کا خاص طور پر انتظام ہوا ہے۔ امداد باہمی کی ایک انجمن بھی قائم کی گئی ہے۔ سررشتہ تعلیمات سے اس انتظام کی درخواست کی گئی ہے کہ یہاں بڑے پیمانہ پر تعلیم کا انتظام کریں۔ بطور خاص مدرسہ نسواں اور نیچ اقوام کے لڑکوں کی تعلیم کا بھی انتظام کریں۔ یہ تعلیم نہ صرف موجودہ نصاب پر دی جائے بلکہ خاص طور پر صنعت وحرفت زراعت، تجارت اور موسیقی کی تعلیم کا بھی انتظام ہو اور بازی گاہیں بھی بنائی جائیں۔

اب یہاں ایک مطالعہ گھر اور کتب خانہ بنانے کی تجویز ہے۔

سررشتہ زراعت کی جانب سے پیداوار کی نگرانی ہوتی ہے۔ اس امر کا انتظام ہے کہ فصلیں کیڑوں کے دست برد سے محفوظ رہیں۔ پیداوار کم مصارف میں اچھی سے اچھی پیدا ہو۔ بہترین پیداوار کو فروغ دیا جائے۔

ہفتہ وار بازار کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس بازار میں غلہ و پارچہ کے علاوہ مویشی بھی فروخت کے لئے آتے ہیں۔ یہاں ایک مقامی کمیٹی قائم ہے۔ ان انتظامات کی نگرانی کے علاوہ ایک انتظام یہ بھی ہے کہ لوگ جہاں تک ہو سکے مل جل کر رہیں۔ مقدمہ بازی

نہ ہو۔ اور کوئی مقدمہ ہو تو وہ دفاتر سرکاری میں جانے کے بجائے پنچایت میں آپس کے سمجھوتہ سے طے ہوجائے۔

اب ہم ضلع محبوب نگر کی تنظیم دیہی کا ذکر کریں گے۔ موضع بالی پلی میں جو مستقر ضلع محبوب نگر سے تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں کھاد کے گڑھے تیار کئے گئے ہیں۔ ترکاریوں کا باغ اور مرغیوں کے ترقی دادہ ڈربے تیار کرنے کی ابتدا ہوچکی ہے۔ اطفال کے لئے ایک مدرسہ اور عمر رسیدہ اشخاص کے لئے ایک مدرسہ شبینہ قائم کیا گیا ہے۔

دیہاتی اصلاحات کے بعض گیت دیہاتیوں کو یاد دلائے گئے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے ناچ کے ساتھ مل کر گایا کرتے ہیں اصلاحات کے سلسلہ میں جو سب سے بڑی کامیابی حاصل ہوئی وہ یہ ہے کہ تمام دیہاتیوں نے نشہ بازی ترک کر دی ہے چنانچہ سیندھی وغیرہ کی دکانیں سب بند کر دی گئی ہیں کیوں کہ اب اُن کو کوئی خریدنے والا نہیں رہا۔ یہ ایک خوش آیند آغاز ہے جس سے امید کی جاتی ہے کہ دیہاتی زندگی میں بڑے پیمانہ پر اصلاح ہوسکے گی۔[1]

ان مقامات کے علاوہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے دیگر اضلاع یعنی نظام آباد، کریم نگر، آصف آباد، رائچور اور گلبرگہ میں بھی دیہی تنظیم کا کام ہو رہا ہے۔

راقم الحروف موسم گرما کی چھٹیوں میں ان مقامات کا دورہ کر کے بزم معاشیات کلیہ جامعہ عثمانیہ کے لئے ایک مضمون پیش کر رہا ہے۔

سرکار اور تعلیمیافتہ اور دولتمند اشخاص کی ہمدردی کے لئے ہمارے دیہات خاص طور پر مستحق ہوتے چلے ہیں دورِ عثمانی میں ہماری معاشی ساکھ بہت نمایاں ہوگئی ہے ہمارا میزانیہ دیگر ممالک کے لئے قابل رشک ہو رہا ہے۔ مفاد عامہ اور تنظیم دیہی کے لئے ہم کافی روپیہ خرچ کر سکتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے جشن سیمین کے موقع پر دائمی یادگار قائم رکھنے کے لئے جو انتظامات کئے جا رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجلس عہدہ داران نے مرکزی مجلس سلور جوبلی کے پاس جو سفارشات روانہ کی ہیں ان میں ایک موڈل طرز کا موضع اور کارہائے تنظیم دیہی کے لئے ایک لاکھ روپیہ منظور کئے ہیں۔

اس کے علاوہ دکن نیوز کی اطلاع کے بموجب محکمہ لاسلکی سرکار عالی سے عنقریب بڑے پیمانہ پر دیہی تنظیم کا کام شروع

---

[1] اقتباس انسپکشن نوٹ ناظم صاحب زراعت سرکار عالی۔

کردیا جائے گا۔ اس کے لیے ایک موٹر لاری تیار ہوکر آگئی ہے جس میں آلہ ترسیل کے علاوہ آلہ جات موصولی و دیگر مکبر الصوت نصب ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کی ہندوستان بھر میں پہلی موٹر لاری ہے۔ لاسلکی کے ذریعہ دیہی ترقی کا کام جو ایک عرصہ سے ہندوستان کی دوسری نشر گاہوں کے زیر غور تھا اسے نشر گاہِ حیدرآباد سے شروع کیا جارہا ہے اس کام کی ابتدا ء مواضعات سرحدی سی ہوگی۔ جہاں کے باشندوں کو کسی ایک وقت کھلے میدان پر جمع کیا جاکر حفظان صحت، زراعت کے طریقے اور امداد باہمی کے فوائد وغیرہ بتلائے جائیں گے۔

پھر ہمارے شاہ ذیجاہ کی رعایا پروری نے قومی تنظیم اور ملک کی معاشی اصلاح کے لئے خاص میدان پیش کردیا ہے یہی موقع ہے کہ مزارعین اور دیہات کی ترقی و تنظیم کے لئے تیزی و مضبوطی سے قدم بڑھایا جائے۔

شرف الدین احمد متعلم سال چہارم

انجمن اتحاد کی کابینۂ جدید کا انتخاب

گرما کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں شرکت کی بے شمار درخواستیں کالج میں وصول ہوئی تھیں لڑکے کالج اور ہاسٹل مستانہ وار آرہے تھے بڑی رد و کد اور صلاح و مشورہ کے بعد سیکڑوں نئے طلبہ کا داخلہ کالج میں ہوا تھا کالج کی شرکت کے ساتھ ساتھ بورڈنگ میں بھی دھڑا دھڑ داخلے شروع ہوئے اور دیکھتے دیکھتے تینوں اقامت خانوں کی نشستیں پُر ہوگئیں قدیم طلبا موٹروں اور ٹانگوں میں آنے والے نو واردوں کا پر جوش خیر مقدم کر رہے تھے ، اور انھیں کالج اور ہاسٹل کی روایات سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔ بیچارے ہاسٹل کی فضا میں غیر معمولی اجنبیت محسوس کر رہے تھے اور کمروں کی در و دیوار سے بھی بیگانگی ٹپک رہی تھی ادھر سینیرز کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ کے بچھڑے ہوئے دوست نہایت گرمجوشی اور اشتیاق کے ساتھ آپس میں بغلگیر ہو رہے تھے اور زمانہ کی مصروفیات کے تذکرے چھیڑے جا رہے تھے اور ہر ایک اپنی اپنی مشغولیتوں کا تھوڑا بہت حال دلچسپ پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے بعد کامیاب طلبا سے تہنائی وصول کی گئی اور جب نذرانہ وصول کرنے کا مرحلہ پیش آیا جو کالج کی اصطلاح میں (Tradition) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے تو سب نے اپنے اپنے مذاق اور شوق کے مطابق دلچسپ مظاہرے کئے اور بورڈنگ کی فضا میں غیر معمولی تازگی و شگفتگی پیدا کر دی۔

کالج میں جوں توں کر کے وقت کاٹا نئے طلبا کو طرح طرح سے دق کیا۔ آغاز سال کی مختلف طریقوں سے خوشیاں منائیں

اور انجمن اتحاد کے انتخابات کا زمانہ آیا تو الگ اُدھم مچائی۔ تقریروں، تحریروں اور بحث مباحثوں کا بازار گرم کیا اور اپنی اپنی وزارت کی تشکیل میں مصروف ہو گئے ایک مہینہ پیشتر ہی سے انتخابات کی تیاری شروع کر دی گئی اور مختلف ذرائع اور اسباب سے ووٹ فراہم کرنے کے لئے طرح طرح کے جوڑ توڑ چلنے لگے۔ جوں جوں انتخابات کا زمانہ قریب آ گیا رائیں جمع کرنے اور اپنی وزارت کو برسرِاقتدار لانے کی جدوجہد میں شدت پیدا ہوتی گئی گوناگوں تدبیروں سے غلبہ آرا کو اپنا ہم خیال اور موافق بنانے کی کوشش کی گئی اس مقصد کے حصول میں متعدد مرتبہ عصرانے ترتیب دیئے گئے دعوتی رقعے تقسیم کئے گئے اور زیادہ سے زیادہ طلبا کو جلسہ میں مدعو کرنے کی سعی کی گئی باضابطہ طور سے جلسہ کی روئداد شروع ہوئی۔ مزاحیہ نظموں اور مکالموں سے حاضرین کو محظوظ کیا گیا اور چائے وبسکٹ سے رائے دہندوں کی تواضع کی گئی، عمدہ اخلاق اشتراکِ عمل اور اتحادِ رائے کا کامل نمونہ طلبا کے سامنے پیش کیا گیا اور مختلف طریقوں سے ان کی عزت اور آؤ بھگت کی گئی اخلاق کے پتلے بن گئے۔ اور خاطر و مدارات اور ملنساری کے جادو سے سب کو رام کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ تمام ان کے پسندیدہ اخلاق اور خاطر مدارات سے مرعوب ہو کر ان کی وزارت کے لئے رائے دیں اور ان ہی کی موافقت میں کام کرنے لگیں۔ غرض جلسہ کو کامیاب اور منظم بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ظاہری اخلاق مروت، دوستی اور ظاہری انتظامات کے تحت جتنے بھی اثرات ڈالے جا سکتے تھے ڈالے گئے اس کے بعد دھواں دھار تقریریں شروع ہوئیں اور اپنی اپنی وزارت کے منصوبوں اور لائحہ عمل کو واضح طور پر عالمانہ اور دوستانہ طریقہ سے ان کے سامنے پیش کیا گیا حسن انتظام سے تسخیر قلوب کیا گیا، ذات پات، مذہب وملت اور قومیت سب کا امتیاز اٹھا دیا گیا اور اس بات کا کامل اطمینان اور یقین دلایا گیا کہ ان کی وزارت برسرِاقتدار ہو جانے کے بعد اپنے مفوضہ امور کو بخوبی انجام دی گئی اور مادرِ جامعہ کے فرزندوں کی حقیقی معنوں میں نمائندگی کرے گی۔ ان کارروائیوں کے بعد چھوٹے بڑے سب ان کا دم بھرنے لگے اور جلسہ کے برخاست ہونے تک اسی وزارت کی مدح سرائی کی جاتی رہی۔ یہ تمام انتظامات، مظاہرے اور جلسے ہر دو وزارتوں کی طرف سے کئے گئے متعدد دفعہ عصرانے ترتیب دیئے گئے اور ممکنہ طریقوں سے رائیں جمع کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر وزارت کے کارکنوں نے اپنی مخالف فریق پر غالب آنے کے لئے ہر طرح سے ہاتھ پیر مارے اور اپنی پوری پوری دماغی قابلیتیں اور جسمانی قوتیں صرف کر دیں۔ ان کوششوں کے علاوہ انفرادی کوششیں بھی الگ تھیں جو لڑکوں کی طرف سے کالج میں اور خصوصاً ہاسٹل میں اُٹھتے بیٹھتے، ملتے جلتے اور چلتے پھرتے کی جاتی تھیں نئے لڑکوں پر مختلف طریقوں سے اثرات ڈالے گئے اور انھیں نرالی ترکیبوں سے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی گئی دو دو اور تین تین گھنٹہ کارکنان وزارت نے نئے طلبا کی ہم آہنگی حاصل کرنے کے لئے اپنا دماغ کھپایا اور بسا اوقات ان نو واردوں کا بھی دماغ چاٹ گئے آخر کار بیچاروں نے مجبور ہو کر ان کی وزارت کو رائے دینے کا جھوٹا وعدہ کر لیا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ

انھوں نے کسی وزارت کے لئے رائے دینے کا تہیہ کیا تھا ان وعدوں سے کارکنان خوش ہوکر اور یہ سمجھ کر کہ اُن کی چکنی چپڑی باتیں اور پچھے دار گفتگو رائیگاں نہ گئی اراکین وزارت کے پاس پہونچ کر اپنی بڑھ ہانکنا شروع کی اور اراکین وزارت نے بھی اپنا کام بنانے کی خاطر ان کی ہمت افزائی کر دی اور ان کی کارگزاری اور خدمات کا اعتراف کرکے تھوڑی بہت داد دے دی۔ ان ہمت افزائیوں اور متوقع کامیابی کے مدنظر کارکنان مسرور ہوکر پھر اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔

آخیر آخیر دنوں میں سرتوڑ کوشش کی گئی ہر وزارت کی طرف سے نئے نئے طریقوں اور چالبازیوں سے ووٹ فراہم کرنے کی جد وجہد کی گئی اور بعد کی گھڑیوں میں تو اپنی محنتوں اور کوششوں کے نتائج سے مضطرب اور خوفزدہ ہوکر نہایت بے چینی و بے تابی کے ساتھ الیکشن کے دنوں کا انتظار کرنے لگے اس میں کچھ شک نہیں کہ ان میں بعض خدا کے بندے ایسے بھی تھے جنھوں نے نہایت بے نفسی اور لیاقت کے ساتھ وزارت کا کام انجام دیا مگر وہ اسی بارے میں کسی ماحول اور قاعدے کے پابند نہ تھے بلکہ اپنے ہی طبیعت کی ایک لہر اور جولانی سمجھنا چاہئے کہ بعض حضرات نے جامعہ کے سپوتوں پر ایک حکیمانہ نظر ڈالی اور وہ چال چلی جو بہتیروں میں سے کسی کو سوجھی نہ تھی۔

خدا خدا کرکے وہ دن بھی آپہونچا جگہ جگہ مختلف جگہ جلسے شروع ہوئے علم ایستادہ ہوئے اور وزارتوں کے پھریرے لہرانے لگے اشتہارات اور پمفلٹ سڑک بہ سڑک دیوار بہ دیوار اور کمرہ بکمرہ لگائے گئے غرض کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں یہ کاغذی پرزے اور اشتہارات نہ پہونچے ہوں وزارت کی متوقع کامیابی کی خوشی میں دلچسپ ترانے اور کورس گائے گئے اخباروں میں مضامین دیئے گئے اور چیخوں اور آوازوں سے فضا میں ایک ہیجان پیدا کر دیا گیا۔

ہاتھوں میں پمفلٹ اور علم لیے، دلچسپ ترانے اور کورس گاتے، اشتہارات تقسیم کرتے، وزارت کی کامیابی کے نعرے لگاتے اور ہر قسم کا شور مچاتے ایک جم غفیر لورڈ ننگ سے کالج کی طرف روانہ تھا کبھی چوکڑیاں بھرتے کبھی جھومتے جھامتے، بگلیں اور باجے بجاتے، ساتھ چلنے والوں پر آوازے کستے، لڑکوں کا غول، غل غپاڑ مچاتے۔ رنگا رنگ کے نشان اور پھریرے اُڑاتے خوشیوں کے راگ الاپتے اور دیوانوں کی طرح شور مچاتے جوق در جوق بورڈنگ سے کالج کی طرف جا رہا تھا۔ وہ جوش و خروش کہ بزدلوں کے دل میں بھی لہو جوش مارنے لگے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک کالی گھٹا چلی آتی ہے جس سے پانی کی بجائے مستی ٹپکتی ہے۔ ہر وزارت کے کارکنان اسی بے پناہ جوش و خروش، کارروائیوں، ورمظاہروں میں مصروف تھے کالج پہنچنے کے بعد رائے دہی کے کمرے کے سامنے نہایت ہی دلچسپ طریقہ پر جوش وعقیدت اور رعونت کے مظاہرے ہونے لگے۔ ایک جم غفیر کا بے پناہ ریلا دروازے کے سامنے رکا ہوا تھا اور ہر شخص دوسروں کو ڈھکیل کر اندر داخل ہونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ سب اپنے خیالات، جذبات جوش، نے خودی اور وارفتگی میں ڈوبے

ہوئے اپنی دھن میں مگن ہر قسم کے خوف وخطرہ سے لاپرواہ ہو کر مختلف کارروائیوں میں مصروف تھے جس دھن میں وہ محو تھے اس سے کوئی چیز ان کو ہٹا نہ سکی اور جس نشے میں وہ مست تھے اس کو کوئی ترشی نہ اتار سکی۔ غرض اس دن اس قدر چیخنے، پکارنے اور دوڑ دھوپ کی کہ آواز بیٹھ گئی اور تھک کر چور ہو گئے بات کرنے اور ایک قدم چلنے کی ہمت باقی نہیں رہی"۔ اور "کیوں بھئی تمھیں کیا ہوا" کا جواب اشاروں سے ادا کرنے کے لئے مجبور ہوئے وقت کی اہمیت اور تنگی کا لحاظ کرنیوالے لڑکے ان کو اپنا زیادہ وقت نہ دے سکتے تھے اور ان کو وہیں چھوڑ کر خود دوسرے کاموں میں لگ جاتے تھے اور نوواردوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر انھیں ہر طرح سے مجبور کر کے کمرے کے دروازے تک لاتے تھے اور اپنی وزارت کے اراکین کے ناموں کا کارڈ ان کے حوالہ کیا جاتا تھا خدا معلوم آنے والے حقیقت میں کس وزارت کے لئے رائے دیتے تھے اسی ہلڑ اور حیص بیص میں ایک بج گیا۔ الیکشن رک گیا اور لڑکوں نے بھوک اور چائے کی شدت محسوس کی پھر کیا تھا ہوٹلوں کے چائے خانوں اور طعام خانوں پر ٹوٹ پڑے اور وہ شور مچایا کہ خدا کی پناہ۔ ہر شخص آپے سے باہر اپنی وزارت پر قربان ہونے کے لئے تیار مستی میں چور، چلچلاتی دھوپ میں ننگے سر جلدی جلدی کچھ کھا پی کر نہایت بے تابی کے ساتھ الیکشن روم کے راہ لے رہا تھا۔

دوپہر میں صبح کی سی ہلڑ نہ تھی مجمع میں کمی آچکی تھی گانے والوں اور ترانہ پڑھنے والوں نے تھک کر اپنے حواس باختہ کر لئے تھے کارکنوں نے بھی اب چپ کی سادھ لی تھی اور ووٹروں میں اکا دکا آجاتا اور اپنا ووٹ دے جاتا تھا۔ چار بجتے بجتے معاملہ تمام سرد پڑ گیا تھا، اور تمام کارروائیاں اور مظاہرے ٹھنڈے ہو چکے تھے سب نے اپنے اپنے گھروں اور کمروں کو سدھارنا شروع کیا تمام گھنٹہ اور گھڑیاں وزارت کی کارروائیوں کا جائزہ لیتے اور کامیابی پر خیال آرائیاں کرتے گزر رہی تھیں اسی دوران میں تھکن محسوس ہوتی تو اکثر لڑکے چائے کے لئے ہوٹل چل دیا کرتے اور کچھ تراوٹ معلوم ہوتی تو تنہائی میں سونے کی کوشش کرتے لیکن مختلف قسم کے خیالات اور افکار دامنگیر ہونے کے باعث اور نتیجہ نہ نکلنے کی وجہ سے سو نہ سکتے تھے۔ بستر پر دو ایک کروٹیں لیتے اور مجبوراً اٹھ بیٹھتے تھے شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی سب نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا۔ تولیہ سے چہرہ خشک کیا بال سنوارے، کپڑے پہنے اور بن ٹھن کر کھیل کود اور تفریح میں مشغول ہوئے۔ اس عدیم الفرصتی اور گہما گہمی میں بھی وہ اپنے لباس کا فی خیال رکھتے ہیں اور بناؤ سنگھار سے کبھی تغافل نہیں برتتے تمام کھیل کود اور سیر و تفریح اسی بحث میں گزری کہ کونسی وزارت آئے گی۔ اتنے میں شام ہوگئی رات کا کھانا تناول فرمایا اور پھر وہی وزارت کے خیالات نے آگھیرا۔ آدھی رات گئے تک خوش گپیاں ہوتی رہیں کہ لائٹ آف ہوگئی اور سب نے اپنے اپنے کمروں میں جاکر سونے کی کوشش کی باوجود انتہائی کوشش کے کچھ دیر کے لئے بھی سو نہ سکے نتیجہ کی فکر رات تمام ستاتی رہی اور اس تڑپ اور الجھن میں رات کٹی اور صرف کروٹیں بدلتے بدلتے صبح کر دی اور پھر جلدی ہی ناشتہ کر کے کالج چلدیئے۔

اعداد شماری شروع ہوگئی ہر لڑکا مشتاق نظروں سے اپنے اپنے دوست کے اعداد شمار دیکھ رہا تھا بڑی دیر میں نتیجہ برآمد ہوا اور منتخب شدہ اراکین کا نام بنام اعلان کر دیا گیا۔ ناکام حضرات کے چھکے چھوٹ گئے امیدوں اور توقعات پر پانی پھر گیا۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرا گیا دل ڈوب گیا اور نہایت خاموشی و حزن و ملال کے ساتھ اپنے کمروں اور گھروں کو واپس ہوئے اور راستہ بھر تمام لڑکوں کی بد دیانتی دھوکہ بازی اور مکر و فریب کا رونا روتے رہے۔ پر ان کی سننے والا ہی کون تھا جو کامیاب ہوا دنیا اسی کی ہوئی جو ناکام ہوا سب نے اس کا ساتھ چھوڑا۔ کامیاب افراد کا کیا پوچھنا فرط انبساط سے اچھلے پڑتے تھے مسرت کی ایک لہر سارے جسم میں دوڑ رہی تھی کامیابی کے شادیانے اور مبارکباد کی صدا ہر طرف سے بلند ہو رہی تھی مارے خوشی کے چہرے دمک رہے تھے اور دل بانسوں اچھل رہے تھے۔ آپس میں گلے مل رہے تھے اور خوب خوب زور آزمائی ہو رہی تھی حتی کہ تیسروانی کے بٹنوں نے جواب دیدیا اور سینوں میں درد شروع ہو گیا اور چیخوں اور نعروں سے فضا گونج اٹھی۔
غرض بے حد خوشی اور مسرت کا اظہار کیا گیا اور مخالف فریق پر طرح طرح کے آوازے کسنے اور طعن و تشنیع کے چبھتے ہوئے تیر سر کئے جا رہے تھے جو ان کے کلیجے کے پار ہو رہے تھے ان زخموں کے لئے سوائے ضبط کے اور کوئی شفا بخش مرہم نظر نہ آتا تھا۔ کامیاب افراد اپنی حکمت عملی کارگزاری اور جد و جہد پر ناز کر رہے تھے اور کامیابی کی خوشی میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ منتخب شدہ صدر کو لڑکے گودیوں میں لے کر ہاتھوں ہاتھ کالج سے بورڈنگ جا پہنچے۔ بیچارے صدر کا گلے ملتے ملتے اور مصافحہ کرتے کرتے برا حال ہو گیا ہر شخص صدر انجمن سے بغلگیر ہونے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن یہ مختصر سے آدمی ان دست درازیوں اور مجمع کی مٹھ بھڑ کا کہاں تک مقابلہ کرتے بہت حیران و پریشان ہو کر انھوں نے ان بے راہ رویوں سے نجات پانے کے لئے کوئی جائے پناہ تلاش کرنا چاہی لیکن ہاسٹل پہونچتے پہونچتے مجمع میں خاصی کمی ہو چکی تھی اور صدر صاحب نے کمرہ میں آکر اطمینان کا سانس لیا

اراکین وزارت نے کامیابی حاصل کرنے کے ساتھ ہی لڑکوں کے دلوں کو بھی فتح کر لیا اور نفاق و اختلاف کے جھاڑ جھنکار صاف کر کے جامعہ کو جنت الفردوس بنا دیا غیر اپنے بن گئے ناکامی اور کامیابی کا امتیاز جاتا رہا اور صداقت و آزادی کا ڈنکا بج گیا۔ کچھ دنوں بعد کرسی نشینی کا جلسہ منعقد ہوا۔ جلسہ کا پروگرام مرتب ہوا اور وزارت کا لائحہ عمل پیش کیا گیا جناب نائب عین امیر جامعہ عثمانیہ نے جلسہ کی صدارت کی سابق معتمد نے دلچسپ اور پر مغز تقریر کی اور منتخب شدہ کابینہ کا پرجوش خیر مقدم کیا قابل سابق صدر نے گزشتہ سال کی رپورٹ پڑھ کر سنائی اور موازنہ کی آمد و خرچ کے تفصیلی اعداد شمار بتائے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی منکسر المزاجی سے باوجود زیادہ جسیم ہونے کے وزارت کے بار کو ناقابل برداشت تصور کیا صدر نے خطبہ صدارت پڑھا اور صدر کلیہ نے آئی ہوئی کابینہ کو مبارکباد دی اور اس سے بہت سی توقعات اور گراں بہا خدمات وابستہ رکھ کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ تالیوں سے سارا ہال گونج اٹھا اور بڑے لطف سے جلسہ برخاست ہوا۔

محمد شمس الدین متعلم بی۔ اے

مرقع علی ساگر

علی ساگر میں بحرِ زندگانی موجزن دیکھا   تمنا کا گلستاں آرزوؤں کا چمن دیکھا
زمیں کے چپے چپے کو فلک پر خندہ زن دیکھا   دلِ شاعر تڑپ جاتا ہے ایسا بانکپن دیکھا

عیاں ہر موج سے ہی، پیچ و خم جوشِ جوانی کا
دکھاتی ہے شعاعِ مہر منظر آگ، پانی کا

صبح کا منظر

نشے میں حسن کے سرشار ہی مدہوش ہی ساگر   بہاریں سیکڑوں لاکھوں چمن بردوش ہی ساگر
پیامِ صبح سننے کو سراپا گوش ہے ساگر   سراسر جلوہ گاہِ نغمہ خاموش ہے ساگر

عجب عالم ہے پیارے چمن گویا پرافشاں ہے
پڑی ہے اوس وادی گوہرِ مقصد بداماں ہے

فضا کی کیف باری اور مناظر کی فراوانی　　پگھل کر بہہ رہے ہیں سیم و زر راس رنگ کا پانی
یہاں فطرت سے خشک کر رہی ہے عقل انسانی　　ہے سائل کی پریشانی پہ خود پانی کو حیرانی

مصائب لاکھ ہوں اہلِ بصیرت غم نہیں کرتے
جو عالی ظرف ہیں تکلیف میں ماتم نہیں کرتے

شام کا نظارا

کس اہلِ دل نے یہ رحمت کا دریا کر دیا جاری　　یہ قدرت ہمیشہ ہے یہاں مصروفِ گلکاری
عروسِ ماہ کے جلوے کی جب ہوتی ہے تیاری　　شفق پانی میں حل کرتا ہے جھک کر چرخِ زنگاری

کنارِ آب دامِ موج یوں گلبار ہوتا ہے
گلے میں سبزِ ساحل کے گلوں کا ہار ہوتا ہے

چاندنی کا سماں

شبِ مہتاب میں جنت نظر ہوتے ہیں نظارے　　ہوا گلبن دیپہ ہکاتی ہے ہر جا لال انگارے
چمن میں پھول بن جاتی ہیں کلیاں جوش کے مارے　　لٹاتے ہیں خوشی سے چاندنی حوضوں میں فوارے

محبت کے فرشتے گوش برآواز رہتے ہیں
اس ارضِ پاک پر حسن اور نغمہ مل کے بہتے ہیں

اندھیری رات کا عالم

تبِ تاریک میں ہر ذرّہ ہیبت بار ہوتا ہے
اجل کی گود گویا دامنِ کہسار ہوتا ہے
نظر کو آنکھ سے باہر نکلنا بار ہوتا ہے
نفس[۵] سینے میں اک چلتی ہوئی تلوار ہوتا ہے"

یہ پانی پر موجیں مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں
گھٹا میں تلملاتی بجلیاں معلوم ہوتی ہیں

تری خاکِ چمن کو میں نے پلکوں سے اٹھایا ہے
گلِ ریحاں کو تیرے اپنی آنکھوں سے لگایا ہے
تری رعنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے
تری تعریف کا نغمہ تجھے پہروں سنایا ہے

مری آواز کی تجھ کو رہے گی آرزو برسوں
مجھے بھی اے علی ساگر! کریگا یاد تو برسوں

سکندر علی وجد بی اے (عثمانیہ)

---

[۵] وہاج الدین نسیم ۱۲

نظام ساگر

عہد عثمانی کی بے شمار ترقیوں میں سے ایک درخشاں کارنامہ نظام ساگر کی تعمیر بھی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم الشان مخزن آب ہے کہ اس کی جانب خاصۃً تعلیم یافتہ طبقہ کو متوجہ کرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بدیں وجہ ایک مختصر مضمون پیش کیا جاتا ہے جو اُمید ہے ناظرین کی توجہات کو حاصل کرسکے گا۔

اٹھارویں صدی کا فنی و صنعتی انقلاب حقیقتاً ساری دنیا کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کا انقلاب ہے، بے شمار تعمیراتی اسکیموں کا عمل میں آنا بڑی بڑی مشینوں کا رواج پانا، ذرائع حمل ونقل کی کثرت اور آمد و رفت کی ممکنہ سہولتوں کا وجود میں آنا بین الاقوامی اہم مسائل کی تخلیق کا باعث ہوا۔ پچھلے زمانہ میں خاندان محض اپنی زندگی کے لئے پیداوار اگاتے تھے مگر اب ہر ملک آپس میں خام پیداوار اور صنعتی اشیاء کا لین دین کرنا اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھنے لگا ہے۔

ہندوستان ایک خالص زرعی ملک ہے۔ جب دنیا نے صنعتی ترقی کی اور بین الاقوامی تجارت کا آغاز ہوگیا تو ہندوستان کا بھی صرف خام پیداوار کی حد تک اس میں دخل ہوا۔ اور دنیا کے مارکٹ میں اس کی پیداوار فروخت ہونے لگی موجودہ دور کاروباری اور مسابقتی دور ہے اور ہر ایک کو اپنی پیداوار کی نکاسی کے لئے بے حد جد وجہد کرنی پڑتی ہے اس لئے پیداوار کی افراط کے ساتھ ساتھ اُس کی عمدگی بھی ضروری ہے۔ لیکن زرعی کاروبار غیر یقینی ہیں کیونکہ بارش کی مقدار اور وقت کا کوئی تعین ہی نہیں۔ اسی لئے خزائن آب

کی ضرورت محسوس ہوتی ہے مگر کسی وسیع اور مہتم بالشان مخزن آب کی تعمیر کے بعد اس کو کامیاب بنانا بھی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی بلکہ وسیع پیمانہ پر کوششوں کو جاری رکھنا پڑتا ہے اور کئی سال کے صبر و انتظار کے بعد نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اضافہ آبادی کے تدابیر، حفظان صحت کے اصول پر عمل، زرعی تعلیم کا بندوبست کاشتکاروں کی مشکلات کا روکنا، عمدہ نسل کے مویشیوں کی فراہمی، کھاد کا انتظام، سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر، غرض یہ اور اسی قسم کے دیگر امور اساسی ہیں جن پر کافی توجہ کئے بغیر ہزاروں ایکڑ اراضی خشکی و بنجر کو سرسبز و شاداب کھیتوں اور باغوں میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ایک باقاعدہ انتظام اور مختلف سررشتوں کے اتحاد عمل کو حاصل کرنا پڑتا ہے۔

حیدرآباد میں تقریباً (۸۵) سال قبل محکمہ آب پاشی قائم ہوا لیکن آب پاشی کی توسیع صرف معمولی تالابوں کی تعمیر و ترمیم تک محدود رہی البتہ (۱۳۱۵ف) میں تعلقہ میدک میں تقریباً اٹھارہ لاکھ تیس ہزار کے مصارف سے محبوب نہر کا اجرا ہوا جس کی مسافت (۲۴) میل ہے اور جو اٹھارہ مواضع کی (۴۷۰۰) ایکڑ اراضی کو سیراب کرتی ہے۔ اس سررشتہ نے ۳۲-۱۳۲۲ف تک گیارہ سال کے عرصہ میں جن وسیع خزائن آب کی تعمیر کو منظور کرایا وہ حسب ذیل ہیں۔

نشان سلسلہ	نام	مصارف تعمیر	فصلی سنہ تکمیل	محل وقوع
۱	عثمان ساگر	(۵۴۰۰۰۰۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۲۶ف	نواح گولکنڈہ
۲	حمایت ساگر	(۹۲۶۸۰۰۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۵ف	" "
۳	پوچارم	(۳۳۴۸۷۰۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۲ف	تعلقہ بلاریڈی
۴	رائن پلی	(۲۸۳۰۰۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۶ف	تعلقہ میدک
۵	فتح نہر	(۵۳۰۰۸۹) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۵ف	تعلقہ انرول
۶	پالیر	(۲۲۲۵۰۰۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۶ف	تعلقہ کہمم
۷	دائرا	(۲۵۰۰۰۰۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۰ف	" "
۸	سنگو بھوپالم	(۲۲۸۸۴۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۹ف	تعلقہ ینڈو
۹	نظام ساگر	(۴۲۷۰۰۰۰۰) [illegible] تک	سنہ ۱۳۳۹ف	تعلقہ بانسواڑہ

نظام ساگر کی تعمیر کا آغاز ۱۳۳۳ف کی ابتدا سے ہوا حیدر آباد سے (۹۶) میل کے فاصلہ پر تعلقہ یلا ریڈی (ضلع میدک) سے جانب غرب (۱۰) میل اور مستقر ضلع نظام آباد سے تقریباً (۴۵) میل پر مانجرا ندی کا گزر اس طرح ہوا کہ ایک عظیم الشان خزانہ آب کے تعمیر کی موزونیت تھی۔ مانجرا ندی ضلع بیڑ سے نکل کر اضلاع عثمان آباد، میدک، اور نظام آباد سے گزرتے ہوئے دریائے گوداوری (ضلع ناندیر) میں جا ملتی ہے۔ مانجرا ندی کی یہ خصوصیت قابل تذکرہ ہے کہ اس کی مسافت اندرون ملک طویل ہے۔ اور بلند مقامات سے بہتی ہوئی زرخیز علاقوں سے گزرتی ہے۔

ندی کی سطح سمندر کی سطح سے (۱۳۰۰) فٹ بلند ہے۔ معمولاً جو پانی رکھا جاتا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار سطح سمندر سے ۵۔۱۴۰۰ فٹ ہے اس لحاظ سے ذخیرۂ آب کا عمق معمولی حالت میں (۱۰۰) فٹ اور انتہائی مقدار میں (۱۰۵) رہے گا۔ معمولی ذخیرۂ آب کی مقدار (۲،۸۰۰) مکعب فٹ ہے۔ پانی کا پھیلاؤ (۳۰ ۱۰۰۰) ایکڑ اراضی یا (۶۵) مربع میل رقبہ پر ہے۔ خزانہ آب میں (۱۷) مواضع کلیتہً غرق اور (۳۷) مواضع کی تھوڑی تھوڑی اراضی غرق ہونے کے علاوہ ان میں سے (۱۷) مواضع کی آبادیوں کو مواضع کے بقیہ رقبوں میں منتقل کر دیا گیا۔ مجموعاً جو مزروعہ رقبہ غرق ہوا وہ (۲۶ ۱۰۰۰ ایکڑ) ہے جس میں (۴۵ ۱۰۰۰) ایکڑ تری اور (۱۱۸۵ ۱۰۰۰ ایکڑ) خشکی ہے جو آبادیاں برخاست ہوئیں وہاں کے مکانات وغیرہ کا معاوضہ ادا کیا گیا اور بے دخل ہونے والے اشخاص نے دوسرے مقامات میں جدید مکانات کی تعمیر کی اراضیات بھی دلائی گئیں۔ بحیثیت مجموعی اراضیات اور مکانات کا جو معاوضہ ادا ہوا اس کا تخمینہ (۲،۴۳۵۹۵ سکہ) ہے۔

نظام ساگر کی تعمیر سے جو فوائد ہوئے یا آئندہ ان کی توقع ہے اس کا ذکر آگے مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ فی الوقت اس زمانہ کا ذکر کیا جاتا ہے جب کہ بند اور نہر زیر تعمیر تھے تاکہ نظام ساگر کی عظمت کا اندازہ ہو اور یہ معلوم ہو سکے کہ اس کار عظیم کے آغاز ہونے کے بعد عوام کو کیا کیا فائدے پہنچے۔ بہ غرض تعمیر مخزن آب جو عارضی آبادی قائم ہوئی تھی اس کا پھیلاؤ تقریباً (۴) مربع میل پر تھا۔ اور بارہ ہزار نفوس سکونت پذیر تھے۔ جن میں ایک بڑی تعداد مزدور پیشہ کی تھی جو اطراف و جوانب سے نکل کر روزی کمانے کے لئے جمع ہو گئے تھے اور تعمیر نہر پر جو مزدور مامور تھے ان کی تعداد پندرہ ہزار تھی۔ نظام ساگر میں پورا کیمپ برقی روشنی سے منور رہا کرتا تھا۔ اور نلوں کے ذریعہ آب رسانی کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ تین دواخانے قائم کئے گئے تھے۔ جرائم پیشہ مزدوروں کی دیکھ بھال کا انتظام تھا اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے گئے تھے آٹھ نو سال تک یہ چہل پہل قائم رہی۔ اور پسماندہ دیہاتیوں کو تہذیب و تمدن سے اثر پذیر ہونے کا کافی موقع ملا۔ اور انہیں یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیونکر اپنی سقیم حالت کو بہتر حالت سے بدل سکتے ہیں۔

نظام ساگر کے بند کے مشرقی گوشہ سے نہر نکالی گئی ہے جس کا طول (۹۶) میل ہے (نہر کے لئے ایک سنگ بستہ دیوار میں (۱۱) آہنی

دروازے نصب ہیں جن میں ہر ایک کا طول و عرض (۱۰½ × ۸ فٹ ہے) نہر کا اوسط عرض (۱۰۰) فٹ اور عمق (۱۴) فٹ ہے پانی کا عمق (۱۰½) فٹ ہے اور دروازوں سے فی سکنڈ (۳۴۶۰) مکعب فٹ کی مقدار میں نکلتا ہے جس کی رفتار روانی (۳ر۴۶) فٹ سکنڈ ہے۔ نہر کا گزر چار تعلقات، بانسواڑہ، بودھن، نظام آباد اور آرمور سے ہوا ہے۔ اور اختتام آخر الذکر تعلقہ کے حدود میں اس جگہ ہوتا ہے جہاں ہمگل ندی ملتی ہے۔

نہر سے حسب ضرورت متوسط اور چھوٹی شاخیں نکالی گئی ہیں جن کے ذریعہ سے زیر اثر مواضع کی سیرابی عمل میں آتی ہے اس کے سوا ان تعلقوں کے بعض موجودہ تالابوں کو نہر کے ذریعہ لبریز کر دیا جاتا ہے تاکہ وافر پانی موجود رہے۔ نہر سے استفادہ آخر ۲۹ف سے شروع ہوا۔ جملہ رقبہ نہروں کے زیر اثر ہے۔ (جو تعلقات بانسواڑہ، بودھن، نظام آباد اور آرمور میں واقع ہیں) وہ موازی (۵۳۷،۴۳۶) ایکڑ ہیں جس میں سے موازی (۳۸۷،۰۸۸) ایکڑ (۲۲۷) مواضع خالصہ کا اور موازی (۱۵۰،۳۴۸) ایکڑ (۱۲۸) مواضع جاگیر کا ہے۔ مذکورہ بالا رقبوں میں سے مزید گنجائش بھی نکالی جا سکتی ہے۔ نظام ساگر کی آب پاشی سے بہ عجلت تمام استفادہ کے لئے ڈاکٹر مان کے مشوروں کے مطابق ۲۹-۱۳۲۸ف میں ایک عارضی مزرعہ نظام ساگر میں قایم کیا گیا تھا جس میں نیشکر کی کاشت کے تجربے کاشتکاروں کو دکھائے گئے محکمہ زراعت نے کوئمبتور کے نیشکر نمبر (۲۱۳) کو رائج کیا جو کاشتکاروں کے حق میں بہت ہی نفع بخش ثابت ہوا۔ نہر کے تحت کے رقبوں میں سب سے زیادہ شالی زار (دھان) اور اس کے بعد نیشکر کی کاشت ہوتی ہے اس کے علاوہ مختصر رقبہ میں ترکاریاں اگائی جاتی ہیں اور اب باغات لگانے کا شوق بھی ہو رہا ہے۔

نظام ساگر کے تحت ابتداءً اگرچہ پندرہ ہزار ایکڑ رقبہ میں نیشکر کی کاشت کا تخمینہ کیا تھا لیکن کاشتکاروں کی غیر معمولی ترقی اور عنقریب کارخانہ شکرسازی کے قیام کی توقع کے سبب خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ پچیس سے تیس ہزار ایکڑ رقبہ میں نیشکر کی کاشت ہو سکے گی۔ نہر کے اجرا کے بعد سے گزشتہ چار سال میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اور نیشکر کی کاشت کا رقبہ ۸ ہزار ایکڑ تک پہنچ گیا۔ اس کے علاوہ وسیع ترین رقبوں میں شالی زار کی کاشت کا بھی اضافہ ہوا ہے۔

نیشکر کی کاشت کی اسی غیر معمولی ترقی کی وجہ یہ ہے کہ محکمہ زراعت نے کوئمبتور کے جس نیشکر کے ترویج کی کامیاب کوشش کی ہے اس کی کاشت اور نگہداشت کے مصارف کم ہوتے ہیں، "کویہ" کے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ "کویہ" استعمال کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نیشکر کی چند چیڑیوں میں ایک لکڑی کھڑی کر دی جاتی ہے اور اس سے چیڑیاں باندھ دی جاتی ہیں تاکہ نیشکر نیچے گرنے نہ پائے ایسی لکڑیوں کی تعداد ایک ایکڑ میں تقریباً دس ہزار درکار ہوتی ہے جن کی قیمت بالاوسط ڈیڑھ سو روپیے ہوتی ہے۔ دیسی نیشکر بغیر کویہ کے اچھی طرح نشو ونما نہیں پا سکتا اس لئے یہاں کے کاشتکار دیسی نیشکر کی کاشت میں کویہ کا استعمال کرنے پر مجبور تھے اس کے برخلاف

کوئمبتور نمبر ۲۱۳ (۱) بغیر کوریہ کے اچھی طرح نشو ونما پاتا ہے۔ اس لئے کاشتکاروں کو مصارف میں کفایت ہوگئی ہے۔ علاوہ بریں محکمۂ زراعت نے ایسے چولھوں کو رواج دیا ہے کہ جن میں گڑ پکانے کے وقت ہیزم سوختنی استعمال کرنے کے بجائے نیشکر کا فضلہ (یعنی وہ اجزا جو رس نکالنے کے بعد پھینک دیئے جاتے ہیں) جلایا جا سکتا ہے۔ گڑ پکانے کے اس طریقہ سے بھی کاشتکاروں کے مصارف میں کمی ہوگئی ہے نہر کھل جانے کے بعد محکمۂ زراعت نے مزرعہ کو نظام ساگر سے ۱۳۴۰ف میں "رودرور" واقع تعلقہ بودھن میں منتقل کردیا ہے۔ اور اب وہاں یہ مزرعہ بطور مستقل قایم ہوگیا ہے جو ساٹھ ایکڑ اراضی پر مشتمل ہے جہاں عہدہ داروں اور عملہ وغیرہ کی رہائش کے لئے مکانات کی تعمیر ہوئی ہے۔ اس مزرعہ میں مختلف اقسام کے نیشکر مختلف موسموں میں کاشت کرکے تجربے کئے جاتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ مظاہرہ کرکے متصلہ مقامات کے کاشتکاروں کو جمع کیا جاتا ہے اور انہیں کاشت کے تجربے بتائے جاتے اور جدید اصول کاشت سکھائے جاتے ہیں علاوہ بریں بعض آلات زراعت پروپگنڈے کی خاطر انھیں مستعار دیئے جاتے ہیں۔ اس مزرعہ کے علاوہ ہر تعلقہ کے مستقر پر چھوٹے چھوٹے آزمایشی مزرعات بھی قایم کئے گئے ہیں۔

مزرعہ رودرور پر زرعی تعلیم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ جماعت کاشتکاران کے نام سے دو سال کا نصاب مقرر کیا گیا ہے اس جماعت کا مقصد زراعت اور اس سے قریبی تعلق رکھنے والے فنون کی عملی تعلیم دینا ہے تاکہ ایسے زراعت پیشہ خاندانوں کو فائدہ حاصل ہو سکے جن کا تعلق زمین سے براہ راست ہے اور جن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ زراعت کو پیشہ کی حیثیت سے اختیار کریں نصاب اس طور پر معین کیا گیا ہے کہ لڑکوں کے معلومات میں وسعت پیدا ہوسکے اور وہ اس قابل ہوجائیں کہ زرعی معاملات میں بہتر صورت پیدا کرسکیں۔

نہر کے تحت مثمر باغات کا شوق دلانے کے لئے نظام آباد میں ایک نرسری گارڈن قایم کیا گیا ہے جہاں مختلف انواع کے مثمر درختوں کے قلم تیار کئے جاتے۔ اور خواہش مندوں کو برائے نام قیمت پر دیئے جاتے ہیں۔ نیز نرسری گارڈن میں جو کامگار متعین ہیں وہ شوقین حضرات کی خواہش پر ان کے پاس جاکر مفید مشورے بھی دیتے ہیں۔ نظام آباد اور اس کے اطراف سنترے لگانے کا شوق بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ موز کے درخت لگانے کی جانب بھی بعض مقامات میں قابل قدر توجہ کی جارہی ہے اور یہاں کا موز حیدرآباد میں فروخت ہونے لگا ہے۔

نیشکر کی کاشت کی جو غیر معمولی ترقی ہوئی ہے اس کا ذکر کیا جاچکا ہے گزشتہ سال گڑ کی تجارت نظام آباد میں بقدر بیس لاکھ ہوئی۔ اور اس سال مزید اضافہ کی توقع کی جاتی ہے۔ گڑ سازی کی صنعت میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی وجہ سے گڑ برآمد کرنے کی ضرورت

نہیں رہی بلکہ نظام آباد کا گڑ ممالک محروسہ کے تمام اضلاع میں فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ علاقہ برار میں ایک کثیر مقدار اور کچھ مقدار دوسرے علاقہ ہائے انگریزی میں جایا کرتی ہے۔

کارخانہ شکر سازی کے قیام کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر غور تھا لیکن ارباب صدر نے اس کو جلد تر قایم کر دینے کا تصفیہ کیا ہے۔ اور وثوق کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ بودھن کا مقام موزوں سمجھا گیا ہے۔ یہ کارخانہ فی الحال ایک ہزار ٹن شکر تیار کرے گا لیکن اس میں اٹھارہ سو ٹن بنانے کی گنجایش بھی رکھی جائیگی۔ شکر سازی کا کارخانہ قایم ہونے سے نہ صرف کاشتکاروں کی خوش حالی میں اضافہ ہوگا بلکہ ملک کی تجارت میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ آبادی میں بھی اضافہ ہوگا اور قدرتی طور پر زمینات کی قدر و قیمت بھی بڑھ جائے گی۔

زرعی ترقی کے مدنظر مواضع زیر نہر میں۔ مزید آبادی کے لئے گنجایش نکالی جا رہی ہے یعنی توسیع آبادی کے لئے اراضی مختص کی جا رہی ہیں مواضع کی اصلاح کا کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ مقامی ضرورتوں کے لحاظ سے دیہی راستے بنائے جا رہے ہیں دیہی تنظیم کی انجمنوں کو قایم کرنے کی جانب توجہ کی جا رہی ہے۔ اور ان امور کو انجام دلانے کے لئے سررشتہ لوکل فنڈ نے بہ اوقات مختلف کثیر رقم کو منظور کیا ہے۔ ایک بڑے خزانہ آب کے لئے ایسے کاموں کو انجام دلانا بہت ہی ضروری تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ رقبہ ہائے زیر نہر میں طویل پختہ سڑکیں تعمیر کرانے کا اسکیم بھی سررشتہ مال میں زیر تجویز ہے۔ یہ نافذ ہو جائے گا تو اس کی وجہ سے مزید ترقی کی راہیں کشادہ ہو جائیں گی۔

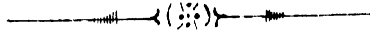
محکمۂ انجمن ہائے اتحاد کی جانب سے بھی کاشتکاروں کی مالی امداد کے تدابیر اختیار کئے جا رہے ہیں۔ اور اس امر کی کوشش بھی کی جا رہی ہے کہ مختلف مقامات میں سیل سوسائٹیاں قایم کی جائیں۔ اگر یہ جلد قایم ہو جائیں اور ان کے ذریعہ سے گڑ کی تجارت کو فروغ دیا جائے تو کاشتکاروں کے حق میں بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی۔ اور ان کی مرفہ الحالی میں معقول اضافہ ہوگا۔

ضلع نظام آباد میں اگرچہ صحرائی رقبہ کافی مقدار میں موجود ہے لیکن توسیع کاشت کے باعث چونکہ زرعی ضرورتیں بڑھتی جا رہی ہیں اور آیندہ آبادی میں بھی اضافہ ہونے والا ہے اس لئے سررشتہ جنگلات چوبینہ کی کافی سربراہی کے انتظامات پر بطور خاص غور کر رہا ہے۔ اور اس امر کی کوشش بھی شروع کی ہے کہ مزید رقبوں میں مفید اور کارآمد درخت لگائے جائیں۔ چنانچہ بعض مکانات میں بانس لگانے کی تجویز اختیار کی جا چکی ہے۔ اور نباتاتی کھاد بہم پہنچانے کے لئے ایسے نوعیت کے درختوں کو اگایا جا رہا ہے۔ اور ایسے مزید تجاویز کو وسیع پیمانہ پر عمل میں لانے کے لئے اسکیم منظور ہونے والے ہیں جس کی وجہ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جنگلات کی آمدنی میں بھی معقول اضافہ ہوگا۔

دنیا میں پانی بڑی نعمت ہے جس پر تمام کائنات کی زندگی کا انحصار ہے جہاں بکثرت پانی میسر آتا ہے وہ ممالک سرسبز و شاداب ہیں وہاں کی رعایا برابر مرفہ الحال ہے۔ ہندوستان میں جہاں کہیں بڑے بڑے ذخائر آب بنائے گئے یا وہ انگریزی عہد حکومت میں

تعمیر کئے گئے ایسے تمام مقامات سب سے زیادہ آباد اور سب سے زیادہ خوش حال ثابت ہوئے۔ نظام ساگر کی تعمیر سے ضلع نظام آباد کا معتد بہ رقبہ قلت بارش کے خوف و اندیشے محفوظ ہوگیا ہے جہاں ہر زمانہ میں مقررہ فصلوں کے لئے وافر پانی ملتا رہے گا اور کاشتکار فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ اس سے حصہ ملک کی زرخیزی کے ساتھ کاشتکاروں کی خوش حالی بھی بڑھتی جائے گی۔ غرض یہ کہ عہد عثمانی میں یہ ایک ایسا عظیم الشان کام انجام پایا ہے جو بقائے دوام حاصل کرے گا اور آئندہ نسلیں بجا طور پر فخر کریں گی۔ اب اہل ملک کا فریضہ ہے کہ وہ اس عظیم الشان ذخیرہ سے زرعی و اقتصادی نیز تجارتی فوائد حاصل کرنے کی جانب پیشقدمی کریں کیونکہ انھیں ایک وسیع میدان مل گیا ہے جہاں وہ جی کھول کر قسمت آزمائی کر سکتے ہیں۔

عبدالباسط بیگ متعلم سال چہارم



نئی دُنیا

مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائیں گے

(۱)

ہم آہنگیٔ فطرت سادگی مفہوم رکھتی ہو
مسلسل سوزِ اُلفت. زندگی مفہوم رکھتی ہو

مسرت، کیف، راحت. یک دلی مفہوم رکھتی ہو
پرستش محویت. وارفتگی. مفہوم رکھتی ہو

سرور و سحرِ نغمہ، خامشی. مفہوم رکھتی ہو
جہاں پر بے حسیٔ غم. ہنسی. مفہوم رکھتی ہو

مرے ہمدم وہیں اپنی نئی دنیا بسائیں گے

(۲)

کبھی بادل ہوا پر لوٹتا مستانہ وار آئے
برستا گنگناتا کوہساروں سے گزر جائے

فضا بھیگی ہوئی ہو پتے پتے پر نکھار آئے
درختوں، ندی نالوں سبزہ زاروں پر بہار آئے

لب دریا شفق کا عکس اور پودوں کے ہوں سائے
خمار و خواب کی دنیا میں فطرت ڈوب سی جائے

مرے ہمدم! وہیں اپنی نئی دنیا بسائیں گے

(۳)

تمہارے مسکرانے پر جہاں غنچے چٹکتے ہوں
تمہارے سانس کی موجوں سے رنگین گل مہکتے ہوں

تمہارے گنگنانے پر جہاں طائر چہکتے ہوں
تمہارے دیکھنے پر چاند اور تارے بہکتے ہوں

تمہیں مسرور پا کر چشمہ ہائے کوہ ہنستے ہوں
تمہارے قہقہوں سے جان فزا نغمے برستے ہوں

مرے ہمدم! وہیں اپنی نئی دنیا بسائیں گے

صمد رضوی ساز (عثمانیہ)

پھولوں کا قومی گیت

پنڈت دلشی دھر ہندی کے بلند پایہ شعرا میں سے ہیں۔ یہ نظم ہندی ہے اور ہندی عروض میں لکھی گئی ہے مگر زبان اتنی صاف اور سادہ ہے کہ ہر اُردو لکھا پڑھا سمجھ سکتا ہے۔
پنڈت جی ہندی کے اُن ادیبوں میں سے ہیں جو ہندی کو سنسکرت کے ادق الفاظ سے صاف کر کے ہندوستانی بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بہت بڑا ایثار ہے جو کوئی ہندی ادیب کر سکتا ہے۔

ادارہ

(۱)

آؤ پھولو، ہل مِل پھولیں　　ہنس ہنس ناچیں جھولے جھولیں

ایسی مہک ہوا میں بھر دیں　　دنیا کو مستانہ کر دیں

رہے دیکھتا وہ جو دیکھے　　تارے ہوں سب کی آنکھوں کے

(۲)

چپ ہو کر وہ گان سنائیں جس کو سب سنتے رہ جائیں
ایسا سب پر رنگ چڑھائیں جس سے ہم سب کے ہو جائیں
پیار کریں دل سے سب ہم کو ہم جگ سے جگ ہم سے خوش ہو

(۳)

ہم کو کچھ ہی دن میں کرنا پورے جیون بھر کا ہنسنا
اسی سے آؤ کریں دلگی جس سے دل میں اٹھے گدگدی
ایسے سب اپنے میں پھولیں سب میں پھولیں دلگی نہ بھولیں

پنڈت ونشی دھر ودیا النکار

اُستاد ہندی و سنسکرت

چاند بی بی

یہ بالکل سچ ہے کہ ہر پہاڑ کا دامن جواہرات کی کانوں سے مالا مال نہیں ہوتا اور نہ سمندر کی گہری تہ میں رہنے والی ہر سیپ اپنے اندر بیش بہا موتیوں کی پرورش کرتی ہے انسانی معاشرہ کا بھی بالکل یہی حال ہے۔ قدرت صدیوں بعد اس قابل ہوتی ہے کہ ایسا انسان پیدا کرے جو اس کی صنعتی قابلیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہو اگر حالات نے اس کا نشو و نما کیا تو جس قوم میں اُس کی تخلیق ہوتی ہے وہ قوم کا قابل فخر سرمایہ بن جاتا ہے مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کچھ حادثات زمانی اور کچھ معاشرتِ انسانی نے یا تو ایسے انسانوں کو ضائع کیا یا انہیں معمولی سطح سے ابھرنے نہ دیا خصوصاً جنس انسانی کے کمزور اور نازک طبقہ یعنی صنف نازک پر معاشرت کی بندشوں نے بہت زیادہ بے انصافیاں اور مظالم کئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ جب سے کہ وہ ایک داستان کی حیثیت رکھتی ہے اب تک معدودے اور چند کے سوا اس طبقے کی جولانیوں سے یکسر خالی ہے معاشرت کی بندشیں اس درجہ سخت نہ ہوتیں تو نہ معلوم سرزمین ہند ایسے کتنے چاند بیبیوں کو پیدا کرتی مگر چونکہ ایسا نہ تھا لہذا ایک کے سوا سب معدوم ہوگئیں اسی قابل قدر و قابل فخر ہستی کے حالات سے وطن کے ہر بچہ بچہ کو واقف رہنا ضروری ہے اور اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر اس مضمون میں چاند بی بی کے مفصل حالات کو سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یوروپین ارباب قلم نے ,,گولڈن ڈیڈس،، کے سب سے قیمتی اور قابل عزت سلسلہ واقعات میں ایک اسپینش عورت آگیٹنا کا واقعہ پیش کیا ہے کہ ۱۸۰۸ء میں جبکہ نپولین اور اسپین میں جنگ ہو رہی تھی آگیٹنا نے ایک سپاہی کے لئے کھانا لے جاتے ہوئے یہ خوفناک منظر دیکھا کہ دشمن کی

گولی نے ایک گولہ انداز سپاہی کا خاتمہ کر دیا دوسرے سپاہیوں نے بہتیری کوشش کی کہ مقتول سپاہی کی جگہ لیں مگر بندوقوں کی گولیاں ایسے زوروں سے برس رہی تھیں کہ سپاہی آگے بڑھتے ہوئے کانپ جاتے تھے، آگیناؔ دوڑ کر مقتول سپاہی کی جگہ پر پہونچی اور اس توپ میں جس کو مقتول سپاہی نے ٹھیک دشمنوں کے نشانہ پر رکھا تھا دیا سلائی لگادی اور آخر تک خدمت انجام دیتی رہی اس کی خدمت کو یورپ میں گولڈن ڈیڈس کا مایہ ناز کارنامہ سمجھا گیا اگر ناظرین چاند بی بی کے کارنامہ حیات سے اس کا مقابلہ کریں تو معلوم ہوگا کہ کس کا کارنامہ زیادہ تر تعریف وتحسین کا مستحق ہے۔

جیسا کہ تاریخ فرشتہ اور ماثر رحیمی کا بیان ہے چاند بی بی قرا محمد کی اولاد سے تھی اس کی ماں خونزہ ہمایوں مرزا خوجگی کی نواسی تھی جس کا سلسلہ نسب قرا محمد سے جا ملتا ہے جو ترکمانوں کے ایک قبیلہ قرا قو نیلو کا سردار تھا ۸۷۴ھ میں تاتاری نسل کے ایک قبیلے آق قو نیلو نے قبیلہ قرا قو نیلو کو شکست دے کر مار بھگایا تو مرزا خواجگی کا لڑکا میاں جیو احمد نگر چلا آیا اور نظام شاہ کے دربار میں ملازمت اختیار کرلی خونزہ ہمایوں اسی کی لڑکی تھی جس کو میاں جیو نے حسین نظام شاہ سے بیاہ دیا اور اس کے بطن سے چاند بی بی پیدا ہوئی (۹۵۰ھ)

افسوس ہے کہ چاند بی بی کے بچپن کے حالات کا کسی مورخ نے بھی تذکرہ نہیں کیا البتہ علی عادل شاہ سے شادی کے بعد اس کی تاریخی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جس کو مختلف مورخین نے شرح وبسط سے قلم بند کیا ہے علی عادل سے چاند بی بی کی شادی کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ اس زمانہ میں رام راج والئی بیجانگر کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی جس سے دکن کی سلطنتیں بہت خائف ہوگئیں بیجانگر کے حدود سلطنت بھی وسیع ہوگئے تھے۔ رام راج اتنا قوی ہو گیا تھا کہ وہ ایک ایک کرکے سلاطین دکن کو آسانی کے ساتھ مغلوب کرسکتا تھا۔ اس ڈر سے علی عادل شاہ والئی بیجاپور نے گولکنڈہ اور احمد نگر سے رشتۂ اتحاد جوڑنا چاہا تاکہ وقت پڑے تو متحدہ طور پر بیجانگر کو شکست دی جاسکے چنانچہ اس مقصد کے لئے علی عادل شاہ نے کشور خاں اور ابوتراب خاں کو ابراہیم قطب شاہ کے پاس روانہ کیا ابراہیم کو یہ تجویز بہت پسند آئی اور اس اتحاد کو مزید قوت بخشنے کے لئے اس نے اپنے وزیر مصطفےٰ خاں کو حسین نظام شاہ والئی احمد نگر کے پاس روانہ کیا حسین نظام شاہ نے بھی اس اتحاد کو پسند کیا اور مستحکم کرنے کے لئے حسین نظام اور علی عادل شاہ نے آپس میں شادی بیاہ کے رشتے بھی جوڑے چنانچہ طے پایا کہ حسین نظام کی بیٹی چاند بی بی کی شادی علی عادل شاہ سے کردی جائے اور علی عادل شاہ اپنی بہن ہدیہ سلطان کی شادی حسین نظام کے لڑکے مرتضیٰ نظام شاہ سے کردے مصطفےٰ خاں کے ذریعہ یہ بھی طے پایا کہ چاند بی بی کے جہیز میں شولاپور کا پرگنہ جو عرصہ دراز سے حسین نظام اور علی عادل شاہ کے درمیان باعث نزع تھا بیجاپور کو دیدیا جائے۔ حسین نظام نے یہ تجویز بھی منظور کرلی۔ ان امور کے طے پانے کے بعد طرفین سے نہایت دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ دونوں شادیاں ایک ہی تاریخ کو عمل میں آئی اور دونوں دلہنیں ایک سے دوسرے مقام کو ایک ہی

دن رخصت ہوئیں اس موقع پر احمد نگر اور بیجا پور دونوں شہروں کو نہایت شاندار پیمانے پر سجایا گیا تھا۔ اس تقریب کا بیان بساتین السلاطین میں بہت تفصیل سے کیا گیا ہے۔

سلطان علی عادل شاہ کی وفات ایک بریدی غلام کے ہاتھ ۹۸۸ھ میں واقع ہوئی علی عادل شاہ کو کوئی اولاد نہ تھی اس لئے اس نے اپنے بھتیجے ابراہیم کو ۹۸۷ھ میں ولیعہد کیا تھا علی عادل شاہ کی وفات کے بعد سلطنت میں بدنظمیاں پھیل گئیں بادشاہ کمسن تھا جو شخص بھی اتالیق بنایا جاتا وہ اپنے اختیارات وسیع کرکے سلطنت کے جزو وکل پر حاوی ہو جاتا تھا کامل خاں کو وکیل السلطنت بنایا گیا تو وہ اقتدار کا اس قدر شایق تھا کہ اس نے بادشاہ کی شخصیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا اس کے حکم سے یہ قاعدہ مقرر ہو گیا تھا کہ چہارشنبہ اور جمعہ کے سوا باقی دنوں میں چاشت کے وقت ابراہیم کو حرم سے نکالا جاتا اور تخت شاہی پر بٹھایا جاتا تمام ارکین جمع ہونے کے بعد کامل خاں ہر ایک امیر کے واسطے مناصب وخطابات تجویز کرتا اپنے وسیع اختیارات کو کام میں لاکر اس نے تمام ذمہ دار عہدوں پر اپنے لوگوں کا تقرر کرنا شروع کیا اس کے بعد اس سے چند ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں کہ لوگوں کو اس کے متعلق شبہ ہونے لگا خصوصاً چاند بی بی کو جس کی زیر تربیت ان دنوں شاہ ابراہیم تھا۔ کامل خاں کی یہ حرکتیں بہت ناگوار گذریں اور اس نے بہت ہی سخت الفاظ میں کامل خاں کو ڈانٹا کامل خاں نے چاند بی بی کو سخت گستاخانہ جواب دیئے یہ دیکھ کر چاند بی بی نے کامل خاں کی بیخ کنی کا مصمم ارادہ کر دیا۔ اس زمانہ میں کشور خاں شاہی امیروں میں بڑے پایہ کا شخص تھا چاند بی بی نے کشور خاں کو کامل خاں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا مگر جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوا تو روئی اور چرخہ سمیت اس کے پاس پیغام بھیجا کہ کامل خاں وکالت کے لایق نہیں ہے اگر تجھے اپنے باپ کی میراث لینا ہے تو میں تجھے یہ منصب دیتی ہوں ورنہ چرخہ پونی موجود ہے یہ لو اور زنانہ لباس پہن کر گھر میں بیٹھو۔[۵]

اس عبرت آمیزی سے کشور خاں کا جذبۂ عمل بھی حرکت میں آیا اور اُس نے حصول مقصد کے لئے کل ارکین سلطنت کو اپنے موافق بنایا کامل خاں کو جب ان کارروائیوں کی اطلاع ہوئی تو وہ انھیں محض بازیچۂ طفلاں سمجھا مگر جب کشور خاں چار سو سواروں کے ساتھ اس کو گرفتار کرنے کے لئے آیا تو آنکھیں کھلیں اور پناہ لینے کی خاطر وہ فوری چاند بی بی کے پاس بھاگا اس کے ایک خواجہ سرا نے اس سے کہا کہ آپ کو کچھ بھی خبر نہیں یہ تمام کارروائیاں محض چاند بی بی کے اشارے سے ہو رہی ہیں اور اس نے آپ کے استیصال کا قصد کیا ہے کامل خاں اس سے اور بھی پریشان ہوا اور اپنے مکان کا راستہ لیا۔ شہر پناہ کا دروازہ بند تھا اس لئے وہ فصیل پر چڑھا جس کا ارتفاع بارہ گز بیان کیا جاتا ہے اور دیوار کے ایک کنگرہ سے رومال باندھ کر لٹک گیا اور خندق میں پھاند کر بخیریت اپنے مکان پہونچ اور وہاں سے آٹھ نو جانثار لے، احمد نگر کا راستہ لیا چاند بی بی نے

---

[۵] تاریخ دکن

کشور خاں کو اس کے تعاقب کا حکم دیا اور وہ شہر سے چار میل بھی نہ گیا ہوگا کہ کشور خاں کے سپاہیوں نے اُسے جا پکڑا اور شیر بچہ نامی ایک شخص نے نیچے گرا کر اس کا سر کاٹ لیا۔[۱]

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد کشور خاں منصب وکالت پر فائز ہوگیا چند روز تک تو رعایا اس سے بہت خوش رہی مگر حکومت کے جوش اور جذبۂ جاہ طلبی سے متاثر ہو کر اس نے بھی چند ایسی کارروائیاں کیں کہ خود چاند بی بی اس سے ناراض ہوگئی کشور خاں نے افضل خاں کو بھی ناراض کر دیا جو اس زمانہ میں بیجانگر اور گولکنڈہ سے لڑائی کر کے مظفر و منصور واپس آ رہا تھا اس نے چاند بی بی سے بغیر مشورہ کئے افضل خاں کو لکھا کہ مال غنیمت میں جتنے ہاتھی اور دولت مل جائے بیجاپور روانہ کر دے اس سے کشور خاں کے علانیہ طور پر دشمن بن گئے اسی وقت ایک مخفل مشورت منعقد ہوئی اور طے یہ پایا کہ مصطفیٰ خاں کو بنکاپور سے بلوا کر وکیل سلطنت بنانا چاہئے ایک اور مورخ لکھتا ہے کہ خود افضل خاں نے چاند بی بی کو ایک عرضی بھیجی تھی جس میں اس نے کشور خاں کی شکایت کی اور اس میں اشارۃً منصب وکالت کے لئے مصطفیٰ خاں کی سفارش کی مگر کشور خاں کو اس سازش کا پتہ چل گیا اور پھر اس نے اپنے ایک ہوا خواہ محمد امین کے ذریعہ خاص بنکاپور میں مصطفیٰ خاں کو حالت نماز میں مروا ڈالا۔

مصطفیٰ خاں اہل بیت سے تھا خود چاند بی بی بھی اہل بیت سے تھی اس جانکاہ واقعہ کو سن کر اس نے کشور خاں کو بہت ہی بُرا بھلا کہا اور علانیہ طور پر امرا کو ترغیب دی کہ وہ کشور خاں کا دفعیہ کریں اس مخالفت سے کشور خاں نے چاند بی بی کی بیخ کنی کرنی چاہی اور موقع کا طالب رہا اور آخر کار ایک روز موقع پا کر اس نے چاند بی بی پر یہ الزام لگایا کہ وہ سلطنت بیجاپور کی بدخواہ ہے اور سلطنت کے ہر راز سے اپنے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ والی احمد نگر کو واقف کرا دیتی ہے لہٰذا وہ اس قابل نہیں ہے کہ محل کے اندر رہ کر امور سلطنت سے تعلق رکھے اس بہانہ سے کشور خاں نے چاند بی بی کو قلعہ ستارہ بھیجنے کے لئے بلوایا مگر جب وہ نہ آئی تو اس نے حرم کے خادموں کو حکم دیا کہ وہ اس کو جبراً محل سے باہر لے آئیں مگر جب کسی خادم نے اس کی تعمیل نہ کی تو خود اس کے آدمی محل کے اندر گھسے اور نہایت بیدردی اور ذلت کے ساتھ چاند بی بی کو حرم سے باہر لے آئے اور پھر کشور خاں نے اس کو علی الاعلان قلعہ ستارہ میں قید رکھنے کے لئے بھیجدیا۔ فرشتہ اس واقعہ کو نہایت تفصیل کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے کہ چاند بی بی کی کنیزوں کو بیلوں پر سوار کرا کے دن کے وقت نکالا گیا وہ سر و پا برہنہ تھیں اور سر بازار کشور خاں کو کوستی اور روتی پیٹتی جاتی تھیں عورتوں کی گریہ و زاری سے شہر میں ایک تہلکہ مچ گیا تھا اور ہر شخص کے دل میں کشور خاں سے نفرت پیدا ہوگئی تھی اس کام کو رات میں بھی کیا جا سکتا تھا مگر کشور خاں نے اس کو دن میں کر کے اور بھی بُرا کیا نیز اس نے ان کنیزوں کو بھی نکال دیا جن کو علی عادل شاہ نے خاص اپنے لئے جمع کیا تھا اور انھیں اجازت دیدی کہ وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں کشور خاں کی ان گستاخیوں سے رعایا اور برہم ہوگئی اس زمانہ میں ایک

---

[۱] تاریخ فرشتہ جلد سوم

معمولی واقعہ سے بادشاہ کی ماں بڑی بیگم بھی ناراض ہوگئی امرائے جوش بھی اس کے خلاف ہو گئے اِن سب ناموافق واقعات نے کشور خاں پر ثابت کردیا کہ اس کے زوال کی ساعت قریب آپہونچی ہے اس لئے وہ جان بچاکر بیجاپور سے بھاگا مگر گولکنڈہ میں مصطفےٰ خاں کے ایک رشتہ دار نے اس کو قتل کردیا۔

کشور خاں کے بعد اخلاص خاں وکیل السلطنت مقرر ہوا۔ اس نے چاند بی بی کو قلعہ ستارہ سے واپس بلوایا اور حسب سابق اس کو سلطان ابراہیم کی تعلیم و تربیت پر مقرر کیا نیز چاند بی بی کی رائے سے افضل خاں کو دوبارہ پیشوا مقرر کیا۔ اخلاص خاں نے یہ سب کارروائی محض اس لئے کی کہ عوام میں ہر دلعزیز ہو جائے۔ کامل خاں اور کشور خاں امرائے غریب سے تھے مگر اخلاص حبشی تھا حبشی تعداد میں کم تھے ان میں اتفاق بھی نہ تھا۔ نیز لوگ ان کو ذلیل سمجھا کرتے تھے۔ چاند بی بی نے اختیار پاتے ہی اپنی توجہ امرائے غریب کی طرف پھیر دی اخلاص خاں کو جب اس کا کھٹکا ہوا تو اُس نے ان امرا کے استقبال کے لئے نہایت ہی ظالمانہ کارروائی شروع کی۔ تاکہ انھیں کمزور کرکے چاند بی بی کے اقتدار کو زائل کردے۔ سب سے پہلے اس نے کشور خاں کے پسماندوں کی طرف توجہ کی اور انھیں قتل کرنا شروع کیا اس کے بعد ایک غلام یاقوت نامی کو جو ابراہیم کی خدمت میں رہتا تھا مارڈالا اور اس کے ٹکڑے بناکر شہر کے ہر دروازہ پر ایک ایک ٹکڑا بھیجدیا تاکہ ٹانگ دیا جائے اور پھر حکم دیا کہ کشور خاں کی عورتوں کو بھنگی چماروں کو دیدیا جائے کیونکہ کشور خاں نے شاہی حرم کی عورتوں کی ذلت کی تھی۔ اس کے ان تمام افعال میں ذاتی اغراض محرک تھے جو کسی طرح پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھے گئے۔ اور افضل خاں رفیع الدین اور چاند بی بی اس کے سخت مخالف ہوگئے اخلاص کو افضل خاں اور رفیع الدین کا بہت ڈر تھا موقع پاکر اُس نے ان دونوں بھائیوں کو پابہ زنجیر کرلیا اور کچھ ہی دیر بعد ایک شخص آکر افضل خاں کو جیل خانہ سے باہر لے گیا۔ اور اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کرڈالے۔ دو روز تک لاش بے گور و کفن سڑک پر پڑی رہی۔ اور دو روز کے بعد اس کو فتح اللہ شیرازی کے نوکروں نے دفن کردیا۔ رفیع الدین[1] کے قتل کے سامان بھی فراہم ہو گئے تھے مگر چند آدمیوں نے بیچ میں پڑکر اس کی جاں بخشی کرائی اس زمانہ میں دیگر جو بدنظمیاں پھیلیں ان کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان سب کے اندراج کی گنجایش نہیں۔ البتہ ایسے وقت چاند بی بی کے تدبیر اور سیاسی دانشمندی نے بگڑے ہوئے حالات کو چند روز کے لئے سنبھال دیا۔

اس موقعہ پر اُس نے اخلاص خاں کو طلب کیا اور حالات کی نزاکت جتا کر اسے راضی کرلیا کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے عہدہ وکالت سے دست بردار ہو جائے۔ کیونکہ اس کی نیابت سے رعایا اور دیگر امرا میں سخت بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ اخلاص خاں ایک تندمزاج اور سخت گیر آدمی

---

[1] رفیع الدین شیرازی بیجاپور کا مشہور مورخ گزرا ہے اس نے تذکرۃ الملوک لکھی ہے جو بیجاپور کے بارے میں تاریخ فرشتہ سے بھی مستند کتاب ہے۔

ہونے کے باوجود چاند بی بی کے اس تجویز سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوا اور اس کی جگہ پر چاند بی بی نے شاہ ابوالحسن کو وکیل سلطنت مقرر کیا اس زمانہ میں تین شخصیتیں اقتدار کے لئے کوشاں تھیں۔ ایک تو دلاور خاں جو قطب شاہ اور نظام شاہ سے جنگ کرنے کے بعد واپس آیا تھا دوسرے شاہ ابوالحسن جو مستقل ہونے کی ممکنہ تجاویز سوچ رہا تھا۔ تیسرا اخلاص خاں جس کا اب بھی سلطنت میں کافی اثر اور اقتدار تھا اس فرقہ وارانہ جنگ میں دلاور خاں کامیاب رہا۔ اخلاص خاں اور ابوالحسن کو اُس نے گرفتار کرکے قید کر لیا اور قید میں دونوں کی آنکھیں نکلوادیں اور دونوں نے قید ہی میں وفات پائی۔

دلاور خاں ایک سیاس دوراندیش اور مدبر شخص تھا اپنی حیثیت کو استحکام دینے اور مستقل کرنے کے لئے اُس نے دوسری سلطنتوں سے شادی بیاہ کے رشتے جوڑے جس میں اسے کامیابی ہوئی۔ اس نے ابراہیم عادل شاہ کی طرف سے صلابت خاں وکیل السلطنت مرتضیٰ شاہ کے پاس ایلچی بھیجا۔ اور اُس سے دوستی پیدا کی اس دوستی کے باعث مرتضیٰ شاہ نے ۹۹۲ھ میں ابراہیم عادل شاہ کے نام ایک خط بھیجا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر ابراہیم عادل شاہ اپنی بہن بی بی خدیجہ کو اُس کے بیٹے میراں حسین سے بیاہ دے تو اس خلوص واتحاد میں اور ترقی ہوگی۔ عادل شاہ نے اس کی درخواست کو بخوشی منظور کر لیا۔ طرفین سے شادی کی دھوم دھام سے تیاریاں ہوئیں۔ مرتضیٰ شاہ کی جانب سے قاسم بیگ بڑے بڑے امراء اور چارسو خاصہ فیل لیکر نہایت شان وشوکت سے دلہن کو لینے کے لئے بیجاپور آئے دولہے والے بیجاپور کے قریب شاہ پور میں ٹھیرے چار مہینے تک فریقین میں پُر لطف طریقہ پر شادی کے جشن منائے گئے اور ناچ رنگ ہوتے رہے اور پھر دلہن کی پالکی روانہ ہوئی۔ چاند بی بی بھی دُلہن کو پہونچانے کے لئے احمد نگر روانہ ہوئی۔ اس کی علی عادل شاہ سے شادی ہوکر (۲۱) سال گذر چکے تھے۔ مگر اس نے اب تک اپنے بھائی مرتضیٰ شاہ سے ملاقات نہ کی تھی نیز وہ خدیجہ سلطانہ سے بہت اُلفت رکھتی تھی اور اس کی مفارقت اس کو ہرگز گوارہ نہ تھی اس لئے ہی اب وہ بیجاپور میں ٹھیرنا نہ چاہتی تھی فرشتہ کی روایت کے بموجب یہ قافلہ ۹۹۳ھ میں احمد نگر پہونچا۔ اور وہاں بھی نہایت شاندار جشن اور خوشیاں منائی گئیں۔

مگر یہ رشتہ اتحاد بہت ہی عارضی ثابت ہوا کیونکہ اس کے چند ہی روز بعد جب دلاور شاہ نے قطب شاہی خاندان سے شادی بیاہ کے تعلقات قایم کرنا چاہے اور جیسا کہ دکن کی اکثر تاریخوں میں مذکور ہے محمد قلی قطب شاہ کی حقیقی بہن چاند سلطان سے ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور سے شادی کرنا چاہا تو یہ امر صلابت خاں نائب سلطنت احمد نگر کو ناگوار گذرا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سلطنت گولکنڈہ صرف احمد نگر سے دوستانہ تعلقات رکھے۔

محمد قلی قطب شاہ صلابت خاں سے دشمنی مول لینا نہ چاہتا تھا جب اس کو صلابت خاں کی ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے دلہن کی پالکی بھیجنے میں پس وپیش کیا اس واقعہ سے دلاور خاں کو بھی رنج ہوا۔ پھر چاند بی بی اور علی عادل شاہ کی بیجاپور سے واپسی کے بعد صلابت خاں نے دلاور خاں سے علاقہ شولاپور جو چاند بی بی کے جہیز میں دیا گیا تھا واپس مانگا۔ دلاور خاں نے واپس کرنے سے انکار کیا اس بنا پر صلابت خاں اور دلاور خاں میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ یہ تمام کارروائیاں کچھ اس راز دارانہ طور پر کی گئی تھیں کہ مرتضیٰ نظام شاہ کو اس کی مطلق خبر نہ تھی۔ جب

اس کو خبر ہوئی تو وہ صلابت خاں سے بہت ناراض ہوا اور اس کو بلا کر سوال کیا کہ تو حلال خور ہے یا حرام خور۔ صلابت خاں نے عرض کیا کہ جہاں پناہ کے حکم کے تابع ہوں جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں گا۔ مرتضیٰ نے اس سے کہا کہ میں تجھ سے بہت ناراض ہوا۔ اور تیری نیابت کو پسند نہیں کرتا گر مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں کہ تجھ کو علیحدہ یا قید کر سکوں اس لئے مجبور ہوں صلابت خاں نے نہایت وفاداری سے جواب دیا کہ مجھے جس قلعہ میں قید ہونے کا حکم صادر فرمایا جائے تو میں بخوشی اپنی راضی سے وہیں جا کر قید ہو جاؤں گا۔ مرتضیٰ نے کہا وندا راجپوری میں چلا جا۔ صلابت خاں نے اس حکم کی تعمیل کر کے اپنی وفاداری اور حکم برداری کی ایک لاثانی نظیر چھوڑ دی۔ وہ فوراً اپنے گھر آیا قیدیوں کی طرح پیروں میں بیڑیاں ڈلوائیں اور دوستوں کے منع کرنے کے باوجود قلعہ وندا راجپوری جا کر قید ہو گیا۔ مرتضیٰ شاہ نے قاسم بیگ کو وزارت کے عہدہ پر مقرر کیا اور بہرلاور خاں سے بھی صلح کر لی۔ اس زمانہ میں سلطنت احمد نگر میں چند ایسے بدنظمیاں پیدا ہوئیں کہ مرزا خاں وزیر سلطنت کے ایما سے شہزادہ میران حسین نے اپنے باپ مرتضیٰ شاہ کو حمام میں سخت عقوبت کے ساتھ جلا کر اور پانی کو ترسا ترسا کر مار ڈالا اور خود تخت سلطنت پر متمکن ہو گیا[۵] اور پھر کچھ ہی روز بعد مرزا خاں نے میران حسین کو بھی قتل کر دیا اور اس کی جگہ اسمٰعیل بن شاہزادہ کو تخت پر بٹھایا اور پھر اسی زمانہ میں بہت جلد احمد نگر میں سنی شیعہ کے مذہبی فسادات پھیل گئے جس میں مرزا خان مارا گیا اور ملک میں امرا کی وہ انقلاب انگیز جنگ چھڑی کہ حکومت متزلزل ہو گئی اور اغیار کو ملک پر چڑھائی کرنے کا موقع ملا۔ شہنشاہ اکبر کی اعانت سے برہان نظام شاہ تخت احمد نگر پر قابض ہو گیا جس کی اس کو مدت سے آرزو تھی۔ چار سال کچھ ماہ حکومت کرنے کے بعد برہان شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی وصیت کے بموجب ابراہیم نظام شاہ کو بادشاہ بنایا گیا مگر اس کو قتل کر دیا گیا۔ اس زمانے میں وزیر السلطنت میاں منجھو کو امور سلطنت میں بہت دخل تھا ابراہیم نظام شاہ کے قتل کے بعد اس نے اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے ممکنہ مساعی کیں اور شاہی خزانہ پر بھی قابض ہو گیا۔

برہان نظام شاہ اول کے انتقال کے بعد جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے۔ حسین نظام شاہ اس کا جانشین کیا گیا تھا حسین نظام شاہ کے خوف سے محمد خدا بندہ اور اکثر امرا ادھر ادھر فرار ہو گئے تھے ایک مدت دراز کے بعد ایک شخص حوالی احمد نگر میں آیا اور بیان کیا کہ میرا نام شاہ طاہر ہے شہزادہ خدا بندہ کا بیٹا ہوں میرا باپ بنگالہ میں مر گیا ہے۔ حوادث روزگار سے مصیبتیں اٹھا کر میں اپنی موروثی سلطنت میں پناہ لینے آیا ہوں اس وقت مرتضیٰ شاہ کا عہد اور صلابت خاں کی نیابت تھی صلابت خاں نے اگرچہ اس کی تحقیق کی مگر جب کافی ثبوت نہیں ملا تو اس کو قلعہ دولت آباد میں قید کر دیا[۶]۔

---

[۵] تاریخ فرشتہ

[۶] تاریخ فرشتہ مقام

شاہ طاہر کا قلعہ میں ہی انتقال ہو گیا اس کا ایک بارہ سالہ لڑکا احمد شاہ تھا۔ میاں منجھو نے اخلاص خاں اور دیگر امرائے حبوش اور چاند بی بی کو بلوایا اور بادشاہ بنانے کے متعلق گفتگو کی اس کا ارادہ تھا کہ احمد شاہ کو تخت نشین کرے جو لوگوں میں مجہول النسب مشہور تھا مگر امرائے حبوش اور چاند بی بی نے اس کی مخالفت کی ان کا ارادہ تھا کہ ابراہیم کے لڑکے بہادر شاہ کو بادشاہ بنایا جائے جس کی عمر اس وقت ڈیڑھ سال کی تھی مگر میاں منجھو نے اعتراض کیا کہ ایسے کمسن لڑکے کو بادشاہ جیسا ذمہ دار عہدہ دینے سے کیا فائدہ بادشاہ کم از کم ایسا ہونا چاہئے جو اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگا ہو اس نے کہا کہ شاہی خاندان کا ایک بارہ سالہ لڑکا قلعہ دولت آباد میں مقید ہے۔ میرے نزدیک وہ اس شیر خوار بچے سے تخت شاہی کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ امرائے حبوش نے میاں منجھو کے اس ارادہ سے اتفاق کر لیا مگر چاند بی بی کبھی راضی نہ ہوئی تاہم میاں منجھو نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور قلعہ دولت آباد سے احمد شاہ کو بلوا کر عین عید الضحیٰ کے دن ۱۰۰۳ھ میں اس کو بادشاہ بنا دیا اور اس روز خطبہ میں اس کے نام کا خطبہ پڑھوایا گیا۔ میاں منجھو نے بادشاہ کو جبراً قہراً چاند بی بی کی سرپرستی سے نکال کر قلعہ جوند میں قید کر دیا۔

چاند بی بی خاموش بیٹھنے والی نہ تھی اس نے اہلیان و ارکین دولت کو یقین دلایا کہ احمد شاہ شاہی نسل سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک مجہول النسب لڑکا ہے۔ جب یہ بات مشہور ہو گئی تو امرا میاں منجھو سے ناراض ہو گئے۔ اور میاں منجھو سے لڑنے کے لئے مستعد ہو گئے۔ لڑائی میں اخلاص خاں حبشی اور چاند بی بی کی کوششوں سے میاں منجھو کو شکست ہوئی۔ اخلاص نے قلعہ جوند کو سپاہی بھیجے کہ بہادر شاہ کو چھڑا کر لائے۔ مگر قلعہ دار میاں منجھو کا طرفدار تھا اس نے بادشاہ کو رہا کرنے سے انکار کیا اس پر اخلاص خاں نے میاں موتی ایک طفل مجہول النسب کو احمد نگر کے بازار سے پکڑا اور شاہی خاندان سے منسوب کر کے اسے بادشاہ بنا دیا۔

اب میاں منجھو بہت پریشان ہوا اس کی ساری امیدیں منقطع ہو گئیں اس نے شاہزادہ مراد کو جو اس زمانہ میں شہنشاہ اکبر کی طرف سے گجرات کا صوبہ دار تھا امداد کے لئے لکھا مغلوں کی آنکھیں کئی دن سے دن کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ مراد نے اس موقع کو غنیمت جانا اور آٹھ ہزار کی ایک فوج لے کر عبدالرحیم خانخاناں، شاہ رخ مرزا، شہباز خاں اور راجہ جگناتھ و دیگر اہالیان و امرا کے ساتھ احمد نگر کا رخ کیا مگر اس زمانہ میں اخلاص خاں اور امرا میں کچھ ایسی ناچاقی ہوئی کہ وہ اخلاص خاں کا ساتھ چھوڑ کر میاں منجھو کے طرفدار ہو گئے اب میاں منجھو کا پلہ پھر زبردست ہو گیا۔ مغلوں کی کمک کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر شہزادہ مراد تیس ہزار فوج لے کر احمد نگر پہونچ گیا۔ اور میاں منجھو کو طلب کیا۔ میاں منجھو نے ہر چند اس بلا کو ٹالنا چاہا مگر کسی طرح اس کا دفعیہ کا امکان نہ تھا۔ لہذا اس نے بہت سے زر و جواہر اور خزانہ مع قلعہ کے چاند بی بی کے حوالہ کیا اور خود گولکنڈہ اور بیجاپور کی طرف افواج کی امداد مانگنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ چاند بی بی نے اب حصول اقتدار کا بہترین موقع دیکھا۔ پہلے تو اس نے محمد خاں امیر کے ذریعہ سے انصار خاں کا خاتمہ کر دیا کیونکہ اس سے خوف تھا کہ کہیں وہ میاں منجھو کا طرفدار نہ ہو جائے اور پھر قلعہ احمد نگر

مغلوں کے حوالہ کردے۔ اور پھر اسی روز بہادر شاہ کے نام کا غائبانہ خطبہ پڑھوایا میاں موتی کو اخلاص خاں نے گرفتار کر لیا۔

اس وقت بیجاپور کے پانچ دعویدار تھے۔ اول چاند بی بی جو بہادر شاہ کو بادشاہ سمجھتی تھی دوسرے میاں منجھو جو احمد شاہ کا طرفدار تھا۔ تیسرا اخلاص خاں جس نے موتی شاہ کو شاہ شطرنج قرار دیا تھا چوتھا آہنگ خاں حبشی جس نے شاہ علی بن برہان شاہ اول کو بادشاہ بنا رکھا اور پانچویں مغل حملہ آور۔

حکومت اشرافیت کے اس ڈھانچہ میں اتحاد و اتفاق کا عنصر بالکل مفقود تھا۔ البتہ اس منتشر فضا اور سیاسی بدنظمی میں چاند بی بی نے جو اہم ترین ملکی خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی اس کی جہد پرور مساعی اولوالعزمی اور اعلیٰ حوصلگی سے کہنا چاہئے کہ احمد نگر کی اس طوفان خیز سیاسی سمندر میں حکومت کی کشتی ایک عرصہ کے لئے صحیح وسلامت برقرار رہی۔ ورنہ اس کا کب کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ چاند بی بی نے اس وقت نہایت عزم و استقلال سے کام لیا پہلے تو اس نے ملک کے بہترین انتظامات کئے امراء کو ان کے باہمی نفاق اور دشمنی سے ملک کا واسطہ دے کر غیرت دلائی اور ان میں اتحاد و اتفاق کی روح پھونک دی۔ پھر اس نے شاہ بیجاپور اور گولکنڈہ سے فوجی امداد طلب کی اور انھیں یقین دلایا کہ اگر وہ اس وقت احمد نگر کی امداد نہ کرینگے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ مغل احمد نگر پر قابض ہو جائیں گے اور پھر وہ کل دکن پر محیط ہو کر خود سلطنت بیجاپور و گولکنڈہ کا بھی خاتمہ کر دیں گے۔ اس غیرت دلانے میں واقعی حقیقت پوشیدہ تھی جس کا بیجاپور اور گولکنڈہ کو احساس ہوا اور انھوں نے ساٹھ ہزار فوج سے چاند بی بی کی مغلوں کے خلاف مدد کی۔ احمد اللہ صاحب اپنی کتاب "چاند بی بی" میں بیان کرتے ہیں کہ اتنا عظیم الشان لشکر تالی کوٹہ کی لڑائی کے بعد اب تک کسی موقع پر جمع نہ ہوا تھا۔

مغلوں کا مقابلہ سب سے پہلے اخلاص خاں کی فوج سے ہوا۔ خانخاناں نے اس کے مقابلہ کے لئے دولت خاں کو جو اکبری فوج کے منتخبہ سپاہیوں میں تھا روانہ کیا جس نے اخلاص خاں کو شکست فاش دی اور ان کو اتنا لوٹا کہ ایک مورخ کے تاریخی بیان کے سپاہیوں کے پائجامہ تک اتروا لئے اور آہنگ خاں چاند بی بی کے مدد کے لئے سات ہزار کا ایک جرار لشکر لے کر آیا اور مشرق کی جانب سے حملہ کرنا چاہا۔ کیونکہ اس سمت میں مغلوں کی کوئی فوج وغیرہ نہ تھی آہنگ خاں کو یقین تھا کہ وہ بآسانی چاند بی بی سے ملنے کے لئے قلعہ میں داخل ہو سکے گا۔ مگر دوسری طرف شہزادہ مراد حصار کے معائنہ کے لئے آیا تا کہ قیام کے لئے مناسب جگہ کی تلاش کرے۔ تو اس نے مشرقی سمت کو خالی پا کر خانخاناں کو اس کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا۔

خانخاناں اب تک باغ ہشت بہشت میں خیمہ زن تھا حکم پاتے ہی وہ اسی روز مشرق میں آ گیا۔ آہنگ خاں کو ان انتظامات کی مطلق خبر نہ تھی چنانچہ جب وہ آیا ہے تو خانخاناں کے دو تیر اندازوں نے اس پر تیر برسانا شروع کئے ادھر دولت خاں تو وہی نے چارسو جوانوں کے ساتھ دھاوا کر دیا آہنگ خاں کو اگرچہ شکست ہوئی تاہم عین وقت پر شاہ علی کی مدد سے وہ قلعہ میں چاند بی بی کے پاس پہونچ گیا۔

اس زمانہ میں سہیل خاں کی سرکردگی میں شاہ بیجاپور گولکنڈہ اور میاں منجھو کی کثیر (۶۰) ہزار فوج بھی احمد نگر کی طرف روانہ ہوئیں۔ ان افواج کے پہونچنے کے پہلے ہی شہزادہ مراد نے کوشش کی کہ احمد نگر کی تسخیر کرلے مگر چاند بی بی کے استقلال کے سامنے اس کی ایک بھی پیش نہ گئی اس نے تین ماہ تک احمد نگر کا محاصرہ کیا مگر قلعہ کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ چاند بی بی نے نہایت ہی عدیم النظیر استقلال و بہادری سے ان کا مقابلہ کیا جیسے جیسے مغلوں کے مورچے قلعہ کے قریب ہوتے جاتے چاند بی بی اپنی بندوق اور توپوں کی گولہ باری سے انھیں دور ہٹا دیتی۔ چاند بی بی کا یہ وہ کارنامہ ہے جو حقیقت میں حروف زریں سے لکھا جانے کے قابل ہے اس کے اس دلیرانہ شمشیر زنی اور قوت جنگ سے متاثر ہو کر ایک مورخ رقمطراز ہے کہ ایسے نازک وقت میں نظام شاہی خاندان میں درحقیقت سلطنت کا اگر کوئی اور حقدار وارث تھا تو یہی عورت تھی۔ وہ بہادر بھی تھی عالمہ بھی تھی۔ گو مسلمان عورتوں کی عام پاکدامنی کے باعث اس کی عصمت کوئی بڑی فخر کی بات نہیں تھی۔ جب یہ خیال کیا جائے کہ وہ بادشاہ زادی اور خود مختار تھی تو وہ البتہ وہ ایسی تھی کہ ایسی پاکدامنوں کی مثالیں شاذ و نادر ہی ہوا کرتی ہیں۔ افسوس کہ مسلمانوں کی پردہ نشینی کی سختی نے اسے سلطنت سے محروم رکھا ورنہ ایسی لایق اور بہادر عورتیں دنیا میں بہت ہی کم دیکھنے سننے میں آتی ہیں۔ جب مغلوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو اس نے ان کے فیصلہ پر کمر باندھی جب مغلوں نے سرکوب بنائے تو وہ بھی آدمیوں کو مقرر کرتی اور قلعہ کے برجوں کو اس کے مقابلہ میں خوب بلند کرا دیتی۔ جب وہ خندق محیط قلعہ کو مٹی پتھر سے پاٹ کر اندر جانے کا راستہ کرتے تو وہ اسے خالی کروا دیتی۔ جب وہ اپنے مورچوں کو آگے بڑھاتے تو وہ ایسی توپیں مارتی کہ مغلوں کو پیچھے ہی ہٹنا پڑتا۔ اور راتوں کو قلعہ سے نکل نکل کر شبخونوں سے تنگ کرتی۔ اور مغلیہ فوج کو قتل و غارت کر کے اس کی فوج پھر قلعہ میں گھس جاتی غرضکہ مغلوں کی ہر ایک تجویز کے مقابلہ میں جو قلعہ شکنی کے لئے اختیار کرتی۔ چاند بی بی کی جانب سے برابر اس کا جواب ملتا۔ اس طرح مغلوں کی تین ماہ کی مسلسل اور ان تھک مساعی کے باوجود جس میں شہنشاہ اکبر کے وہ سرداران فوج اور ایسے سپاہی تھے جنھوں نے اکبر کی وسیع شہنشاہیت کے قیام میں حیرت انگیز جنگجوانہ کارنامہ دکھلائے تھے ایک عورت کے مقابلہ میں اور عورت بھی ایسی کہ جو مختلف قسم کے سیاسی انتشار و بطنوں میں پھنسی ہوئی تھی اپنے جوش عمل کو پست اور حوصلوں کو سرد محسوس کر رہے تھے۔

اب چاند بی بی کا وہ بے مثل اور بہادر کارنامہ درج کیا جاتا ہے جس سے دکن کی تاریخیں لبریز ہیں جب تین ماہ مغلوں کے بہادر سپاہیوں کو قلعہ احمد نگر کی فتح میں مایوسی ہوئی اور دوسری طرف سے سہیل خاں کا ہر وقت خوف لگا رہنے لگا تو شہزادہ مراد نے ایک محفل مشاورت منعقد کی جس میں اس نے بڑے بڑے امرائے اکبری کو بلوایا اور ان سے اس بارے میں بھی رائے دریافت کی ان سب نے ہم زبان ہو کر جواب دیا کہ جہاں تک ممکن ہو دکنی لشکر کے پہونچنے سے قبل ہی احمد نگر کو فتح کر لینا چاہئے۔ اب شاہزادہ نے محاصرہ کا خوب بندوبست کیا آمد و رفت کے راستہ اس طرح بند کر دیئے کہ اہل قلعہ کو اس کی خبر تک نہ ہو سکی۔ اور پھر اس نے فصیل میں نقب لگانے کا حکم دیا چنانچہ پانچ زبردست سرنگیں قلعہ

کی دیوار میں لگوائی گئیں جو دیوار کے نیچے سے بہت دور تک اندرونی فصیل میں پہونچ گئیں اور پھر ان سب کو بارود سے بھر دیا جا کر کنکر مٹی سے ان کے سوراخ بند کئے۔ اور شہزادہ کے حکم کے مطابق یہ طے پایا کہ سرنگیں کل بروز جمعہ بعد نماز اڑائی جائیں۔ اکبری لشکر میں خواجہ محمد خاں شیرازی چاند بی بی کا دوست تھا وہ اہل قلعہ کا ہم مذہب بھی تھا اس لئے اہل قلعہ سے اس کو ہمیشہ ہمدردی تھی خفیہ طور پر ان سرنگوں کا حال چاند بی بی پر ظاہر کر دیا۔ اور ان کی جگہ بھی بتلادی چاند بی بی اُسی وقت اُٹھ کھڑی ہوئی اور سرنگوں کی تلاش میں مصروف ہوئی اور جمعہ کی نماز کے قبل دو سرنگوں کا پتہ چلا لیا اور اُن میں سے بارود خارج کر کے اتنا پانی بھروا دیا کہ نہ پھر نکلیں اور پھر اُس کے بعد دوسرے سرنگوں کی تلاش میں مصروف ہوئی۔

شہزادہ مراد اور خانخاناں میں ناچاقی تھی اور ہر ایک کوشش کر رہا تھا کہ قلعہ کی فتح اس کے نام ہو جمعہ کی نماز کے بعد شہزادہ نے خانخاناں کے بلا اطلاع قلعہ کی جانب کوچ کیا اور موقعہ پر پہونچ کر حکم دیا کہ سرنگیں اڑائی جائیں۔ تین سرنگوں نے ایک زبردست دھماکے کے ساتھ پچاس گز فصیل منہدم کر کے ایک وسیع شگاف بنا دیا۔ مورخ فرشتہ کا بیان ہے کہ سرنگوں کے اڑانے کے ساتھ ہی فصیل پر کے آدمی سرنگوں نے فضا میں آسمان کی طرف اس طرح اڑگئے جیسے کبوتر۔ اور پھر جہاں کہیں وہ پتھر اور کڑیاں وغیرہ گریں ان سے اہل قلعہ کو بہت نقصان پہونچا تاہم قلعہ والے چونکہ سرنگوں کے حال سے واقف تھے اس لئے اُنھوں نے پہلے ہی سے احتیاط کر لی تھی۔ اور وہ نقصان نہیں پہونچا جس کا اس وقت احتمال تھا۔ مرتضیٰ خاں آہنگ خاں شمشیر خاں اور محمد خاں اور دیگر چھوٹے چھوٹے امرا نے جب فصیل میں اتنا بڑا شگاف دیکھا تو خوف و دہشت کے مارے بھاگ چھپ گئے۔ ہر طرف دھواں اُٹھ رہا تھا۔ قلعہ کی دیواریں دھماکوں کے ساتھ گر رہی تھیں میدان جنگ نمونہ حشر بن گیا تھا پتھر اڑ کر ادھر ادھر گر رہے تھے۔ سینکڑوں پتھر کے نیچے دب کر ہلاک ہو گئے۔ خود حملہ آور بدحواس اور پریشان ہو گئے تھے اس وقت قلعہ کی حفاظت تو کیا لوگوں کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے ایسے وقت شیر دل چاند بی بی نے برقعہ پہن لیا گلے میں شمشیر حمائل کی ایک برہنہ شمشیر ہاتھ میں لی اور برہنہ پا نہایت ہی سرعت کے ساتھ جائے موقع پر آ پہونچی جبکہ بڑے بڑے سورماؤں کے دل خود دہشت سے دہل جا رہے تھے مغل حملہ آوروں کا گھوڑے پر سوار ہو کر سر توڑ مقابلہ شروع کیا اور پھر بڑھتے ہوئے حملہ آوروں کو پسپا کر کے مٹی اور پتھر سے تھیلے بھر بھر کر شگاف کے ایک بڑے حصہ کو پر کر دیا۔ اور جتنا وہ شگاف بچا ہوا تھا اُس پر خود شمشیر برہنہ کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ یہ وقت بھی عجیب تھا دن کے دو بجے تھے سخت دھوپ پڑ رہی تھی ملکہ کے جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا تاہم وہ برابر مصروف تھی کشتوں کے پشتے لگ رہے تھے۔ فصیل میں دبے ہوئے جاں بلب آخری سانس توڑنے والوں کی دلخراش کراہ سننے والوں کے جگر کو پارہ پارہ کرتی تھی۔ خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں مغل سپاہی اپنی جانکاہ کوشش سے قلعہ میں داخل ہونے کی ممکنہ کوشش کر رہے تھے۔ اور جو بھی شگاف پر آیا چاند بی بی کی خون آشام تلوار سے لقمہ اجل ہو گیا ادھر شہزادہ مراد

قلعہ کو فتح کرنے کا نہایت ہی بہترین موقعہ سمجھ کر اپنے بہادر سپاہیوں کو حملہ کی ترغیب دے رہا تھا۔ شمشیر زن بیگم کی یہ جوانمردی دیکھ کر امرائے احمدنگر کو بھی غیرت آئی نیز چاند بی بی نے بھی ایسے نازک وقت پر نہایت ہی جوش میں انھیں حفاظت ملک کے لئے آمادہ جنگ کیا اس نے با آواز بلند اہل قلعہ سے کہا

اے مردان بکوشید جار زنانی نہ پوشید۔ اے مردو نہیں بلکہ مردکی تصویر و آؤ اور حفاظت ملک کی کوشش میں جان لڑا دو یا زنانی لباس پہن کر دعوئ مردانگی سے دست بردار ہو جاؤ یاد رکھو حیات کو بقا نہیں کسی نہ کسی دن تمھیں ضرور موت سے دوچار ہونا پڑے گا تو پھر تم کیوں نہ نیک نامی اور ناموری کے ساتھ مرجاؤ۔ تمھیں جاننا چاہئے کہ اگر اب تم نے ملک کے بچانے میں بزدلی دکھلائی تو پھر کل تمہارا ملک تمہارے دشمنوں کے ہاتھ ہوگا اور ایسے وقت یقین مانو تمہارے دشمن تمھیں ہرگز زندہ نہ چھوڑیں گے بلکہ تمھیں قتل و غارت کر ڈالیں گے نہ صرف یہ بلکہ تمہارے زن و فرزند دشمنوں کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور وہ ان سے جیسا چاہیں گے سلوک کریں گے"

جس وقت شیردل بیگم نے یہ عبرت آمیز تقریر کی تو فرشتہ کا بیان ہے کہ ملک میں کوئی چھوٹا بڑا۔ عورت مرد۔ امیر و غریب ایسا نہ تھا جو اس کی مدد کو نہ اٹھ کھڑا ہوا ہو۔ آہنگ خاں اور دوسرے امرا بھی واپس ہوئے اور قلعہ کی مدافعت میں اپنی بہادری کے ایسے مظاہرے کئے کہ حملہ آوروں کے دانت کھٹے ہو گئے اور ایک طرفۃ العین میں توپیں ضرب زن اور دیگر آلات جنگی لا کر لگا دیے جس سے وہ شگاف دہلیز دوزخ کا نمونہ بن گیا۔

چاند بی بی کے اس کامیاب بندوبست سے شہزادہ مراد اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے فوج کو اور زیادہ سختی سے حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور ایسی سخت کوشش کی کہ اس سے زیادہ کی امید نہ کی جاسکتی تھی مگر بہادر بیگم نے دشمن کو ہر وقت پسپا کیا یہاں تک کہ طرفین کے جوان مردوں کے خون سے نالے بہہ گئے اور چار گھنٹہ کامل لڑائی ہوئی شام میں ۶ بجے آفتاب عالمتاب پردہ مغرب میں پوشیدہ ہو گیا تو آخر کار شہزادہ مراد کو مایوس و ناکام لوٹنا پڑا۔ لڑائی جب ختم ہوئی ہے تو دوست و دشمن کی فوج کا ہر صغیر و کبیر کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جس نے چاند بی بی کی اس لاثانی تلوار زنی اور جرات و ہمت کی تعریف نہ کی ہو۔ اس تاریخ سے ملکہ بجائے چاند بی بی کے چاند سلطانہ کے لقب سے یاد کی جانے لگی۔

جب رات ہوئی تو مغل سردار اپنی فوج اور اہل قلعہ اپنے آرام میں مصروف ہو گئے مگر شیردل ملکہ برابر شگاف پر ڈٹی رہی۔ کسی کو روپیہ دیا۔ کسی سے وعدہ و عہد کیا اور دیوار بنائی۔ پتھر مٹی۔ کوڑا۔ لکڑی۔ ڈنگر حتی کہ آدمیوں کی لاشوں سے رات ہی رات میں دیوار تین گز اونچی کرالی اور ایسی مستحکم سد سکندری قایم کر دی کہ صبح کو دشمن کی ہمت پھر حملہ کرنے کی نہ ہوئی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اگرچہ ملکہ کامیاب و کامران تھی تاہم وہ دشمن کی قوت سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ ایسے زبردست دشمن سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ اُس نے سہیل خاں کے پاس ایک خط روانہ کیا کہ میں نے آج تک قلعہ کو بچانے کی حتی الامکان کوشش

کی اب قلعہ میں رسد نہیں ہے۔ تم جلد آؤ اگر آنے میں دیر کی تو قلعہ ہاتھ سے جاتا رہے گا مگر جاسوس خط لے کر جاتے وقت دشمن کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ خانخاناں نے چاند سلطانہ کے خط کو دیکھا اور ایک دوسرا خط سہیل خاں کے نام اس مضمون کے ساتھ بھیجا کہ جھگڑا بہت طول پکڑ رہا ہے آپ جلد آیئے تاکہ کچھ تصفیہ ہو جائے۔ سہیل خاں کو جب یہ خطوط پہنچے تو فوراً احمد نگر کی جانب روانہ ہو گیا مگر ابھی احمد نگر سے چھ کوس کے فاصلہ پر تھا کہ امرائے اکبری اور خانخاناں نے چاند سلطانہ سے صلح کی گفت و شنید کی۔ کیونکہ رسد کی کمی اور دکھنیوں کے تاخت و تاراج سے وہ بہت تنگ آ گئے تھے۔ مغلوں کی پریشانی دیکھ کر پہلے تو چاند سلطانہ نے صلح کرنے سے پس و پیش کیا۔ تاہم وہ حالات کو بہت نازک سمجھتی تھی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ امرائے احمد نگر کا یہ اتفاق محض عارضی اور چند روزہ ہے۔ لہٰذا وہ مغلوں سے صلح کرنے پر رضامند ہو گئی اور حسب ذیل صلح نامہ طے پایا۔

> کچھ پرگنات بیدر اور کل برار کا علاقہ جو تفافل خاں کے قبضہ میں تھا وہ شہزادہ کو دیدیا جائے اور حسین شاہ کے وقت میں جس قدر ملک مہور سے بندر جیول تک اور پربندہ سے دولت آباد اور سرور گجرات تک تھا وہ حاکم احمد نگر کے پاس رہے۔

واضح ہو کہ یہ عہد نامہ مغلوں اور چاند سلطانہ کے درمیان بالکل خفیہ طور پر کیا گیا بڑے امرا اور سہیل خاں تک اس سے واقف نہ تھے۔ اس کا نتیجہ چاند سلطانہ کے حق میں نہایت ہی مضر ثابت ہوا کیونکہ کسی نے بھی اس کو پسند نہ کیا۔ اور خاص کر اس سبب سے بھی کہ اس میں یہ لوگ شامل نہ ہوئے۔ اس صلح نامہ سے خود شہنشاہ اکبر بھی مطمئن نہ تھا اس نے آئندہ تسخیر دکن میں سہولت حاصل کرنے کے لئے اپنے لڑکے مراد کا خاندیس کی شہزادی سے نکاح کروا دیا۔ ادھر برار میں آئندہ افواج کی نقل و حرکت اور قیام کے لئے شہزادہ مراد نے ایک نیا قصبہ آباد کر کے اس کو شاہ پور کے نام سے موسوم کیا اور یہی قیام دکن میں مغلوں کا سب سے پہلا دار القیام سمجھا جاتا ہے۔

مغلوں سے صلح کرنے کے بعد چاند بی بی نے بہادر شاہ کو تخت نشین کرا دیا۔ اور اس کا وزیر سلطنت محمد خاں کو مقرر کیا۔[1] محمد خاں نے اول اول سلطنت کے امور نہایت حسن و خوبی سے انجام دیئے مگر مقتدر و باختیار ہونے کے بعد اس نے کل بڑے بڑے اور ذمہ دار عہدہ داروں پر اپنے آدمیوں کو مقرر کرنا شروع کیا۔ چاند بی بی کو اس سے خوف ہوا اور اس نے عادل شاہ کو امداد کے لئے لکھا کہ محمد خاں سے جو امید تھی اس کے برخلاف ظہور میں آیا۔ زبردست دشمن سرحد پر پڑا ہے اور یہاں یہ فتنہ و فساد ہو رہے ہیں اگر آپ اس وقت کچھ توجہ نہ

---

[1] محمد خاں میاں حبیب اللہ کا بیٹا تھا اور حبیب اللہ مرتضیٰ نظام شاہ اول کا لڑکا تھا۔

کریں گے تو یہ پورا ملک مغلوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ یہ سُن کر عادل شاہ نے ۱۰۰۵ھ میں سہیل خاں کے سرکردگی میں ایک فوج بھیجی۔ چار ماہ تک قلعہ بند ہو کر محمد خاں نے اس فوج کا مقابلہ کیا اور آخر کار مجبور و پریشان ہو کر اس نے خانخاناں سے امداد مانگی اور جب اہل قلعہ کو اس غداری کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے اس کو چاند بی بی کے حوالے کر دیا۔ چاند سلطانہ نے محمد خاں کو عہدہ وزارت سے معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ آہنگ حبشی کو مقرر کیا اور سہیل خاں کو خلعت سے سرفراز کر کے باعزاز روانہ کیا۔

محمد خاں کے دعوت دینے سے خانخاناں نے قصبہ پاتری پر قبضہ کر لیا جو برار کی مملکت سے خارج تھا۔ اس لئے سہیل خاں دوبارہ آیا گولکنڈہ کی افواج بھی امداد کو آئیں اس وقت سہیل خاں کی ماتحتی میں تقریباً ساٹھ ہزار فوج تھی۔ تاہم لڑائی میں خانخاناں کامیاب رہا ۱۰۰۵ھ

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد چاند بی بی اور آہنگ خاں میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اور چاند بی بی نے آہنگ خاں کو حکم دیا کہ وہ شہر کے باہر ملک کی حفاظت کرتا رہے۔ کچھ روز تک تو آہنگ خاں نے اس حکم کی تعمیل کی مگر بعد میں بعض سرکشوں کے اغوا سے اُس نے چاند بی بی اور بہادر شاہ کو مقید کر کے خود سلطنت کو غصب کرنا چاہا۔ چاند بی بی نے پھر عادل شاہ سے امداد طلب کی مگر ان دنوں اندرونی فسادات اور چند دوسرے وجوہات سے کیونکہ سہیل خاں اس سے ناراض ہو گیا تھا چاند بی بی کو فوجی امداد نہ دے سکا۔ البتہ اس نے رفیع الدین شیرازی کو بھیجا کہ بیجاپور جا کر فریقین میں صلح کرا دے۔ رفیع الدین نے پہلے شاہ درگ میں جا کر سہیل خاں کو راضی کیا پھر احمد نگر روانہ ہوا۔ اس وقت شہر نہایت ویران اور رعایا پریشان تھی۔ آہنگ خاں اور چاند بی بی دونوں نے رفیع الدین کا شاندار استقبال کیا۔ رفیع الدین نے ان دونوں کے مشکلات رفع کر کے آپس میں صلح کرا دی۔ دوسرے روز بادشاہ کا دربار منعقد کیا گیا۔ اور سبھوں نے بادشاہ کو نذریں گزرانیں اور عادل شاہ کے لئے قیام امن کی کوشش کے صلے میں دعائیں پڑھی گئیں مگر یہ صلح دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ چاند بی بی اور آہنگ خاں پھر آویزش پر تل گئے مگر اس دفعہ بھی رفیع الدین نے ان میں صلح کرا دی اس کے باوجود بھی دونوں فریق ذرا ذرا سی بات پر آمادہ جنگ ہو جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ آہنگ خاں دو سو آدمیوں کے ہمراہ قلعہ میں گھس گیا۔ مگر ملک صندل بربد نے ان کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔ رفیع الدین شیرازی ان بدنظمیوں کو روکنے کے لئے کئی روز تک احمد نگر میں ٹھیرے رہے۔ مگر حالات جب کسی طرح درست ہوتے نظر نہ آئے تو انھوں نے عادل شاہ کو اطلاع دی اور عادل شاہ نے مجبور ہو کر انھیں دوبارہ واپس بیجاپور طلب کر لیا۔

احمد نگر میں جبکہ اس طرح خانہ جنگیاں برپا تھیں اکبر خاموش بیٹھنے والا نہ تھا اس زمانہ میں چونکہ شہزادہ مراد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے تسخیر احمد نگر کے لئے اُس نے شہزادہ دانیال کو روانہ کیا اور چند دن بعد خود بھی آگیا۔ افواج اکبری اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ منظم تھیں اس کے برخلاف احمد نگر خانہ جنگی کے باعث نہایت ہی کمزور ہو گیا تھا۔ آہنگ خاں کے پاس اگرچہ موجودہ پندرہ ہزار افواج تھیں۔ تاہم جب اُس نے

اکبر کی آمد کی خبر سنی تو تمام سامان کو آگ لگا کر جنیر کی طرف روانہ ہوگیا قطب شاہی فوج بھی اس زمانہ میں بیدم ہوگئی تھی بیجاپور سے بھی امداد کی بہت کم توقع تھی۔ یہ حالات ظاہر ہے کہ احمدنگر کی تباہی کا پیش خیمہ تھے اس لئے چاند سلطانہ کی رائے تھی کہ قلعہ شاہزادہ دانیال کو دے کر جان اور عزت کی امان حاصل کرے اور بہادر شاہ کو لے کر جنیر چلی جائے۔ اس وقت قلعہ میں چیتہ خاں نامی ایک بڑا سردار تھا چاند بی بی نے اس کو بلوایا اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس نامعقول نے شور مچادیا کہ چاند سلطانہ مغلوں سے مل گئی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ قلعہ ان کے حوالہ کردے پہلے صلحنامہ کو راز میں کرنے کی وجہ سے چاند سلطانہ یوں بھی بدنام تھی۔ اس لئے اس پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور سب نے چاند سلطانہ کو پکا مجرم تصور کیا اور شور مچا کر حرم میں گھس پڑے اور بیرحمی اور وحشیانہ طور پر اس دور بین مصلحت اندیش کو تہ تیغ کرڈالا[۴] لیکن بعض مورخ بیان کرتے ہیں کہ جب چاند سلطانہ نے اپنوں اور بیگانوں کو اپنا مخالف پایا تو اس نے خودکشی کرلی[۵]۔

چاند بی بی کی وفات کے بعد مغلوں نے سرنگ لگا کر قلعہ کی دیواریں توڑ ڈالیں اور اندر گھس کر بچوں اور جوان عورتوں کو قید کرلیا اور سب اہل قلعہ کو قتل کردیا۔ بہادر شاہ قید ہو کر اکبر کے پاس برہان پور بھیجدیا گیا اور اس کو وہاں سے گوالیار کے قلعہ میں قید کردیا گیا۔

اس طرح اس شیردل ملکہ کا وہ ملک جس نے اس کے بچانے میں غیر فانی بہادرانہ کارنامے کئے اس کی وفات کے بعد دشمنوں کے حوالہ ہوگیا وہ ایک بہادر جری اور غیر معمولی دل و دماغ کی عورت تھی جس نے اپنی طوفان خیز زندگی میں کبھی پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دی اور آخر تک اپنے ملک کے لئے جدوجہد کرتی رہی۔ وہ اپنے دشمنوں کے سیاسی چالوں کو خوب سمجھتی تھی اور قبل از وقت ان کا انسداد کرنا جانتی تھی وہ ہر کام موقع اور محل کے اعتبار سے کرتی۔ جب اس کو معلوم ہوگیا کہ ملک اب کسی طرح مغلوں کے مقابل نہیں ہوسکتا تو آیندہ بدنظمی اور غلامی سے بچانے کے لئے اس نے مغلوں سے صلح کرلینا مناسب سمجھا۔ مگر خود غرض اور مفسد امرا نے اس کی قدر نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے گلے میں غلامی کی طوق پڑگئی۔

احمدنگر میں ہزار بدنظمی ہو مگر چاند بی بی کی ذات ملک کی امیدوں کا مرکز تھی وہ ہر سیاسی انتشار کی شیرازہ بندی کیا کرتی تھی۔ اس لئے اس کی زندگی تک مغلوں نے ہزار کوشش کیں مگر احمدنگر پر قابض نہ ہوسکے مگر جب یہ چاند گہن میں آگیا تو ملکی فضا پر چوطرف سے سیاہ بدلیاں چھاگئیں اور اس کے بعد کوئی دوسرا ایسا رہبر ہی نہ ملا کہ مشعل ہدایت سے ملک کو دوبارہ روشن کردیتا۔

---

[۴] تاریخ دکن [۵] سید احمد اللہ صاحب نے تاریخ شہابی کے حوالہ سے جو تصریحات کی ہیں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں مغل جب قلعہ میں داخل ہوئے تو چاند سلطانہ نے ایک باولی تیز آب سے بھرا ئی اور اس میں غرق ہو کر جان بحق ہوئی۔ فرشتہ کا یہ بیان کہ چاند بی بی کو چیتہ خاں نے مار ڈالا حقیقت وہ چاند بی بی نہ تھی بلکہ چاند بی بی کی ایک سہیلی تھی اور اتفاق سے اس کا نام بھی چاند بی بی تھا۔ مصنف تاریخ احمدنگر نے ایک قدیم مصنف سید جعفر کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ چاند بی بی کی تمام سہلیاں مچھلی باولی میں گر کر مر گئیں ان کی لاشوں کو بہادر شاہ کی نشاندہی پر دانیال نے کوئیں سے برآمد کردایا۔ اس کے بعد تیزاب کے کوئیں سے چاند بی بی کی نعش بھی نکالی اور ان سب کو روضہ باغ میں سپرد خاک کیا۔ اور چاند بی بی کی قبر اینٹ اور چونہ سے پختہ بنوادی۔

سید جعفر حسین متعلم ایم۔ اے

حیدرآباد کے زرعی وسائل

اگر ہم اپنی ریاست کی زراعت کی حالت پر غور کریں تو سب سے پہلے جو بات ہم کو نظر آتی ہے وہ یہی ہے کہ ہندوستان کے دوسرے بیشتر حصوں کی طرح یہاں کی بھی ایک کثیر آبادی کا پیشہ زراعت ہے اور آبادی کا جو حصہ براہ راست زرعی کاموں میں مصروف نہیں بھی ہے وہ بھی بالواسطہ زراعت سے متعلقہ پیشوں پر گذر کر رہا ہے۔ یہاں بھی زراعت کے وہی پُرانے، سخت تھکا دینے والے طریقہ رائج ہیں جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہیں۔ کاشتکار کا معیار زندگی یہاں بھی گرا ہوا ہے۔ زرعی آبادی کا بیشترین حصہ وہی پُرانے اور سیدھے سادے آلات پیدائش استعمال کرنے پر قانع ہے جو آج سے ہزار سال پہلے ان کے آباو اجداد استعمال کرتے تھے۔ یہاں بھی کاشتکاروں کے پاس نہ تو زراعت میں بڑے پیمانہ پر مشغول کرنے کے لئے اصل ہے اور نہ زرعی آبادی بڑے پیمانہ پر اپنا اصل مشغول کرتی ہے نہ ایسا کرنے پر تیار ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہم کو بعض باتیں ایسی بھی نمایاں نظر آتی ہیں جو ہندوستان کے دوسرے حصوں میں یہاں کے برعکس ہیں۔ تقسیم و انتشار اراضی کی شکل یہاں بھی پائی جاتی ہے لیکن نہ اتنی کہ مشکل سے ایک رقبۂ اراضی میں ناگر اور بیل کو موڑا جاسکے۔ دوسرے یہ کہ یہاں بھی زراعت کا انحصار محض بارش پر ہے لیکن یہاں پانی کی ویسے بھی قلت رہتی ہے۔ دریا سال کے بارہ مہینے رواں نہیں رہتے اور اس قلت کو دور کرنے کے لئے زیادہ تر کنوؤں، تالابوں اور باؤلیوں کے ذخائر سے پُرانے طریقوں پر کام لیا جا رہا ہے۔

ہماری ریاست اپنی زمینی خصوصیات کی بنا پر دو اہم حصوں میں منقسم ہے۔

(۱) تلنگانہ :- جہاں سرخ اور سرخ ریتیلی مٹی پائی جاتی ہے۔

(۲) مرہٹواڑہ :- جہاں بھوری، کالی اور کالی ریتیلی مٹی ہوتی ہے۔

اس ارضی خصوصیت کی وجہ سے ہر دو جگہوں کی پیداواریں بھی جداگانہ ہوگئی ہیں تلنگانہ جہاں کی سرخ مٹی میں پانی محفوظ رکھنے کی خاصیت ہی چاول کے لئے بہترین علاقہ ہے اور مرہٹواڑہ جہاں کی مٹی پانی کو جذب کرلیتی ہے روئی کی کاشت اور گیہوں کی پیداوار کے لئے بہترین رقبۂ اراضی ہے۔

ہمارے ملک کا محکمۂ زراعت ان خصوصیات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ صرف تجربات اور تحقیقات میں مشغول ہے بلکہ نمائشوں اور تبلیغ (Propaganda) کے ذریعہ کاشتکاروں کو جدید آلات کے ذریعہ کاشت عمیق کے طریقے سکھا رہا ہے اور اپنے تجربہ کئے ہوئے تخموں کی ترویج کرکے ہر ممکنہ کوشش یہاں کی زراعت کو کامیاب بنانے میں صرف کر رہا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد قبل اس کے کہ میں یہاں کے زرعی وسائل سے بحث کروں یہ بتانا غالباً بیجا نہ ہوگا کہ ہماری ریاست کا کتنا رقبۂ اراضی کن فصول کے تحت زیر کاشت ہے۔ سنہ ۱۳۴۱ف کی زرعی رپورٹ سے ذیل کے اعداد شمار معلوم ہوتے ہیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) ضلع اورنگ آباد

	ہزاروں میں
زیر فصول خریف	(۱۱۸۸) ایکڑ
〃 〃 ربیع	(۱۱۶۰) 〃
زیر باغات	(۳۰) 〃
زیر فصول آبی	(۱) 〃
کل رقبہ زیر کاشت	* (۲۳۷۹۵۶۵) تیئس لاکھ اناسی ہزار پانچسو پینسٹھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	* (۳۹۷۵۶۸۰) انتالیس لاکھ پچہتر ہزار چھ سو اسی ایکڑ

(۲) پربھنی

زیر فصول خریف	(۱۴۷۵) ایکڑ
〃 〃 ربیع	(۳۷۵) ایکڑ

*یہ اعداد ہزاروں میں نہیں ہیں۔

زیر باغات	(۲۸) ایکڑ
زیر فصول آبی	(۹) ״
کل رقبہ زیر کاشت	*۲۴۸۷۴۰۵ چوبیس لاکھ ستاسی ہزار چار سو پانچ
ضلع کا کل رقبہ	*۳۲۸۰۰۰۰ بتیس لاکھ اسی ہزار

(۳) ناندیڑ

	ہزاروں میں
زیر فصول خریف	(۱۱۵۱) ایکڑ
״ ״ ربیع	(۴۷۷) ״
زیر باغات	(۶۵) ״
زیر فصول آبی	(۲۴) ״
کل رقبہ زیر کاشت	*۱۷۱۷۶۳۸ سترہ لاکھ سترہ ہزار چھ سو اڑتیس ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	*۲۴۱۳۴۴۰ چوبیس لاکھ تیرہ ہزار چار سو چالیس ایکڑ

(۴) بیڑ (Bid)

زیر فصول خریف	(۱۱۰۹) ایکڑ
״ ״ ربیع	(۷۵۲) ״
زیر باغات	(۱۲) ״
زیر فصول آبی	(۱۱) ״
کل رقبہ زیر کاشت	*۱۸۸۴۵۴۷ اٹھارہ لاکھ چوراسی ہزار پانچسو سینتالیس ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	*۲۶۴۴۴۸۰ چھبیس لاکھ چوالیس ہزار چار سو اسی ایکڑ

(۵) عثمان آباد

زیر فصول خریف	(۱۱۰۷) ایکڑ
״ ״ ربیع	(۱۰۳۹) ایکڑ

---

* یہ اعداد ہزاروں میں نہیں ہیں

زیر باغات (۵۲) ایکڑ

زیر فصول آبی (۱۹) ″

کل رقبہ زیر کاشت * ۱۲۲۰۰۰۰ بارہ لاکھ بیس ہزار ایکڑ

ضلع کا کل رقبہ * ۲۲۵۶۶۴۰ بائیس لاکھ چھپن ہزار چھ سو چالیس ایکڑ

(۶) بیدر

زیر فصول خریف (۱۳۴۳) ایکڑ

″ ″ ربیع (۴۳۲) ″

زیر باغات (۱۶۴) ″

زیر فصول آبی (۲۴) ″

کل رقبہ زیر کاشت * ۱۹۶۲۹۵۴ انیس لاکھ باسٹھ ہزار نو سو چوپن ایکڑ

ضلع کا کل رقبہ * ۳۰۸۸۰۰۰ تیس لاکھ اٹھاسی ہزار ایکڑ

(۷) گلبرگہ

ہزاروں میں

زیر فصول خریف (۱۱۵۲) ایکڑ

″ ″ ربیع (۱۴۹۸) ″

زیر باغات (۶۶) ″

زیر فصول آبی (۱۸) ″

زیر فصول تابی (۹) ″

کل رقبہ زیر کاشت * ۲۷۴۳۵۴۹ لاکھ ایکڑ

ضلع کا کل رقبہ * ۴۴۶۴۰۰۰ ″ ″

(۸) رائچور

زیر فصول خریف (۱۵۷۷) ایکڑ

یہ اعداد ہزاروں میں نہیں ہیں۔

زیر فصول ربیع	(۱۱۸۶) ایکڑ
زیر باغات	(۱۲۰) ایکڑ
زیر فصول آبی	(۱۰) 〃
زیر فصول تابی	(۲) 〃
کل رقبہ زیر کاشت	*۲۸۹۷۰۹۸ لاکھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	*۴۳۴۶۲۴۰ لاکھ ایکڑ

(۹) عادل آباد (تلنگانہ)

زیر فصول خریف	(۸۲۳) ایکڑ
〃 〃 ربیع	(۴۱۰) 〃
زیر باغات	(۶۳) 〃
زیر فصول آبی	(۴۸) 〃
〃 تابی	(۱۳) 〃
کل رقبہ زیر کاشت	*۱۳۶۵۲۵۰ لاکھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	*۴۶۶۸۱۶۰ لاکھ ایکڑ

(۱۰) نظام آباد

باغات	؟؟ ایکڑ
زیر فصول خریف	(۲۰۲) 〃
〃 〃 ربیع	(۱۰۸) 〃
〃 〃 آبی	(۱۰۳) 〃
〃 〃 تابی	(۴۸) 〃
کل رقبہ زیر کاشت	؟؟
ضلع کا کل رقبہ	؟؟

---

* یہ اعداد ہزاروں میں نہیں ہیں

؟؟ یہ اعداد معلوم نہیں ہو سکے

(۱۱) کریم نگر

	ہزاروں میں
زیر فصول خریف	(۸۲۵) ایکڑ
〃 〃 ربیع	(۱۹۰) 〃
〃 〃 آبی	(۱۸۰) 〃
〃 〃 تابی	(۳۸) 〃
زیر باغات	(۱۵۰) 〃
کل رقبہ زیر کاشت	* ۱۴۰۹۷۱۶ لاکھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	* ۲۶۶۲۰۸۰ لاکھ ایکڑ

(۱۲) ورنگل

زیر فصول خریف	(۶۳۷) ایکڑ
〃 〃 ربیع	(۴۷۰) 〃
〃 〃 آبی	(۱۵۲) 〃
〃 〃 تابی	(۲۷۰) 〃
زیر باغات	(۱۸۶) 〃
کل رقبہ زیر کاشت	* ۱۴۷۲۹۵۱ لاکھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	* ۵۰۸۴۱۶۰ لاکھ ایکڑ

(۱۳) نلگنڈہ

زیر فصول خریف	(۸۹۲) ایکڑ
〃 〃 ربیع	(۶۰۷) 〃
〃 〃 آبی	(۱۲۸) 〃

* یہ اعداد ہزاروں میں نہیں ہیں۔

زیر فصول تابی	(۴۰) ایکڑ
زیر باغات	(۴۶) ″
کل رقبہ زیر کاشت	* ۱۶۵۳۵۶۳ لاکھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	* ۳۸۷۱۳۶۰ لاکھ ایکڑ

(۱۴) میدک

زیر فصول خریف	(۳۹۲) ایکڑ
″ ″ ربیع	(۱۲۱) ″
″ ″ آبی	(۳۹) ″
″ ″ تابی	(۲۷) ″
زیر باغات	(۷۳) ″
کل رقبہ زیر کاشت	* ۶۵۱۹۱۸ چھ لاکھ اکیاون ہزار نو سو اٹھارہ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	* ۲۰۶۴۷۲۰ بیس لاکھ چھیالیس ہزار سات سو بیس ایکڑ

(۱۵) اطراف بلدہ

زیر باغات	(۱۹۱) ایکڑ
زیر فصول خریف	(۶۹۵) ″
زیر فصول ربیع	(۱۳۷) ″
″ ″ آبی	(۶۴) ″
″ ″ تابی	(۴۰) ″
کل رقبہ زیر کاشت	۱۰۸۸۷۶۸ لاکھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	۱۷۳۰۵۶۰ لاکھ ایکڑ

* یہ اعداد شمارہ ہزاروں میں نہیں ہیں

(۱۶) محبوب نگر

زیر فصول خریف	(۱۳۰۰۷) ایکڑ
" " ربیع	(۳۷۵) "
" " آبی	(۳۸) "
" " تابی	(۱۵) "
زیر باغات	(۴۹) "
کل رقبہ زیر کاشت	۱۸۵۶۴۲۲ لاکھ ایکڑ
ضلع کا کل رقبہ	۳۳۰۵۶۰۰ لاکھ ایکڑ

مذکورہ بالا اعداد شمار پر نظر ڈالنے سے چند خاص باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) سوائے ضلع اطراف بلدہ کے عام طور پر ہر ضلع میں بعض اوقات نصف سے زیادہ اور بسا اوقات کل ضلع کا ⅔ (دو ثلث) حصہ جنگلات کا علاقہ ہے یا افتادہ پڑا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام افتادہ علاقہ بنجر نہیں ہو سکتا اگر اس کو صاف کر کے کاشت کے قابل بنا کر کام میں لایا جائے تو نہ صرف رقبہ کاشت میں اضافہ ہو جائے گا بلکہ نئی زمینات ہونے کی وجہ سے یہ رقبہ بہت زیادہ حاصل خیز ہوگا۔ تمام بیان کردہ اضلاع میں صرف ضلع اطراف بلدہ ہی ایک ایسا ضلع ہے جس میں صرف ، لاکھ ایکڑ زمین کاشت میں نہیں ہے جو ضلع کے رقبہ کا لحاظ کرتے بہت ہی کم ہے۔ اگر کم از کم یہی حالت دوسرے اضلاع کی بھی ہو جائے تو ہماری کاشت میں دوگنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۲) تمام اضلاع میں خریف کی فصول کے تحت سب سے زیادہ رقبہ زیر کاشت ہے اس کے بعد ربیع اور پھر فصول آبی و تابی و باغات کا نمبر آتا ہے باغات کے تحت بھی ایک بہت بڑا رقبہ ہے لیکن کاش ان کو ترقی دے کر ان سے مختلف قسم کے پھل وغیرہ حاصل کئے جاتے اور پیمانہ بر کبیر پر تجارتی اصول پر پھلوں کی پیداوار حاصل کی جا سکتی تو ملک میں نہ صرف ایک اور ذریعہ آمدنی بڑھ جاتا بلکہ پھلوں کی شہرت کی وجہ سے ملک کی تجارت میں چار چاند لگ جاتے۔

(۳) فصول آبی اضلاع مرہٹواڑہ، کرناٹک اور تلنگانہ میں سب جگہ ہوتی ہیں لیکن فصول تابی صرف کرناٹک کے اضلاع گلبرگہ اور رائچور اور اضلاع تلنگانہ میں ہوتی ہیں۔ یہ ہر دو فصول چاول کی کاشت کی فصلیں ہیں اور اضلاع تلنگانہ میں کاشتکار فصل تابی میں اپنے چاول کی مقدار میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

زرعی وسائل سے مراد:۔ ریاست حیدرآباد کے زرعی وسائل کے ذکر سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ یہاں کی زمین کی ساخت آلات زراعت، مویشیوں اور موسموں سے بحث کروں بلکہ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ یہاں کی چند اہم پیداواروں کی حالت بیان کروں تاکہ آپ کو معلوم ہوسکے کہ ہمارے ملک کی خاص پیداواروں کو کیا اہمیت حاصل ہے؟ کونسی پیداوار کہاں زیادہ ہوتی ہے؟ کسی خاص پیداوار کی ملک میں کیا مقدار ہوتی ہے؟ اندرون ملک اس کا کیا صرف ہے اور بیرونجات کو اس کی کیا مقدار برآمد ہوتی ہے اور کس خاص پیداوار کے ترقی کے امکانات ہیں یا ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جب ہم اشیائے خام اور اشیائے خوراک کی تفصیل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں حسب ذیل پیداواریں نہایت اہم معلوم ہوتی ہیں۔

(۱) کپاس (۲) گیہوں (۳) چاول (۴) جوار (۵) روغنی بیج (۶) نیشکر

ذیل کے اعداد شمار سے ہمیں ان فصلوں کی اہمیت رقبۂ زیر کاشت اور پیداوار کا حال معلوم ہوتا ہے۔

(۱) کپاس

سنہ	رقبۂ زیر کاشت	پیداوار
سنہ ۱۳۳۹ ف	۳۵۳۵۷۲۸ ایکڑ	۴۴۶۷۰۹ گٹھے
سنہ ۱۳۴۰ ف	۳۵۲۷۴۳۹ "	۳۸۱۸۱۰ "
سنہ ۱۳۴۱ ف	۳۶۴۳۹۴۳ "	۵۰۹۴۱۸ "
سنہ ۱۳۴۲ ف	۳۶۰۱۶۴۵ "	۵۳۳۸۹۱ "
سنہ ۱۳۴۳ ف	۳۶۹۵۶۸۶ "	۵۱۹۷۰۶ "

(۲) گیہوں

سنہ	رقبۂ زیر کاشت	پیداوار
سنہ ۱۳۳۹ ف	۱۰۲۵۷۳۰ ایکڑ	۱۰۷۴۶۱ ٹن
سنہ ۱۳۴۰ ف	۱۱۶۲۵۵۸ "	۱۳۶۱۹۹ "
سنہ ۱۳۴۱ ف	۱۳۶۷۱۴۷ "	۱۶۱۴۹۳ "
سنہ ۱۳۴۲ ف	۱۳۰۰۶۷۹ "	۱۶۸۳۲۸ "
سنہ ۱۳۴۳ ف	۱۲۰۱۱۵۲ "	

(۳) جوار

سنہ	رقبۂ زیر کاشت	پیداوار
۱۳۳۹ف	۸۹۹۷۱۷۹ ایکڑ	۱۱۵۰۷۴۲ ٹن
۱۳۴۰ف	۹۵۸۷۸۹۶ 〃	۱۳۰۵۲۷۵ 〃
۱۳۴۱ف	۹۴۶۴۰۳۷ 〃	۱۰۱۷۰۶۶ 〃
۱۳۴۲ف	۹۳۵۶۲۰۱ 〃	۱۲۷۵۳۶۳ 〃
۱۳۴۳ف	۸۸۳۴۴۷۹ 〃	۸۵۰۲۴۲ 〃

(۴) چاول

سنہ	رقبۂ زیر کاشت	پیداوار
۱۳۳۹ف	۵۰۶۶۲۱ ایکڑ	۱۵۰۹۵۵ ٹن
۱۳۴۰ف	۶۸۴۹۰۷ 〃	۱۷۷۹۷۴ 〃
۱۳۴۱ف	۱۰۹۹۹۰۵ 〃	۳۸۹۳۷۰ 〃
۱۳۴۲ف	۹۹۷۲۴۲ 〃	۲۹۲۵۵۰ 〃
۱۳۴۳ف	۱۳۰۷۳۵۸ 〃	

(۵) روغنی بیج

سنہ	رقبۂ زیر کاشت	پیداوار
۱۳۳۹ف	۲۴۴۷۵۸۱ ایکڑ	۲۴۴۶۷۸ ٹن
۱۳۴۰ف	۲۷۶۴۰۲۱ 〃	۲۷۲۵۲۴ 〃
۱۳۴۱ف	۲۹۲۶۷۱۹ 〃	۳۳۷۵۷۹ 〃
۱۳۴۲ف	۳۳۹۰۷۳۳ 〃	۴۴۹۷۹۱ 〃
۱۳۴۳ف	۳۶۶۷۶۳۹ 〃	

(۶) نیشکر

سنہ	رقبہ زیر کاشت		پیداوار	
سنہ ۱۳۳۹ف	۳۶۸۷۱	ایکڑ	۳۹۱۹۳	ٹن
سنہ ۱۳۴۰ف	۳۴۴۷۸	"	۴۹۴۴۳	"
سنہ ۱۳۴۱ف	۳۵۳۹۳	"	۶۴۵۶۴	"
سنہ ۱۳۴۲ف	۴۰۲۱۲	"	۷۵۷۷۴	"

مذکورہ بالا فصلوں کی اہمیت اور ان کے زیر کاشت رقبہ کی حالت معلوم کرنے کے بعد اب میں ان کی تفصیل سے بحث کروں گا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ہر ضلع میں ان فصلوں کی کیا حالت ہے۔ کتنا رقبہ زیر کاشت ہے۔ محکمۂ زراعت ان کی ترقی کے لئے کیا کر رہا ہے۔ سالانہ پیداوار کیا ہے اور کیا مقدار بیرونجات کی درآمد ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے میں کپاس کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ حیدرآباد کی زراعت میں جو اہمیت کپاس کو حاصل ہے وہ کسی دوسری پیداوار کو حاصل نہیں۔

(۱) کپاس

ریاست حیدرآباد میں کپاس کی سالانہ پیداوار کل ہندوستان کی پیداوار کی نسبت سے پندرہ فیصدی زیادہ ہوتی ہے اسی طرح کپاس کی سربراہی میں حیدرآباد کا محکمہ زراعت ہندوستان میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔

یہاں تجربات کے بعد گورانی کی قسم سب سے اچھی ثابت ہوئی ہے جس کا ریشہ تقریباً ایک انچ لمبا، مضبوط اور ریشمی ہوتا ہے Indian year book Times of India 1933 میں حیدرآباد کے ذکر کے ساتھ یہاں کی کپاس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

Hyderabad is well Known for its
Gaurani cotton, wich is the largest
Staple in indigenous cotton in India !!

گورانی خاص طور سے اضلاع مرہٹواڑہ میں پیدا ہوتی ہے لیکن چونکہ برار قریب لگا ہوا ہے اس لئے وہاں ادنیٰ قسم کی روئی آکر شامل ہوجاتی ہے۔ اس کے لئے حفاظتی تدابیر اختیار کی جارہی ہیں اور (Cotton Act) کے تحت منڈیوں میں بالخصوص ناندیڑ کی منڈی میں روئی کی گاڑیوں کا خاص طور پر معائنہ کیا جاتا ہے اور ان کی مختلف قسمیں اور شرح فروخت علیحدہ کردی جاتی ہیں

ہماری کپاس کے بہتر ہونے کا ایک بہترین ثبوت یہ ہے کہ ہمارے محکمہ زراعت کو انڈین سنٹرل کاٹن کمیٹی کی طرف سے ۵ سال کے لئے تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ کی امداد دی گئی اور ہمارے یہاں کے محکمہ زراعت میں مذکورہ صدر کمیٹی کی جانب سے ایک (Cotton Research Botanist) کا تقرر کیا گیا ہے۔

ضلع ناندیڑ میں گورانی کپاس کی تقسیم کے اور ضلع اورنگ آباد میں بنیلہ کپاس کی تقسیم کے خاص انتظامات ہیں چنانچہ سنہ ۱۳۴۰-۴۱ فصلی میں سمت گوداوری میں محکمہ زراعت کی طرف سے ۳۰۱۳۴۴۰ پونڈ گورانی کا تخم تقسیم کیا گیا جس سے ۱۶۷،۴۱۲ ایکڑ رقبۂ زمین میں کاشت کی گئی۔ یہاں اس کا اظہار بھی غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گورانی وہ کپاس ہے جو خالص ملکی پیداوار ہے نہ کہیں سے لائی گئی ہے اور نہ اس میں (Cross-breeding) سے کام لیا گیا ہے بلکہ محکمہ زراعت اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ برار کی ادنیٰ قسم کی کپاس سے مل کر جو اس کی نسل خراب ہوگئی ہے وہ پھر (Cross breeding) کے ذریعہ اپنی اصلی حالت پر لے آئی جائے۔

گورانی کے علاوہ ملک میں دو اور قسمیں پائی جاتی ہیں جن کے نام بھارت اور نمبری ہیں ضلع اورنگ آباد میں ایک اور قسم جو بنیلہ کے نام سے مشہور ہے اور اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے زیادہ مروج ہوتی جارہی ہے۔ کاشتکار اسے بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس کے تخم کی مانگ بڑھتی جارہی ہے محکمہ زراعت نے سنہ ۱۳۴۰-۴۱ف میں بنیلہ کا ۲۸۵۰۰ پونڈ تخم سمت گوداوری میں تقسیم کیا جس سے ۱۸۰۰ ایکڑ میں کاشت کی گئی۔ ضلع رائچور میں ایک اور قسم جس کو بمبئی کے محکمہ زراعت نے ترقی دی ہے بہت مقبول ہورہی ہے اس کا نام جیاونت ہے۔ اسی طرح رائچور میں گدگ نمبرا کی بھی مانگ بہت بڑھ رہی ہے اور محکمہ زراعت پر چہار اقسام یعنی بنیلہ، گورانی، جیاونت اور گدگ نمبرا کی ترقی، ترویج اور فراہمی تخم اور حفاظت نسل میں بہت کوشاں ہے۔

کپاس کی کاشت صرف مرہٹواڑہ کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ تلنگانہ اور کرناٹک میں اس کی کاشت کی جاتی ہے۔ آئندہ صفحہ کے اعداد شمار سے مرہٹواڑہ اور تلنگانہ کی کپاس کی کاشت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

نام سمت	سنہ ۱۳۴۱ف رقبۂ زیر کاشت	سنہ ۱۳۴۱ف پیداوار	سنہ ۱۳۴۲ف رقبۂ زیر کاشت	سنہ ۱۳۴۲ف پیداوار
مرہٹواڑہ	۳۲۰۰۷۱۲ ایکڑ	۴۵۲۷۶۰ گٹھے *	۳۱۴۳۱۴۴ ایکڑ	۴۸۸۰۳۹ گٹھے
تلنگانہ	۴۴۳۲۳۱ ایکڑ	۵۶۶۵۸ گٹھے	۴۵۸۵۰۱ ایکڑ	۴۵۸۵۲ گٹھے
کل	۳۶۴۳۹۴۳ ایکڑ	۵۰۹۴۱۸ گٹھے	۳۶۰۱۶۴۵	۵۳۳۸۹۱ گٹھے

ان اعداد وشمار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹواڑے میں کپاس کی حالت بہت ترقی پر ہے سنہ ۱۳۴۲ف سنہ ۱۳۴۱ف کے مقابلہ میں رقبہ میں ۱۶ر۱ فیصد کی کمی ہوگئی تھی لیکن سنہ ۱۳۴۱ف میں ۵۰۹۴۱۸ گٹھے پیداوار تھی اور سنہ ۱۳۴۲ف میں باوجود کمی رقبہ کے ۴ر۶ فی صد پیداوار میں زیادتی ہوئی تھی جو صرف موسمی حالات کی موافقت کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔

نمبر (۲) کپاس کی کاشت کی ضلع واری تفصیل

نام ضلع	سنہ ۱۳۴۱ف رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	سنہ ۱۳۴۱ف پیداوار گٹھے	سنہ ۱۳۴۲ف رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	سنہ ۱۳۴۲ف پیداوار گٹھے
اورنگ آباد	۶۴۷،۴۸۹	۱۱۵،۶۲۳	۷۲۴،۷۷۶	۱۰۵،۰۹۲
بیڑ	۵۷۹،۵۵۳	۱۰۴،۰۲۲	۱۰۵،۶۷۹	۶۰،۸۵۲
پربھنی	۷۲۹،۳۱۸	۵۷،۴۳۹	۷۲۳،۹۷۷	۱۳۲،۱۲۶
ناندیڑ	۴۵۳،۷۶۱	۳۸،۶۷۳	۴۳۷،۸۶۷	۶۸،۹۶۳
گلبرگہ	۸۵،۷۹۹	۱۵،۹۵۲	۹۵،۴۷۶	۱۴،۳۲۱
رائچور	۴۰۲،۰۷۹	۶۲،۷۱۹	۴۰۰،۳۹۶	۵۸،۰۵۷
عثمان آباد	۱۲۸،۴۳۶	۲۶،۰۵۹	۱۰۷،۱۶۴	۱۳،۹۲۵

* ایک گٹھا = ۴۰۰ پونڈ

نام ضلع	سنہ ۱۳۴۱ف رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	سنہ ۱۳۴۱ف پیداوار گٹھے	سنہ ۱۳۴۲ف رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	سنہ ۱۳۴۲ف پیداوار گٹھے
بیدر	۱۷۴،۲۷۷	۳۲،۲۷۳	۲۴۷،۸۰۹	۳۴،۶۹۳
اطراف بلدہ	۱۲،۲۰۰	۱،۸۷۷	۱۴۰،۴۴۸	۳،۳۱۱
میدک	۳،۱۰۴	۴۷۸	۲،۶۶۹	۳۱۴
محبوب نگر	۶،۲۹۰	۱،۱۱۱	۹،۸۸۸	۱،۲۳۶
نلگنڈہ	۱۱،۰۹۱	۲،۱۶۷	۱۱،۰۶۳	۱،۲۷۱
نظام آباد	۱۳،۳۶۷	۹۷۷	۱۶،۰۰۳	۱،۶۳۸
ورنگل	۲۸،۱۷۵	۳،۸۱۳	۲۳،۹۷۸	۳،۳۹۶
عادل آباد	۲۶۶،۵۸۹	۳۶،۷۷۱	۲۹۲،۷۶۱	۲۹،۲۷۶
کریم نگر	۱۰۲،۴۱۵	۹،۴۶۴	۷۷،۶۹۱	۶،۴۱۰
کل	۳،۶۴۳،۹۴۳	۵۰۹،۴۱۸	۳،۶۰۱،۶۴۵	۵۳۳،۸۹۱

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ کپاس کی کاشت کے لحاظ سے رقبۂ زیر کاشت سب سے زیادہ پربھنی کا ہے۔ اورنگ آباد کا نمبر اس کے بعد آتا ہے پھر بیڑ اور پھر ناندیڑ کا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سالہائے زیر بحث میں پیداوار کا تناسب کاشت کے رقبہ کے تناسب سے نہیں بلکہ موسمی حالات کی وجہ سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے مثلاً پربھنی میں سنہ ۱۳۴۱ف میں رقبۂ زیر کاشت ۲۹۷،۵۵۳ تھا اور پیداوار ۳۹،۴۷۵ گٹھے تھی اس کے برخلاف اورنگ آباد میں اسی سال رقبۂ زیر کاشت ۶۴۷،۴۸۹ تھا لیکن پیداوار ۱۵۱،۶۲۳ گٹھے ہوئی۔ اسی طرح سنہ ۱۳۴۲ف میں پربھنی کا رقبۂ زیر کاشت باوجود کم ہونے کے پیداوار ۱۳۲،۱۲۶ گٹھے ہوئی اور اورنگ آباد کا رقبہ بڑھ جانے کے باوجود پیداوار صرف ۱۰۵،۰۹۲ ہوئی۔

اس کی وجہ محکمۂ زراعت نے یہ بتائی ہے کہ عام طور پر کاشتکار کپاس کے بعد جوار کی کاشت کرتے ہیں اور پھر کپاس کی کاشت

کرتے ہیں فصل ربیع میں جوار کی کاشت کی جاتی ہے جو فروری میں کاٹ لی جاتی ہے اس وقت تک ناگرکشی کے لئے زمین بہت سخت ہوجاتی ہے اس لئے بارش تک اس کو افتادہ چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر جب بارش میں کپاس بوئی جاتی ہے تو کپاس کی کاشت کو کافی تیار شدہ زمین نہیں ملتی اس لئے پیداوار بھی تھوڑی ہوتی ہے اس لئے پیداوار بھی تھوڑی ہوتی ہے۔ چنانچہ محکمۂ زراعت یہ کوشش کر رہا ہے کہ بجائے جوار کے کپاس کے بعد مونگ پھلی کی کاشت کی جائے۔ کیونکہ مونگ پھلی نومبر میں کاٹ لی جاتی ہے اور اس وقت زمین میں ناگرکشی کرنے کے قابل نمی ہوتی ہے اس لئے ایک طرف کپاس کو پہلے سے تیار شدہ زمین مل جاتی ہے اور دوسری طرف یہ ہوتا ہے کہ مونگ پھلی ایک ہلکی فصل (Light Crop) ہوتی ہے اور زمین اس سے کافی مقدار میں نائٹروجن مہیا ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے فصل کی زیادتی میں مدد مل جاتی ہے اس سلسلے میں بھی تبلیغی کام جاری ہے اور اب کاشتکار اس حقیقت سے واقف ہوتے جارہے ہیں۔

اب تک ہم نے ریاست حیدرآباد میں کپاس کی پیداوار کی حالت سے بحث کی ہے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ اس پیداوار کا کتنا حصہ اندرون ملک صرف ہوتا ہے اور کتنا حصہ بیرون ملک برآمد ہوجاتا ہے۔

سنہ			
۱۳۴۱ف	کل پیداوار	۵۰۹۴۱۸	گھٹے
	ملک کی گرنیوں میں صرف	۳۹۳۳۵	"
	ملک میں دیگر صرف	۲۳۸۷۵۱	"
	برآمد ذریعہ ریل	۱۸۰۲۲۰	"
	برآمد ذریعہ دیگر ذرائع	۵۱۱۱۲	"
	کل برآمد	۲۳۱۳۳۲	"
۱۳۴۲ف	کل پیداوار	۵۳۳۸۹۱	"
	ملک کی گرنیوں میں صرف	۴۰۷۲۹	"
	ملک میں دیگر صرف	۱۴۷۶۰۲	"
	برآمد ذریعہ ریل	۲۸۶۹۹۶	"
	برآمد ذریعہ دیگر ذرائع	۵۸۵۶۴	"
	کل برآمد	۳۴۵۵۶۰	"

سنہ ۱۳۴۳ف

کل پیداوار	۵۱۹۷۰۶	گٹھے
ملک کی گرنیوں میں صرف	۴۳۵۱۰	״
ملک میں دیگر صرف	۱۱۰۱۸۳	״
برآمد ذریعہ ریل	۲۹۲۶۱۹	״
برآمد ذریعہ دیگر ذرائع	۷۳۳۹۴	״
کل برآمد	۳۶۶۰۱۳	״

برآمد کے مذکورہ بالا اعداد و شمار کے دیکھنے سے یہ بدیہی طور پر نظر آتا ہے کہ ہر سال نصف سے زیادہ روئی بیرون ملک برآمد ہوتی ہے اور اس ذریعہ آمدنی سے کم و بیش تین کروڑ روپیہ سالانہ اوسط آمدنی پڑتا ہے۔

Export Value of cotton in 1340 and 1341 F.

برآمد سنہ ۱۳۴۰ف

صاف شدہ روئی	۳۶۹۴۲۷۳۹	کروڑ روپیہ
غیر صاف شدہ روئی	۳۷۶۴۴۸۴	لاکھ روپیہ
بیکار ( )	۱۷۸۷۱	ہزار روپیہ
جملہ برآمد کی قیمت	۴۰۷۲۴۷۹۴	کروڑ روپیہ

برآمد سنہ ۱۳۴۱ف

صاف شدہ روئی	۱۸۶۰۳۱۲۰	کروڑ روپیہ
غیر صاف شدہ روئی	۲۹۵۷۸۷۲	لاکھ روپیہ
بیکار ( )	۱۷۰۴۱	ہزار روپیہ
جملہ قیمت برآمد	۲۱۵۷۸۰۳۳	کروڑ روپیہ

اس کے علاوہ سنہ ۱۳۴۱ف میں کپاس کے تخم جو بیرون ملک برآمد کئے گئے ان کی قیمت ۱۲۷۱۰۱۰ لاکھ روپیہ تھی اگر اس کو بھی شامل کر دیا جائے تو کل رقم ۲۲۸۴۹۰۴۳ کروڑ روپیہ ہو جاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ سنہ ۱۳۴۰ف کے مقابلہ میں سنہ ۱۳۴۱ف میں تقریباً ۲ کروڑ روپیہ کی در آمد

میں کمی ہوگئی ہے لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سال کپاس کی پیداوار بہت کم ہوئی تھی اور خود اندرون ملک ۱۳۴۲ف کے لئے تخم مہیا کرنا مشکل ہوگیا تھا ایسی صورت میں اتنی برآمد بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔

اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری کپاس کو یہاں کی پیداوار میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ ہمارے پاس اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ ہمہ اقسام کی کپاس کی کاشت کی جارہی ہے اگر فی الحقیقت محکمۂ زراعت کی کوششیں کامیاب ثابت ہوئیں تو ہمارے ملک میں کپاس کا مستقبل اور بھی زیادہ درخشاں ہوجانے کی اُمید ہے۔

(۲) گیہوں

حیدرآباد میں گیہوں کے مختلف اقسام کے تجربات پربھنی میں کئے جارہے ہیں جن کے نتائج بھی نہایت اُمید افزا ہیں ۱۳۴۲ف میں ملک کا کل رقبہ زیر کاشت گندم ۱۳۰۰۶۷۹ ایکڑ تھا اور پیداوار کا تخمینہ ۶۸۳۲۸ ٹن تھا جو ظاہر ہے کہ ملک کے رقبہ کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ تلنگانہ میں گو تھوڑے بہت پیمانہ پر اس کی کاشت کی جاتی ہے لیکن وہاں کی زمینیں اس کے لئے زیادہ حاصل خیز نہیں ہیں گیہوں کے لئے سیاہ ریگڑی زمین بہت مناسب ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس فصل کے بہت بڑے حصہ کی کاشت بغیر کسی آب پاشی کے مرہٹواڑے اور کرناٹک کی ریگڑی زمینوں میں کی جاتی ہے اور فصلوں کا دارومدار بارش پر چھوڑ دیا جاتا ہے بیدر، پربھنی، ناندیڑ اور دیگر اضلاع میں تھوڑے رقبہ میں آب پاشی کے ساتھ اس کی کاشت کی جاتی ہے۔ یہاں کا گیہوں ہندوستان میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا لیکن پھر بھی اس کی کافی مقدار ہر سال بیرونجات کو برآمد ہوتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ یہاں کے کاشتکار عام طور پر جب گیہوں بوتے ہیں تو وہ اس قسم کے تخم کا استعمال کرتے ہیں جو مخلوط النسل اور کم پیداوار دینے والا ہوتا ہے اور اس کا دانہ بھی ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے۔ اس خرابی کو رفع کرنے کے لئے محکمۂ زراعت نے ۱۳۳۸ف سے پربھنی میں اس کی ترقی کی کوشش شروع کی ہے جو بہت امید افزا رہی ہے۔

گیہوں کی کاشت کے متعلق مستند (Botanist) کی رائے یہ ہے کہ جہاں صرف ۱۰ انچ بارش ہو وہاں گیہوں کی کاشت کی جاسکتی ہے۔ ہمارے یہاں بعض جگہ ایسی افتادہ زمینیں موجود ہیں جہاں بارش کا سالانہ اوسط ۱۲ سے ۱۵ انچ تک ہے اور اس طرح اگر ان افتادہ زمینوں پر گیہوں کی کاشت شروع کردی جائے تو اس کی مقدار میں ایک معتدبہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

ہمارے ملک کے محکمۂ زراعت نے اب تک ۱۲۵ قسم کے مختلف گیہوں کے تخم پر تجربات کئے ہیں اور ان میں سے نمبر ۳ پوسہ نمبر ۴

اور پونا نمبر ۳۸ بہت زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں اور ملک کی کوئی دوسری قسم پیداوار گندم ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ یہ اقسام نہ صرف زیادہ سے زیادہ پیداوار دیتے ہیں بلکہ مرض گردی کا سب سے زیادہ مقابلہ کرتے ہیں کاشتکاروں میں ان کی تبلیغ کیگئی ہے اور ان اقسام کے تخموں کی مانگ برابر بڑھ رہی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ ملک میں کاشتکار انہی اقسام کی کاشت کے عادی ہوجائیں گے۔

حیدرآباد کے ایک تعلیم یافتہ کاشتکار مسٹر (Brown) کو پونا نمبر ۳۸ کے تخم دیئے گئے تھے ان کا بیان ہے کہ ناموافق حالات میں بھی یہ کاشت ملک کی دوسری مقامی کاشتوں سے زیادہ اچھی ثابت ہوئی ہے۔

گیہوں کی کاشت کی ضلع واری تفصیل

نام ضلع	سنہ ۱۳۴۱ف		سنہ ۱۳۴۲ف	
	رقبہ زیر کاشت ایکر	پیداوار ٹن	رقبہ زیر کاشت ایکڑ	پیداوار ٹن
اورنگ آباد	۴۰۳،۰۵۳	۵۶،۹۰۵	۳۷۲،۵۲۱	۵۷،۳۷۷
بیڑ	۱۵۳،۵۸۹	۱۹،۷۱۳	۱۴۹،۵۸۸	۱۹،۱۹۹
پربھنی	۲۶۹،۴۵۳	۳۳،۰۸۰	۱۲۸،۹۶۸	۳۰،۶۶۵
ناندیڑ	۱۹۶،۷۳۶	۲۶،۳۴۸	۱۸۶،۹۹۲	۲۷،۱۳۰
گلبرگہ	۷۶،۱۱۲	۴،۴۶۰	۸۵،۴۷۴	۶،۴۴۰
رائچور	۸۷،۷۰۷	۵،۱۴۰	۸۸،۹۸۹	۷،۴۴۹
عثمان آباد	۱۱۳،۴۵۸	۱۰،۱۳۰	۱۱۹،۶۷۲	۱۴،۶۹۲
بیدر	۳۸،۹۳۶	۲،۸۶۸	۴۱،۳۱۶	۳،۴۲۴
اطراف بلدہ	۵،۴۸۵	۴۱۳	۶،۶۸۵	۴۴۸
میدک	۳،۸۸۹	۲۹۲	۳،۷۹۱	۳۴۹

نام ضلع	سنہ ١٣٤١ف رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	سنہ ١٣٤١ف پیداوار ٹن	سنہ ١٣٤٢ف رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	سنہ ١٣٤٢ف پیداوار ٹن
محبوب نگر	١٠،٠١٦	٦٨	١٩٠٦	٥٩
نلگنڈہ	۰	۰	۰	۰
نظام آباد	١٤٠٦	١٠٦	٩٤٨	٨٧
ورنگل	٢٥	١	٢٩	٢
عادل آباد	١٥،٥٩٥	١،٩٠٧	١٤،٢٩٣	٩٥٧
کریم نگر	٦٨٤	٦٢	٥٠٩	٤٧
	١٣٦،١٤٦	١٦١،٤٩٣	١٣٠٠٦٧٩	١٦٨٣٢٨

مذکورۂ بالا تفصیل سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بلحاظ رقبۂ کاشت اور بہ لحاظ پیداوار اورنگ آباد کی حالت سب سے اچھی اس کے بعد علی الترتیب پربھنی، ناندیڑ، بیڑ اور عثمان آباد ہیں جیسا کہ بدیہی طور پر نظر آتا ہے مرہٹواڑہ میں گیہوں کی کاشت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ علاقہ کرناٹک میں صرف عثمان آباد ایسا ضلع ہے جہاں زیادہ رقبہ زیر کاشت گندم ہے۔ تلنگانہ میں گیہوں کا رقبہ بہت کم ہے۔ نلگنڈہ میں گیہوں کی کاشت بالکل نہیں ہوتی اور ورنگل بھی پیداوار کے لحاظ سے بمنزلہ صفر کے ہے۔ تلنگانہ میں صرف ضلع عادل آباد ایک ایسا ضلع ہے جہاں تلنگانہ کے دوسرے اضلاع کے مقابلہ میں گیہوں کی زیادہ کاشت ہے لیکن وہ بھی کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ گو تلنگانہ میں بارش کافی ہوتی ہے لیکن وہاں کی زمین گیہوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔

سنہ ١٣٤٢ف میں کل رقبہ زیر کاشت گیہوں ١٣٠٠٦٧٩، ایکڑ تھا جبکہ سنہ ١٣٤١ف میں کل رقبۂ زیر کاشت گندم ١٣٦،١٤٦، ایکڑ تھا گویا ٦،٠٧٧، ایکڑ یا ٤ر٤٦ فی صد کی رقبہ میں کمی ہوگئی لیکن سنہ ١٣٤٢ف میں کل پیداوار ١٦٨٣٢٨ ٹن ہوئی جبکہ سنہ ١٣٤١ف میں ١٦١،٤٩٣ پیداوار ہوئی تھی گویا ٦،٨٣٥ ٹن یا ٤ر٢٣ فی صد کی پیداوار میں زیادتی ہوئی۔ باوجود رقبۂ کاشت میں کمی ہونے کے یہ زیادتی پیداوار کسی ترقی کا نتیجہ نہیں بلکہ عام موسمی حالات کی موافقت کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔

ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ گیہوں کے تحت کتنا رقبۂ آراضی زیر کاشت ہے اور اس کی پیداوار کی کیا حالت ہے لیکن محض اتنا ہماری

ضرورت کے لئے کافی نہیں ہے جب تک کہ ہم اس سے نہ واقف ہو جائیں کہ آیا ہمارے ملک کا پیدا شدہ گیہوں ہماری ضروریات کے لئے کافی ہوتا ہے یا نہیں اور کیا باوجود کمی پیداوار کے ہمارا ملک اپنا گیہوں دوسرے بیرونی مقامات کو برآمد کرتا ہے. ذیل کے اعداد و شمار ہمارے ملک کے گیہوں کی حالت پر صحیح روشنی ڈالتے ہیں.

سنہ ۱۳۴۱ ف

کل پیداوار	۱۶۱۴۹۳ ٹن یا ۴۵۲۱۸۰۴ من
پیداوار میں سے اندرون ملک صرف	۴۴۴۷۴۲۶ من
درآمد	۷۴۳۸۶ 〃
کل برآمد گیہوں اور آٹا	۷۴۳۷۸ من

سنہ ۱۳۴۲ ف

کل پیداوار	۱۶۸۳۲۸ ٹن یا ۴۷۱۳۱۸۴ من
پیداوار میں سے اندرون ملک صرف	۴۵۳۶۲۸۶ من
درآمد	۱۴۲۵۲۱ 〃
برآمد	۱۷۶۸۹۸

سنہ ۱۳۴۳ ف

کل پیداوار	.
اندرون ملک صرف	.
درآمد	۲۶۵۴۲۸ من
برآمد	۱۶۲۳۶۹ من

درآمد و برآمد کے مذکورہ صدر اعداد و شمار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پیداوار سے گیہوں کا صرف زیادہ ہے اور اس کے لئے ہر سال ایک بڑی مقدار بیرون ملک سے منگانی پڑتی ہے جو یقیناً ملک کے لئے ایک بار ہے. اس میں شک نہیں کہ یہاں سے ہمارا گیہوں برآمد بھی ہوتا ہے لیکن درآمد کے مقابلہ میں اول تو اس کی مقدار کم ہوتی ہے دوسرے وہ ادنی اقسم کا ہونے کے وجہ سے مقابلتاً کم قیمت وصول کرتا ہے

اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان افتادہ علاقوں میں جہاں گیہوں کی کاشت کے امکانات بتائے جاتے ہیں، اس کی کاشت کی جائے اور اگر محکمۂ زراعت اور زیادہ تبلیغ سے کام لے کر اعلیٰ قسم کی گیہوں کی کاشت کی ترویج کرے تو اگر برآمد نہ بھی بڑھے تو بھی باہر سے اعلیٰ قسم کے گیہوں نہ منگانا پڑیں گے اور اس طرح ملک کا بہت سا روپیہ باہر جانے سے بچ جائے گا۔

چاول

چاول ہمارے ملک کی نہایت اہم اور مرغوب غذا ہے۔ مرہٹواڑے اور تلنگانہ دونوں جگہ اس کا استعمال کیا جاتا ہے لیکن تلنگانہ کی تو غذا ہی چاول ہے۔ باوجود اس کے بھی تلنگانہ کے صرف ۳ فی صدی رقبۂ زیر کاشت پر چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کاشت میں مختلف اقسام کے چاول شامل ہیں۔ بہرحال جس قدر چاول کی ملک کو ضرورت ہے اس قدر چاول ملک میں پیدا نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے ہر سال کثیر مقدار میں چاول درآمد کیا جاتا ہے یہ درآمد پنجاب، صوبہ جات متوسط برما اور مدراس سے ہوتی ہے جو چاول ملک میں درآمد ہوتے ہیں ان کے اقسام حسب ذیل ہیں (۱) نمبر ۱۰ (۲) چاول نمبر ۲۴ (۳) کیچڑی (۴) جبیر اسال (۵) دلی بوکال (۶) مہاراجہ بوکال (۷) آکنا لی (۸) رام ساگر (۹) کسما (۱۰) کونامنی (۱۱) آکلو۔

ان اقسام میں سے شروع کے چھ نہایت اعلیٰ قسم کے ہوتے ہیں اور حیدرآباد وسکندرآباد کے غلہ فروش ان کو اعلیٰ اور متوسط طبقے کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ ساتویں قسم شروع کے چھ سے کسی قدر کمتر درجہ رکھتی ہے۔ آٹھویں سفید اور موٹی قسم ہوتی ہے اور موٹے چاولوں میں اچھی حیثیت رکھتی ہے۔ نویں قسم آٹھویں سے کمتر درجہ کے موٹے چاول ہیں دسویں اور گیارھویں دو قسمیں ہیں جن کو غربا استعمال کرتے ہیں ہماری ریاست میں زیادہ تر موٹے چاول کی کاشت ہوتی ہے اور باریک چاول بہت کم دستیاب ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ مدراس کے باریک چاول کثیر مقدار میں درآمد ہوتے ہیں۔

(اقتباس از حیدرآباد فارم جلد ۵ شمارہ ۲۵)

محکمۂ زراعت نے چاول کی کاشت کے متعدد تجربات کرکے نمبر ۲۳۶، نمبر ۳۸، اور نمبر ۴۰۵ کو ملک کے لئے بہت مفید پایا ہے۔ اور اب کاشتکاروں میں ان کے تخموں کی طلب بڑھ رہی ہے۔

چاول کے متعلق تفصیلی مضمون چونکہ میرے دوست محمد احمد صاحب سبزواری نے لکھا ہے اس لئے میں اس مضمون کو چھوڑ دینا مناسب سمجھتا ہوں صحیح اعداد و شمار صاحب موصوف کے مضمون سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

جوار

فصل مرہٹواڑے کے اضلاع اورنگ آباد، پربھنی، ناندیڑ، بیڑ، عثمان آباد اور بیدر میں جہاں زمینیں عموماً ہلکی اور گہرے رنگ کی ہیں اور جو ریگڑ کہلاتی ہیں ہوتی ہے۔ یہ ریگڑ زمینیں زیادہ تر فصل ربیع کے کام میں آتی ہیں۔ اس رقبہ کی خاص فصول جوار و کپاس ہیں وہ رقبہ جو جوار کے زیر کاشت ہے درحقیقت ریاست حیدرآباد میں بہت بڑا رقبہ ہے جو نوے لاکھ مربع میل ہے سارے ہندوستان میں جوار کا سب سے بڑا رقبہ یہی ہے۔ جوار اور گیہوں کے مختلف اقسام کے تجربات خاص کر پربھنی میں ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی اس کے تجربے کئے جارہے ہیں اب تک جوار کی مختلف قسموں میں حسب ذیل قسمیں بہت اچھی ثابت ہوئی ہیں۔

Annual administration Report of Agriculture 1341
"One Local Variety, Nanded yellow, proved to be peculiarly resistant to diseases and insect pests and two imported Variesties Ramkhel and Saoner gave the highest yeild."

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ گورانی روئی کی طرح ہمارے ملک کی ناندیڑ یلو بھی اپنی خصوصیات کی وجہ سے ملک کی بہترین پیداوار ہے اور بیرونی جواروں یعنی رام کھیل اور ساونیر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ان تین قسموں کے علاوہ بیرونی اقسام میں ایشا پوری، کودل دانی، بوچھا جونا، کان پور، دودھیا بھی اچھی قسمیں پائی گئی ہیں اور برابر تجربات کئے جارہے اور حیدرآباد کی جوار کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ رام کھیل اور ناندیڑ یلو کی خصوصیات سے اب کاشتکار بھی واقف ہوچکے ہیں اور ان کے تخموں کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ چونکہ جوار و کپاس تقریباً ایک ہی رقبہ میں پیدا ہوتے ہیں اور دونوں کی کاشت سے زمین کی زرخیزی کم ہوتی ہے اس لئے کوشش اس امر کی جارہی ہے کہ کاشتکار سہ سالہ دور فصل کے طریقہ پر عمل پیرا ہوجائیں اور اس میں مونگ پھلی کی کاشت بھی شامل ہوجائے یعنی ایک ہی رقبہ پر اگر ایک مرتبہ جوار کی کاشت ہو تو دوسری بار مونگ پھلی کی اور پھر کپاس کی چونکہ جیسا کپاس کے بیان میں ظاہر کیا جاچکا ہے مونگ پھلی نہ صرف ایک ملکی فصل ہے بلکہ اس کی کاشت سے زمین میں نائٹروجن کی کافی مقدار مہیا ہوجاتی ہے۔

مرہٹواڑے کے علاوہ تلنگانہ کے اضلاع میں بھی جوار کی کاشت ہوتی ہے جن میں اضلاع محبوب نگر، نلگنڈہ، ورنگل، عادل آباد اور کریم نگر کے بڑے بڑے رقبہ جات شامل ہیں۔ ۱۳۴۰ف میں کل رقبہ زیر کاشت جوار ۹۵۸۷۸۹۶، ایکڑ تھا اور کل پیداوار جو اس رقبہ سے حاصل ہوئی اس کی مقدار ۱۳۰۵۲۷۵ ٹن تھی۔

جوار کی کاشت کی ضلع واری تفصیل

نام ضلع	سنہ ۱۳۴۱ف		سنہ ۱۳۴۲ف	
	رقبہ زیر کاشت ایکڑ	پیداوار ٹن	رقبہ زیر کاشت ایکڑ	پیداوار ٹن
اورنگ آباد	۸۳۹۶۷۴	۱۰۵۴۲۸	۸۰۱۵۱۵	۱۳۴۱۷۸
بیڑ	۵۳۸۷۶۷	۶۲۶۲۴	۵۸۳۹۳۳	۹۷۷۵۶
پربھنی	۷۵۶۵۸۴	۷۳۸۸۴	۸۱۲۱۵۰	۱۲۴۶۳۱
ناندیڑ	۵۷۲۳۱۲	۵۵۸۹۰	۵۳۷۶۲۸	۹۰۰۳۲
گلبرگہ	۱۵۴۶۱۶۶	۱۷۲۵۶۲	۱۴۳۲۴۶۲	۲۱۹۸۲۵
رائچور	۹۱۸۰۶۷	۱۲۸۰۵۰	۸۹۱۰۸۰	۱۲۴۳۱۴
عثمان آباد	۱۰۸۹۸۷۳	۱۰۶۴۳۳	۱۰۷۲۰۴۴	۱۱۹۶۸۴
بیدر	۶۸۴۷۶۲	۹۰۵۰۵	۶۵۵۶۲۰	۸۲۳۱۸
اطراف بلدہ	۱۲۷۶۹۸	۷۱۲۶	۱۳۲۵۴۱	۱۴۷۸۹
میدک	۱۵۱۷۹۹	۱۷۳۳۰	۱۴۲۶۱	۲۴۴۰۷
محبوب نگر	۴۰۳۲۵۵	۳۹۲۵۳	۴۲۹۸۵۳	۴۲۰۲۶
نظام آباد	۱۵۲۸۲۳	۱۰۶۶۳	۱۴۵۴۲۴	۱۴۲۰۲
نلگنڈہ	۳۰۱۳۹۴	۲۵۹۸۲	۲۰۳۱۹۴	۳۸۰۶۵
ورنگل	۴۴۲۶۴۰	۳۷۰۵۱	۵۱۳۴۴۹	۶۴۶۶۷
عادل آباد	۶۰۷۷۲۹	۵۹۳۴۸	۵۲۷۱۴۳	۵۸۸۳۳
کریم نگر	۳۵۷۴۹۴	۲۴۹۳۲	۳۷۰۹۰۴	۲۵۸۷۲
کل	۹۴۶۴۰۳۷	۱۰۱۷۰۶۶	۰۹۳۵۶۲۰۱	۱۲۷۵۳۶۳

۱۳۴۱ف میں رقبۂ زیر کاشت ۹۴۶۴۰۳۷ ایکڑ تھا اور پیداوار ۱۰۱۷۰۶۶ ٹن ہوئی تھی اور ۱۳۴۲ف میں رقبۂ زیر کاشت ۹۳۵۶۲۰۱ ایکڑ اور پیداوار ۱۲۷۵۳۶۳ ٹن ہوئی۔ اگر ۱۳۴۰ف سے ۱۳۴۲ف تک رقبۂ زیر کاشت کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال رقبۂ زیر کاشت گھٹتا جا رہا ہے اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ رقبۂ جوار میں کپاس کی کاشت زیادہ کی جا رہی ہے۔

جوار کے رقبۂ زیر کاشت اور پیداوار کی حالت سب سے اچھی گلبرگہ پھر عثمان آباد۔ اس کے بعد علی الترتیب رائچور اورنگ آباد پربھنی، بیدر، عادل آباد اور ناندیڑ میں ہے۔

۱۳۴۱ف اور ۱۳۴۲ف کی پیداوار میں ۳۹ / ۲۵ کا اضافہ ہوا ہے جو کچھ تو موسمی حالات کا نتیجہ ہے اور کچھ محکمۂ زراعت کی تبلیغ اور اچھے تخم استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔

اب ہم کو دیکھنا ہے کہ ہمارے ملک کی جوار کی حالت درآمد و برآمد کے لحاظ سے کیا ہے اور ملک میں کل پیداوار میں سے کیا صرف ہوتا ہے۔

۱۳۴۰ف	کل پیداوار	۱۳۰۵۲۷۵ ٹن یا ۳۶۵۴۷۷۰۰ من
	پیداوار میں سے اندرون ملک صرف	۵۷۸۵۹۱۹ من
	درآمد	۱۶۷۵۹۸ ″
	برآمد	۷۶۱۴۸۱ ″
۱۳۴۱ف	کل پیداوار	۱۰۱۷۰۶۶ ٹن یا ۲۸۴۷۷۸۴۸ من
	پیداوار میں سے اندرون ملک صرف	۲۷۹۷۹۷۱۱ من
	درآمد	۴۲۹۵۱۴ ″
	برآمد	۴۹۸۱۳۷ ″
۱۳۴۲ف	کل پیداوار	۱۲۷۵۳۶۳ ٹن یا ۳۵۷۱۰۱۶۴ من
	پیداوار میں سے اندرون ملک صرف	۳۴۸۸۵۱۰۷ من
	درآمد	۰
	برآمد	۸۲۵۰۵۷ من

سنہ ۱۳۴۳ ف

کل پیداوار	۲۳۸۰۶۷۷۶ من	تخمیناً
اندرون ملک صرف	۲۲۸۶۹۸۰۷ من	
درآمد	•	
برآمد	۹۳۶۹۶۹ من	

درآمد و برآمد کے ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جوار کا صرف بہت زیادہ ہے اور غریب طبقہ زیادہ تر جوار پر گذر کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہماری جوار کافی مقدار میں بیرون ملک برآمد ہوتی ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں جب کاشتکار محکمہ زراعت کی سفارش کردہ جواروں کی کاشت کرنے لگیں گے تو اور زیادہ ہمارے ملک کے جوار کی طلب بڑھ جائے گی۔

نیشکر

ہندوستان میں سالانہ شکر کا خرچ بہت بڑھا ہوا ہے اور اس کی تیاری کے لئے نیشکر کی کاشت نہایت ضروری ہے جب تک ہندوستان میں شکر سازی کے کارخانے نہیں قایم ہوئے تھے اس وقت تک یہاں کی شکر کا صرف جاوا دیا کرتا تھا رپورٹ تحقیقات ٹیرف بورڈ میں ہندوستان میں کارخانہ جات سفید شکر کے قیام کی سفارش کی گئی اور اس کے بعد ہی سے ہندوستان میں اس صنعت کو فروغ ہونا شروع ہوا سب سے زیادہ سرگرمی بہار نے دکھائی اور سنہ ۳۳-۳۴ء مطابق سنہ ۴۲ف میں شمالی بہار میں (۱۲) گرنیوں نے تقریباً اسّی ہزار ایکڑ زمین کے نیشکر کی پیداوار کا رس نکالا، اور اس کے بعد برابر اضافہ ہوتا رہا۔ رپورٹ زراعت صوبہ بہار و اڑیسہ سنہ ۳۱-۳۲ء میں درج ہے کہ صنعت سفید شکر سازی کی فلاح و بہبود عمدہ قسم کے خام پیداوار اور نیشکر کی کاشت پر منحصر ہے اور چنانچہ وہاں کا محکمہ زراعت برابر عمدہ اقسام نیشکر کی کاشت کا تجربہ کر رہا ہے۔ امپیریل شوگرس اکسپرٹس نے مختلف تجربات کے بعد ایسے نیشکر کے اقسام معلوم کئے جو صوبہ بہار کے لئے موزوں تھے گذشتہ چھ سال کے تجربہ کے بعد کوئمبٹور قسم کے نیشکر کی کاشت سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوئی اس نیشکر کی خاص خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ سخت ہونے کی وجہ سے مزاگیان اس پر حملہ نہیں کرتیں اور رس بہت کافی نکلتا ہے۔ محکمہ زراعت ممالک محروسہ سرکار عالی بھی کوئمبٹور نمبر ۲۱۳ کی ترویج کر رہا ہے اور اضلاع نظام آباد میدک، محبوب نگر، نلگنڈہ، ورنگل اور عادل آباد و بیدر میں اس کے مظاہرے کئے جا چکے ہیں۔ یہ قسم اضلاع نظام آباد اور میدک میں بہت مقبول ہو چکی ہے اور نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے۔ ناظم صاحب زراعت ممالک محروسہ سرکار عالی اپنی رپورٹ سنہ ۴۱ف میں لکھتے ہیں کہ:-

کوئمبٹور نمبر ۲۱۳ نیشکر عمدہ اقسام فصول میں سب سے زیادہ کامیاب رہی ہے۔ گذشتہ چند سال سے ممالک محروسہ

سرکار عالی میں بالعموم اور تلنگانہ میں بالخصوص نیشکر کا زیر کاشت رقبہ انحطاط پر تھا۔ کاشتکار جس قسم کی نیشکر کی کاشت کر رہے تھے وہ نرم اور موٹی قسم کا تھا اور اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ چاروں طرف پھیلتا ہے اور مصنوعی طور پر سہارا نہ دینے کی صورت میں گر جاتا ہے۔ کاشتکار کو سہارا دینے کے لئے کم قیمت پر لکڑیاں دستیاب نہ ہوتی تھیں اور بہت سی مشکلات پیش آتی تھیں ۱۳۳۹ف میں نیشکر کی قسم نمبر ۲۱۳ کو جاوا کے طریقہ پر نالیوں میں کاشت کرنے کا مظاہرہ کیا گیا۔ نالیوں میں عمیق بونے سے فصل کو استادہ رہنے میں مدد ملتی ہے"

۱۳۴۰ف میں تلنگانہ میں صرف ۱۵ ایکڑ پر اس قسم کی کاشت کی گئی تھی لیکن ۱۳۴۱ف میں اس کا رقبہ زیر کاشت ۵۲۶ ایکڑ تک بڑھ گیا۔

مسٹر ایم۔ ایس لکشمن راؤ دکیل عدالت العالیہ سرکار عالی اپنے تجربات اور تحقیق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

ممالک محروسہ سرکار عالی کو قدرت نے بعض سہولتیں ایسی بہم پہنچائی ہیں جن سے نیشکر کی کاشت بہت آسان ہے۔ فصول آبی و تابی کے لئے بڑے بڑے تالابوں سے بہت سا پانی فضول صرف ہو جاتا ہے اس کو نیشکر کی کاشت کے لئے زیادہ فائدہ بخش صورت میں صرف کیا جا سکتا ہے۔ دوسری سہولت یہ ہے کہ ملک محروسہ سرکار عالی او کھہ کی کاشت کے لئے صرف دس ماہ کی مدت درکار ہے حالانکہ ملک میسور میں اس کی کاشت کے لئے ۱۴ سے ۱۸ ماہ تک درکار ہوتے ہیں۔ ملک میسور میں (۴۰۰۰۰) ایکڑ رقبۂ اراضی میں نیشکر کی کاشت ہوتی ہے اور ملک سرکار عالی میں ۳۵۹۳ ایکڑ رقبۂ اراضی زیر کاشت نیشکر ہے ۱۳۴۱ف (۱۳۴۲ف میں یہ رقبہ بڑھ کر ۴۰۲۱۲ ایکڑ تک پہونچ گیا ہے) نظام ساگر و تنگ بھدرا کے تالابوں کے بعد ممالک محروسہ سرکار عالی کی حالت کم از کم میسور کے مساوی ہو جائے گی مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اعلیٰ قسم کا گنا مثلاً کوئمبٹور نمبر ۲۱۳ کاشت کریں اور اس سیرابی سے فائدہ اٹھائیں۔

کوئمبٹور نمبر ۲۱۳ کے بعد ہیبل (Hebbal) نمبر ۴۵ ہے یہ نیشکر بھی مقامی نیشکر سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور مزنگیوں کا حملہ اس پر بھی کم ہوتا ہے۔

نیشکر کی کاشت کی ضلع واری تفصیل

نام ضلع	سنہ ۱۳۴۱ف		سنہ ۱۳۴۲ف	
	رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	پیداوار بصورت گڑ ٹن	رقبۂ زیر کاشت ایکڑ	پیداوار بصورت گڑ ٹن
اورنگ آباد	۱۶۰۸	۲۴۲۳	۱۹۴۷	۳۱۷۸
بیڑ	۹۱۴	۱۳۷۷	۳۱۷۰	۴۷۷۶
پربھنی	۱۳۶۰	۲۰۴۹	۹۶۵	۱۴۵۴
ناندیڑ	۳۵۰	۵۷۱	۴۳۳	۷۶۱
گلبرگہ	۳۷۲	۴۲۰	۵۲۱	۵۸۹
رائچور	۲۶۶۷	۲۳۴۴	۲۶۳۵	۳۶۳۹
عثمان آباد	۵۹۸۲	۸۲۶۲	۶۶۹۸	۶۷۲۸
بیدر	۲۰۷۶۳	۴۴۶۰۸	۲۱۶۹۹	۵۰۸۵۷
اطراف بلدہ	۱۷۵	۲۳۴	۳۷۱	۴۹۷
میدک	۱۷۱	۳۴۴	۲۰۲	۳۰۴
محبوب نگر	۵۴	۵۴	۶۴	۶۴
نلگنڈہ	۰	۰	۳	۲
نظام آباد	۹۰۵	۱۸۱۸	۱۳۹۶	۲۸۰۵
ورنگل	۳	۳	۲۹	۲۹
عادل آباد	۶۴	۵۲	۷۶	۸۶
کریم نگر	۵	۵	۳	۵
کل	۳۵۳۹۳	۶۴۵۶۴	۴۰۲۱۲	۷۵۷۷۴

سنہ ۱۳۴۰ف میں کل رقبہ زیر کاشت نیشکر ۳۴۴۷۵ ایکڑ تھا اور کل پیداوار جو اس رقبہ سے حاصل ہوئی ۴۹۴۴۳ ٹن بصورت گڑ تھی۔

سنہ ۱۳۴۱ف میں کل رقبہ زیر کاشت نیشکر ۳۵۳۹۲ ایکڑ تھا اور کل پیداوار جو اس رقبہ سے حاصل ہوئی گڑ کی صورت میں ۶۴۵۶۴ ٹن تھی۔

سنہ ۱۳۴۲ف کل رقبہ زیر کاشت نیشکر ۴۰۲۱۲ ایکڑ تھا اور کل پیداوار گڑ کی صورت میں ۷۵۷۷۴ ٹن تھی۔ ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال رقبہ زیر کاشت نیشکر اور پیداوار بڑھ رہے ہیں اور کاشتکاروں میں محکمہ زراعت کی کوششوں سے کافی دلچسپی ہوگئی ہے۔

رقبۂ زیر کاشت اور پیداوار معلوم ہونیکے بعد اب ہمکو دیکھنا یہ ہے کہ اس پیداوار میں سے اندرون ملک کیا صرف ہوتا ہے اور بیرونجات کو کیا برآمد ہوتا ہے۔ ذیل کی تفصیل سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سنہ		
سنہ ۱۳۴۰ف	کل پیداوار	۴۹۴۴۳ ٹن یا ۱۳۸۴۴۰۴ ٹن
	درآمد بصورت گڑ	۵۲۵۵ ٹن
	بصورت شکر	۵۲۲۴۲۵ ٹن
	بصورت راب	۶۳۷۳۲۶ ٹن
پیداوار میں سے	اندرون ملک صرف	۱۲۸۱۰۹۵ ٹن
	کل برآمد	۳۳۰۹ ٹن قیمتی ۲۱۰۳۸ روپیہ (Trade Statics)
سنہ ۱۳۴۱ف	کل پیداوار	۶۴۵۶۴ ٹن یا ۱۸۰۷۷۹۲ ٹن
	اندرون ملک صرف	۱۸۰۳۰۷۰ ٹن
	کل برآمد	۴۷۲۲ ٹن قیمتی ۳۱۶۷۰ روپیہ (Trade Statics)
	درآمد بصورت گڑ	۱۰۰۴ ٹن
	درآمد بصورت شکر	۴۷۷۹۰۳ ٹن
	درآمد بصورت راب	۶۵۲۲۰۶ ٹن

سنہ ۱۳۴۲ ف

کل پیداوار	۴۷۷۵ ٹن یا ۲۱۲۱۶۷۲ ٹن
اندرون ملک صرف	لاکھ ۲۱۱۳۵۶۹ ٹن
کل برآمد	۸۱۰۳ من قیمتی ۵۴۰۰۰ روپیہ (Customs-Report)
درآمد بشکل گڑ	۶۱۸۰۵۷ من
درآمد بشکل شکر	۴۹۴۹۲۲ من

سنہ ۱۳۴۳ ف

کل پیداوار	
اندرون ملک صرف	
کل برآمد	۱۱۸۷۳ من قیمتی ۸۹۰۰۰ روپیہ (Report Customs P.28)
درآمد بشکل گڑ	۴۲۷۶۷۱ من
بشکل شکر	۴۸۷۰۲۶ من

ان اعداد کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیداوار کے مقابلہ میں برآمد بہت کم ہے اور ابھی ہمارے نیشکر نے ایک بڑے ذریعہ آمدنی کی صورت اختیار نہیں کیا ہے وجہ ظاہر ہے کہ ملک کا صرف بہت بڑھا ہوا ہے۔ اور پیداوار صرف کا ساتھ نہیں دے سکتی یہی وجہ ہے کہ ہر سال گڑ، شکر اور راب کی شکل میں بہت بڑی مقدار درآمد کرنا پڑتی ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر ترقی کی یہی رفتار رہی اور خود اندرون ملک شکر سازی کے کارخانے قائم ہوگئے تو آیندہ اس قدر مقدار درآمد نہ کرنا پڑیگی اس صنعت کے قیام کی سخت ضرورت ہے اور تعجب ہے کہ اب تک اندرون ملک شکر سازی کے کارخانہ جات کیوں نہیں قائم ہوئے۔

روغنی بیج Oil Seeds.

روغنی بیج بھی ہمارے ملک کی اہم پیداوار ہیں۔ ان میں تل، السی، رائی، ارنڈی، مونگ پھلی اور دوسرے متفرق تخم شامل ہیں لیکن ان سب میں تل، السی، ارنڈی، اور مونگ پھلی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

ہر ملک میں روغنی بیج ملک کی قیمتی پیداواروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ محکمۂ زراعت نے صرف ارنڈی اور مونگ پھلی تک اپنے تجربات کو محدود کردیا ہے۔ گو اس معاملہ میں اُن کے تجربات ضرور مفید ثابت ہوئے ہیں لیکن کیا اچھا ہوتا جو

وہ تل اور السی کو بھی اپنے تجربات میں شامل کر لیتے تاکہ کاشتکار جس طرح دوسری چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے قابل ہوئے ہیں اُن سے بھی خاطر خواہ طور پر مستفید ہوتے۔ بہر حال چونکہ اس وقت تک ارنڈی اور مونگ پھلی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ اس لئے میں بھی یہاں اُنہی پر روشنی ڈالوں گا۔

سنہ ۱۳۴۰ف	میں ارنڈی کی برآمد	۲۱۴۱۶۷۳ من تھی
سنہ ۱۳۴۱ف	″ ″ ″	۱۸۹۸۶۵۲ ″
سنہ ۱۳۴۲ف	″ ″ ″	۲۲۳۰۲۵۰ ″
سنہ ۱۳۴۳ف	″ ″ ″	۱۹۴۷۶۶۶ ″

ہندوستان ہی زمانہ قدیم سے ایک ایسا ملک رہا ہے جو تخم ارنڈی اور اس کے تیل کی سربراہی میں دنیا میں سب سے بڑا حصہ لے رہا ہے۔ ہندوستان میں پندرہ لاکھ ایکڑ رقبہ زیر کاشت ارنڈی ہے اور اس کا تقریباً ۵۰ فیصد حصہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں واقع ہے۔ ۲۱ فیصد حصہ مدراس میں اور بقیہ کل ہندوستان میں واقع ہے۔ تخم ارنڈی جو کل ہندوستان سے سالانہ دستیاب ہوتا ہے ۱۳۵۰۰۰ ٹن تخمیناً ہے جس میں سے ۳۲ فیصد ممالک محروسہ سرکار عالی سے ۲۵ فیصد مدراس سے ۱۸ فیصد بمبئی سے اور بقیہ دوسرے حصص ہند سے حاصل ہوتا ہے۔ ان اعداد کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بلحاظ رقبہ اور بہ لحاظ پیداوار دونوں طرح سے ہمارا ملک ہندوستان کے دوسرے حصوں میں سب سے پیش پیش ہے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں اور بالخصوص تلنگانے کی چلکا زمینات میں جو نہایت ریتلی اور موری ہوتی ہیں اس کی کاشت کیجاتی ہے اس کاشت کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ایسی زمینات رطوبت کو بہت قلیل مقدار میں جذب کرتی ہیں اور جونہی رطوبت ختم ہو جاتی ہے یہ زمین سخت ہو جاتی ہیں۔ اسلئے ان میں کسی دوسری چیز کی کاشت نہیں ہو سکتی۔ لیکن فصول دوری کے طور پر ایسی زمینوں میں اکثر اوقات سیاہ تل، گھانسی تل، کلسی اور اگر زمین قدرے اچھی ہو تو باجرا، جوار، اور لونگ پھلی کی بھی کاشت ہوتی ہے۔ گو کاشتکار ارنڈی کی کاشت کرتے ہیں لیکن وہ ابھی تک اس سے لاعلم ہیں کہ کونسے پودے زیادہ پھل دیتے ہیں۔ چنانچہ محکمۂ زراعت اس خصوص میں خاطر خواہ دلچسپی لے رہا ہے اور تجربے کر کے تبلیغ بھی کر رہا ہے۔ تجربوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ جس درخت میں مادہ پھول جتنے کثیر مقدار میں ہوں گے اتنے ہی کثیر مقدار میں تخم حاصل ہونگے۔ موجودہ صورت میں فی ایکڑ ڈھائی سو پونڈ تخم کا اوسط ہے جو ظاہر ہے کہ بہت ہی کم ہے۔ امید ہے کہ جب کاشتکار محکمۂ زراعت کی ہدایتوں پر عمل کرنے لگیں گے تو کم از کم موجودہ صورت سے دوگنی پیداوار حاصل ہونے

لگے گی۔ ہندوستان کے محکمۂ Imperial counsil of Agricaltural research نے اس فصل پر توجہ دینے کا وعدہ کرلیا ہے اور امید ہے کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔

مونگ پھلی کی بھی بہت بڑی مقدار کاشت کی جاتی ہے یہ خاص طور پر تلنگانہ میں کاشت کی جارہی ہے لیکن وہاں کے لوگ مخلوط کاشت کرتے ہیں جس سے پیداوار کم اور کم تر درجہ کی ہوتی ہے۔ ہمارا محکمۂ زراعت اسطرف بھی کافی توجہ دے رہا ہے اور مختلف تجربات کرکے دو اقسام کو علٰحدہ کرلیا گیا ہے۔ ایک کانکے Kanke نمبر ۱۷ جو نہایت کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اور اضلاع میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہے دوسری قسم Spanish peanut جو نہایت امید افزا معلوم ہوتی ہے۔ مونگ پھلی ایک پھلی دار فصل ہے اور کپاس اور جوار کے درمیان اسکو کاشت کرنے سے یہ کھاد کا کام دیتی ہے کیونکہ مذکورۂ صدر دونوں فصلیں اگانے میں زمین کی طاقت بہت صرف ہوجاتی ہے اسلئے ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ درمیان میں کوئی ایسی فصل بوئی جائے جس سے زمین کی زیادہ طاقت بھی نہ صرف ہو اور کھاد کا کام بھی پورا ہوجائے۔ اسکی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ سنہ ۱۳۴۲ف میں ۵۱۰۰۶۱۲ من اور سنہ ۱۳۴۳ف میں ۴۳۱۱۶۵۴ من مونگ پھلی بیرون ملک برآمد ہوئی۔

السی linseed:۔ روغنی بیجوں میں السی بھی کافی اہمیت رکھتی ہے۔ ارضیات سے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے تک ہندوستان انگلستان کے لئے سب سے زیادہ السی مہیا کرتا ہے۔ (Indian Trade Journal) ریاست حیدرآباد میں السی کے زیر کاشت رقبہ کل ہندوستان کے رقبہ کا ۱۸ فیصد رہا ہے۔ گذشتہ ۱۳ سالوں میں کافی اتار چڑھاؤ ہوتے رہے ہیں۔ اور رقبہ 250000 ایکڑ تک پہنچ گیا تھا۔ مرہٹواڑہ اس فصل کے لئے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کا حصہ اس کاشت میں ۸۰ سے ۹۰ فیصد تک رہا ہے۔ السی کے بازار حسب ذیل مقامات پر ہیں۔

گلبرگہ۔ ٹنکرپلی۔ وقارآباد۔ ظہیرآباد (بیدر) سیرم۔ شاہ آباد۔ چیتاپور۔ یادگیر۔ تانڈور۔ آصف آباد۔ رائچور۔ نواندگی۔ جالنہ۔ نظام آباد۔ دھرم آباد۔ سیلو۔ پورنا۔ پربھنی۔ اورنگ آباد۔ ناندیڑ۔ باسر۔ عمدہ نگر۔ پرلی اور لاسور۔

سنہ ۱۳۴۰ف	میں	۵۱۰۷۶۷	من	السی برآمد ہوئی
سنہ ۱۳۴۱ف	میں	۶۲۱۶۲۱	”	”
سنہ ۱۳۴۲ف	میں	۱۵۰۵۷۲۱	”	”

سنہ ۳۴ف میں ۱۲۹۷،۴۳ من السی برآمد ہوئی

روغنی بیجوں میں جس قدر اس کا بازار وسیع ہے اور کسی کا نہیں اور ہر سال لاکھوں من السی برآمد ہوتی ہے جو ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑا ذریعہ آمدنی کا ہے انگلستان اسکا اب بھی سب سے بڑا خریدار ہے اگر محکمۂ زراعت کچھ توجہ اس طرف بھی صرف کرے تو امید ہو سکتی ہے کہ اس کا بازار اور زیادہ وسیع ہو جائے۔ اور زیادہ پیداوار حاصل ہونے لگے۔

رياض الحسن ہاشمی
متعلم سال چہارم

حیدرآباد سول سروس

(از لفٹنٹ کرنل سر رچرڈ ٹشنوکس ٹرنچ سابق صدر المہام مال و پولس)

سر رچرڈ ٹرنچ کا یہ مضمون ایشیاٹک ریویو میں چھپا تھا ہم یہاں اسکا ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ حیدرآباد سول سروس کا قیام بھی دورِ عثمانی کا ایک زرین کارنامہ ہے۔ ہمارے یہاں کے سیولینس کی کارکردگی دیانت، کردار کی خوبی اور سب سے بڑھ کر اپنے آقائے ولی نعمت سے وفاداری ہی کی وجہ ہے کہ وہ اب ریاست کے ممتاز عہدوں پر ترقی پاتے جارہے ہیں۔ سر رچرڈ ٹرنچ نے انھیں جن الفاظ میں سراہا ہے وہ ان کے لئے باعث فخر ہے۔ ادیر

دنیا کے ہر متمدن ملک کا حکومتی نظام چاہے وہ شخصی ہو یا جمہوری، تمام تر وہاں کے عہدہ داروں کی کارکردگی، وفاداری اور دیانتداری پر منحصر ہے، خاص طور پر وہ عہدہ دار جن کے فرائض اُن کو عوام سے قریب تر کر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ انہیں ممالک میں زیادہ ممکن اور صحیح ہو سکتا ہے جہاں تعلیم کا عام معیار گھٹا ہوا نہیں ہے۔ سول سروس اور پولس کی ملازمت کو ہندوستان کے آیندہ قانونی دستور میں جو اہمیت دی گئی وہ اسی امر کے مدنظر ہے۔ برٹش انڈیا کی ملازمت کو تو حال ہی میں یہ اہمیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن انڈین سول سروس کے سخت ترین نقاد بھی ایک صدی سے یہ تسلیم کرتے آئے ہیں کہ تاریخ اس سے زیادہ بہتر طریقہ حکومت پیش نہیں کر سکتی اسی سلسلے میں یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ ہندوستان کی بعض دولت مند اور بڑی ریاستوں نے برٹش گورنمنٹ

کی مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے پاس بھی سول سروس کا طریقہ ایک منظم اور دستوری بنیادوں پر رائج کیا لیکن عام طور پر یہ معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ اس بارے میں کہاں تک انکی کوشش بارآور ہوئیں یہ مضمون صرف حیدرآباد سول سروس سے متعلق ہے۔

ملازمت کا معیار، ریاست کی وسعت اور زرمالگذاری پر منحصر ہے کیونکہ بہترین کارگذار اور محنتی عہدہ داروں کو صرف دولتمند ریاست ہی بڑی تنخواہیں دیکر حاصل کرسکتی ہے، جتنی بڑی ریاست ہوگی ویسے ہی ایک وسیع عملہ کی ضرورت ہوگی جس کے بغیر ریاست کی روزافزوں ترقی کی نگہداشت ناممکن ہے، ان دونوں مذکورہ حالات کا خیال کرتے ہوئے حیدرآباد ایک خوش قسمت ریاست ہے۔ کیونکہ اس کی آمدنی، رقبہ اور آبادی ایک صوبہ کے برابر ہے، حیدرآباد اس پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے کہ وہ بہ نسبت دوسری ہندوستانی ریاستوں کے اپنے پاس ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ طبقہ رکھتا ہے جو حکومت کرنیکی صلاحیت مغلوں سے اپنے ورثہ میں پاچکا ہے اور اس جوہر کو موجودہ روشن دماغ فرمانروا کے عہد حکومت میں حیدرآباد سول سروس کے قیام سے زیادہ روشن اور تابناک ہونے کا موقع ملا۔

یہاں یہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سول سروس کی گذشتہ بیس[2] سالہ زندگی کے واقعات کو از سر نو دھرایا جائے، سفارش اور سرپرستی کا دور دورہ ایک نہ ایک دن ختم ہونے والا ہے۔ حیدرآباد سول سروس کی حد تک تو اسکا بالکل خاتمہ ہوچکا اور اسکی ابتدا اس وقت ہوئی۔ جب اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے یہ احکام جاری کئے کہ غیر فنی محکمہ جات کے پچاس فیصد گزیٹڈ خالی عہدے سولینوں سے پر کئے جائیں۔ جس کا معیار صرف ذاتی قابلیت قرار دیا گیا، اسطرح "رشوت جنگ" اور "سفارش جنگ" جیسے خوفناک ذرائع اُن حیدرآبادی نوجوانوں کے جذبات کے مانع نہیں ہوتے جو اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اب تو یہ رجحان ہوتا جارہا ہے کہ پوری گزیٹڈ جائدادیں صرف سولینوں ہی کے تفویض کردی جائیں۔

سول سروس میں امیدواروں کو لینے کے لئے پہلے اُن کا انتخاب کیا جانا ضروری ہے چنانچہ ہر سال مختلف محکموں سے دریافت کیا جاتا ہے کہ کتنے سولینوں کی ضرورت ہے، محکمۂ مالگذاری میں کروڑگیری اور آبکاری کے محکمے شامل ہونے کی وجہ سے تین، عدالت کو دو اور محکمہ پولس وفنیانس کو ایک ایک سولین کی ضرورت ہوتی ہے اور ضرورتاً محکمہ بلدیہ، صنعت وحرفت تجارت اور دارالطبع بھی ایک ایک سولین کے لئے تحریک کرسکتے ہیں۔

انتخاب کے سلسلے میں قابل امیدواروں کو ایک اعلان کے ذریعے مقررہ تاریخ پر ایک انتخابی کمیٹی کے روبرو پیش ہونے کے لئے مطلع کردیا جاتا ہے۔ کمیٹی وزیر مالیات، کونسل کے اور دو اراکین، میر مجلس عدالت العالیہ اور ناظم

تعلیمات پر مشتمل ہوتی ہے، امیدواروں کا صحت مند اور بیس و تیئس برس کی عمر کے درمیان ہونا ضروری ہے۔ لیکن یورپی ڈگری یافتہ کے لیے پچیس برس تک کی رعایت ہے، امیدواروں کا حیدرآبادی ہونا ضروری ہے اور ساتھ ہی نیک چلنی کا صداقت نامہ بھی داخل کرنا پڑتا ہے، جہاں تک تعلیمی معیار کا تعلق ہے یونیورسٹی ڈگری لازمی ہے۔ امیدوار جو مذکورہ بالا کمیٹی کے روبرو پیش ہوتے ہیں اُن میں سے اکثر ایل بی ہوتے ہیں یا عثمانیہ، علیگڈھ، بمبئی، مدراس یونیورسٹیوں کے وہ طیلسانین ہوتے ہیں جو اعلیٰ نمبرات لے کر کامیابی حاصل کرتے ہیں، یہ تمام نوجوان حیدرآباد کے بہترین دل و دماغ کی نمایندگی کرتے ہیں، اُن میں سے ہر ایک کو کمیٹی کے روبرو الگ الگ پیش کیا جاتا ہے، جس قدر جائدادوں کے خالی رہنے کی توقع کی جاتی ہے اس سے پانچ گنا زیادہ امیدوار منتخب کیے جاتے ہیں لیکن ایسا کرنے سے قبل امیدواروں کی علمی لیاقت خاندانی حالات، اور شخصی وجاہت کی اچھی طرح جانچ کرلی جاتی ہے لیکن زیادہ تر اُن کے ذاتی جوہر ہی کو دیکھا جاتا ہے، بہترین کھلاڑی یا ایسا متعلم جس نے اپنے کالج کی طرف سے فٹ بال، کرکٹ، وغیرہ میں نام پیدا کیا ہو یا وہ جو خاص طور پر اپنی جماعت کا نمایندہ یا اسکوٹ لیڈر رہ چکا ہو، اِن خصوصیات کے تحت انتخاب کے وقت اُس کو اتنا ہی اچھا موقع ملتا ہے جتنا کہ ایک اعلیٰ کامیاب ہونے والے گریجویٹ کو، چاہے وہ کھلاڑی امتحان میں درجہ سوم ہی سے کیوں نہ پاس ہوا ہو، پھر منتخبہ امیدواروں کو اردو انگریزی اور حالات حاضرہ میں امتحان دینا پڑتا ہے، اُن میں زیادہ نمبرات پانے والے امیدوار کو سول سروس کے لیے منتخب کر لیتے ہیں۔

منتخب شدہ سیویلین کا ایک سال تک سول سروس ہوز میں رہنا ضروری ہے جہاں وہ ایک ایسے عہدہ دار کی نگرانی میں رہتے ہیں جس میں خاص طور پر نوجوانوں کو اچھی طرح سنبھالنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس ایک سالہ قیام میں اُن کو نظم و نسق کے عام اصولوں سے واقف کرایا جاتا ہے، گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی ہے اور اُن کی معمولی معمولی خامیوں کو دور کرنے کی سعی کی جاتی ہے، مہتمم سول سروس ہوز کو گورنمنٹ میں سیویلینوں کی ترقی کی رپورٹ پیش کرنی پڑتی ہے۔ اور ختم سال پر معاشیات، اصول قانون، تعزیرات ہند، قانون شہادت، قانون معاہدہ اور تین مقامی زبانوں یعنی تلنگی، مرہٹی اور کنٹری میں سے کسی ایک زبان میں امتحان دینا ہوتا ہے، جو سیویلین کامیابی کے نمبرات حاصل کرتے ہیں وہ کمیٹی کے روبرو پیش ہوتے ہیں جو اُن سے دریافت کرتی ہے کہ اُن کا رجحان کن محکمہ جات کی طرف ہے، مخلوط جائدادوں کو پُر کرنے کے لئے کمیٹی اس امر کا لحاظ رکھتی ہے کہ ایک امیدوار جو سررشتہ مال کے لیے موزوں ہو سررشتہ عدالت میں

نہ لیا جائے ان کے میلان طبع کے ساتھ ساتھ موزونیت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔

جب یہ مراحل طے ہو جاتے ہیں تو امیدوار کو سول سروس ہوز چھوڑنا پڑتا ہے اور مزید ایک سال کی ٹرننگ کے لئے برطانوی ہند بھیجا جاتا ہے جہاں وہ اپنے متعلقہ محکمہ جات میں امیدواران انڈین سول سروس کے مماثل ٹرننگ حاصل کرتا ہے، یہ چیز اُن کے لئے بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوتی ہے کیونکہ اُن کو اپنے آیندہ فرائض کے انجام دہی کے لئے بہترین طریقہ سے تیار کیا جاتا ہے، اس ٹرینگ کی اہمیت بہ نسبت دوسروں کے خود برٹش انڈیا سے واپس ہونے والے حیدرآبادی سیولینوں کی نظروں میں بہت زیادہ ہوتی ہے جو نہ صرف گزٹیڈ عہدہ داری کی ذمہ داریوں کا احساس کرنے کے قابل بنتے ہیں بلکہ اُن تخیلات کو اپنے میں جاذب کرلیتے ہیں جو اُن کو ملازمت کے سلسلے میں عملی طور پر انجام دینے پڑتے ہیں، یہ تمام تجربے اُن کو زندگی بھر کام آتے ہیں اور بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں، ٹرننگ کے ختم پر اُن کو برٹش انڈیا کا وہی محکمہ واری امتحان کامیاب کرنا ہوتا ہے جو اُن کی ہم حیثیت برطانوی سیولینوں کے لئے مقرر ہوتا ہے اور وہ اکثر اس امتحان میں اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرتے ہیں اس کے علاوہ وہ معاشرتی زندگی میں بھی بہت کامیاب ہوتے ہیں اور وہاں کی سوسائٹی پر بڑے اچھے نقوش چھوڑ آتے ہیں۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ نوجوان حیدرآبادیوں کے لئے حیدرآباد سول سروس سے زیادہ منفعت بخش ملازمت دستیاب نہیں ہوسکتی حیدرآباد میں تنخواہوں کا معیار برطانوی ہند سے کسی طرح کم نہیں ہر سیولین کو چاہئے وہ کسی محکمہ سے تعلق رکھتا ہو ابتدائی مشاہرہ تین سو روپیہ ملتا ہے جس کی ادائی حالی سکہ میں ہوتی ہے۔ جہاں تک اُن کی آئندہ ترقی کا تعلق ہے۔ انہیں وظیفہ یابی سے پہلے پندرہ سو روپیہ ماہانہ پر صوبہ دار، اور دو ہزار روپیہ مشاہرہ پر ہائی کورٹ کا جج اور معتمد وغیرہ ہونے کا بہترین موقع حاصل رہتا ہے، سروس کے سلسلے میں رخصت، وظیفہ، ترقی اور سفرخرچ وغیرہ سے جو باتیں متعلق ہیں وہ تمام حیدرآباد سول سروس ریگولیشن میں درج اور ہر طرح برطانوی ہند کے مماثل ہیں، مزید برآں ریاست میں ملازمت کے لئے ایک وسیع میدان موجود ہے، ریاست کا رقبہ اٹھائیس ہزار مربع میل آبادی تقریباً پونے دو کروڑ اور پورا ملک چودہ اضلاع پر منقسم ہے، کاروبار کی وسعت و دلچسپیاں اتنی ہیں کہ ہر شخص اپنے اپنے حوصلے کے مطابق مطمئن ہوکر کام کرسکتا ہے۔

برطانوی ہند اور حیدرآبادی سیولین کے کام کی نوعیت میں عملی حد تک بہت قریبی تعلق ہے البتہ اس وقت جبکہ سیولین کا تعلق محکمہ مالگذاری سے ہوتا ہے تو خاص طور پر زیادہ وقت مالگذاری ہی کے فرائض ادا کرنے میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہاں

عدالتی اختیارات مالگذاری سے علحدہ ہیں، حیدرآبادی سیولینوں کے نظم ونسق کا زاویہ نگاہ بالکل جدید ہے اور کام کے شوق کا یہ حال ہے کہ بعض وقت بجائے اس کو ابھارنے کے روک تھام کی ضرورت ہوتی ہے' سیولینوں کی سب سے بڑی خوبی حکمران سے وفاداری بھی ہے' برطانوی ہند سے آنے والے چاہے وہ کسی عہدہ پر آئیں یا ریاست کے مشیر کار کی حیثیت سے' بطور مہمان آئیں یا ایک سیاح کی طرح سب پر یہ اپنی قابلیت کارگذاری' اور کارکردگی کا ایک بہتر اثر ڈالتے ہیں' ان تاثرات کو جاننے والے ہمیشہ اپنے دلوں میں تازہ رکھتے ہیں۔ فرائض کی ادائیگی میں چاہے وہ دیہی تنظیم ہو یا آبرسانی کے نئے رقبوں میں ترقی مرکزی بازاروں کی بنیاد ہو یا گاؤں کے رسل ورسائل میں سہولت بہم پہنچانے کا کام' فصلوں کی تحقیق ہو یا پنچ اقوام کی ترقی کا مسئلہ' انتہائی خلوص اور محنت کا ثبوت دیتے ہیں' ۔جب وہ تعلقدار یا صاحب ضلع ہوتے ہیں تو ان کی ذمہ داریوں میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے' وہ ترقیاں جو ریاست کے کئی شہروں میں چند سال پیشتر سے برقی قوت' انتظام آبرسانی' ڈرینج اور جدید ترین حفظان صحت کے اصولوں کے شکل میں نمایاں ہیں' یہ ترقیاں محکمہ فینانس اور تعمیرات کی بروقت امداد کے بغیر ممکن نہ تھیں تاہم ان ترقیات میں تعلقداروں اور صوبہ داروں کا بھی نمایاں حصہ ہے' تقریباً ہر محکمہ کے سیولینوں میں یہی روح کار فرما ہے ۔ وفاق کی آمد نے ان عہدہ داروں کی کارگذاری کے لئے ایک نیا میدان پیش کیا ہے اب یہ حکومت سرکار عالی پر منحصر ہے کہ آئندہ سیولینوں کے مدبرانہ انتخاب میں ذاتی لیاقت پر ترقی کا انحصار کرکے سول سروس کے معیار کو بلند سے بلند تر کردے۔

مترجمہ مرزا رزاق بیگ (عثمانیہ)

The prayer, GOD SAVE THE NIZAM! has a historical, cultural and sentimental significance, too deep and serious to be ignored. The Nizam is the most precious and tangible remnant of the glory and splendour that was once a Mogul Empire. Can any Indian true to his salt and true to his past, refuse to join in this prayer?

From a purely religious point of view, the value of this prayer is incomparable. For orientals, kingship is something Divine. Muslims revere their king as the 'Shadow of God', and the Hindus worship him as an 'Avatar', and consider him the incarnation of Deity. And when the ruler happens to be as benevolent as the Asafjahi rulers have generally been and Nawab Mir Osman Ali Khan outstandingly is, then the prayer assumes the significance of cordial invocation.

For the Osmanians, particularly, there is magic in the words, GOD SAVE THE NIZAM! because it was Mir Osman Ali Khan who, with one bold stroke of statesmanship, brought the Osmania University into being, and thus solved the educational problem of the State and a national problem of India. Let all of us, Osmanians then, on this Festive Occasion of the Silver Jubilee of our most benevolent Monarch, sing in a chorus:

God Save The Nizam!

S. Md. Ahsan, B.A., LL.B.,
Editor

God Save The Nizam!

Blessed be those yellow spots on the map of India that have survived political and regional readjustment and preserved within their territories the inherent and inalienable rights of a people to govern and manage their own affairs. It may be that some of these yellow spots do not represent the very best of what Indian rule could be; it may be that the inhabitants of some of these areas are not proud of having one of their own kinsmen at the helm of affairs; but the very fact that the essentially Indian character of the rule has been maintained intact is a redeeming feature sufficient to compensate for all the sins of ommission and commission, real or imaginary, that may be existing there. Be it noted that the Indian States, while they are Indian through and through, do not challenge the existence of the British element as a benevolent factor. Rather do they co-operate with it, and are friendly towards it. Thus viewed, the demand for full-fledged Dominion Status really amounts to painting the map of India yellow, with this proviso, that India should maintain her friendly attitude towards Britain, once her trustee and now her ally.

Thus the prayer, GOD SAVE THE NIZAM! embodies the Will and the Wish of the Indian Nation, irrespective of class or creed, because it amounts to the essential element of Swaraj preserved and maintained in an area and over a population as large as those of Hyderabad.

country all the more. We cannot easily forget the effects of the depression. Our kind and benevolent government as against other countries, realized the seriousness of the situation and helped the people in many ways at the time of this crisis. Fortunately the societies gradually accumulated their own capital and reserves. The Dominion Bank adopted a conservative policy, and by the end of the year its reserves and other funds stood just under four lakhs. Organisers were appointed to organise new societies. The latest report of the Registrar shows that the movement is again progressing and if the people of our country show interest in this, then there will be a great future for Hyderabad. The department is taking a keen interest in rural uplift also. Some villages are selected for this purpose and the work is very satisfactory. The only thing that we require is help from our country men. They should take interest, if not for their own good, at least for the good of their brethern. The Government is trying its best but it has not shown the desired results. The present Registrar, Mr. Syed Fazlullah, H. C. S., is showing lively interest in this moment. The thing which he should pay more attention to is the marketing problem, and the granting of loans as soon as possible so that our peasants can obtain help in time of dire necessity. Nowadays if they apply for loans they have to wait for a long time and the consequence is that they begin to mistrust the movement, for they can get loans from local sahukars very easily. The education of the peasants and their children is also very necessary, so that they may adjust themselves to the modern world and use modern improved methods of cultivation. In the end we pray God for the happy prosperous and long life of our kind benevolent king whose Silver Jubilee is being celebrated this year, and in whose reign this movement started and is progressing so well.

M. A. Jabbar B. A.

began to think that the Government wanted to deprive them of their money lending business. Thus on the whole at the very outset it was evident that there was a great future for co-operation in Hyderabad.

Owing to the lamentable death of the Registrar the work of the movement was very much hindered and the societies could not make much progress. At first our Government could not get a proper man to fill the vacancy, but after a lapse of six months Mr. Khan Abdul Majeed Khan of the Punjab was appointed as Registrar. The result was that during the next year the number of societies and of members and the capital increased. Soon after coming over here the Registrar showed a great interest in the movement and established all the societies on the basis of the Luzzatic system with the share capital payable by instalments. Three inspectors were appointed for three circles of Telangana, Marhatwadi and Kannadi, and their headquarters were at Hyderabad. In the same year assistant registrars were also appointed. The year 1326, was a very good one for the movement. In this year made great progress in spite of war and the plague which was prevalent at that time. The societies increased from 295 to 616 and their membership also increased from 6255 to 15186 ; the working capital amounted to 28.58 lakhs as against 12 lakhs in the previous year. The number of central banks increased from two to seven. The following year was also a year of great distress and anxiety for influenza broke out and lasted for two months. Not only this, but the rains also failed and the scarcity of rain brought famine, and the abnormal rates of exchange between O.S. and B.G. rupees made money scarcer and dearer. The influenza took away hundreds of thousands of human lives, and the business of the societies seemed to be going down. In spite of this the movement made marked progress. This shows that the agricultural population received this movement with open hands and began to think that the Govern-

ment was their sole benefactor. The Government helped them a great deal and supplied money as an experiment, and allotted one lakh of rupees for sinking and repairing of wells, which proved very advantageous. By this time there were seventeen hundred societies with a working capital of over a crore.

The year 1334 was a year of great change in the movement, for the central union was registered on the 26th day of Amerdad. This was quite a new venture for Hyderabad. The main object of the Union was propaganda and for this purpose it began to publish a quarterly magazine. The co-operative training class is also a very important part of its work. The Union arranged to send one propagandist to the villages with magic lanterns and co-operative slides. It also began to conduct classes for Panchayats of village societies. There are two committees of the Union, one for propaganda and the other is an executive committee. It managed to appoint a supervisory staff who were paid from fees collected by societies and central banks. Now this Union is working in such a satisfactory manner that we can hope that in future there will not be much necessity for the State to meddle in its affairs.

The movement was progressing smoothly, but was much hindered owing to the great world depression, and the movement seemed to be going down hill. This world crisis, like an irresistible landslide in its downward movement, brought prices to the lowest possible level at the end of 1932. Raw materials and food stuffs, especially of the former, were curtailed, stocks continued to accumulate and market-prices were hardly sufficient to cover the cost of production. The whole world became poorer. This unprecedental depression of the last so many years affected our country population along with others. But the economic condition of our rayats being very poor, it affected our

began to think that the Government wanted to deprive them of their money lending business. Thus on the whole at the very outset it was evident that there was a great future for co-operation in Hyderabad.

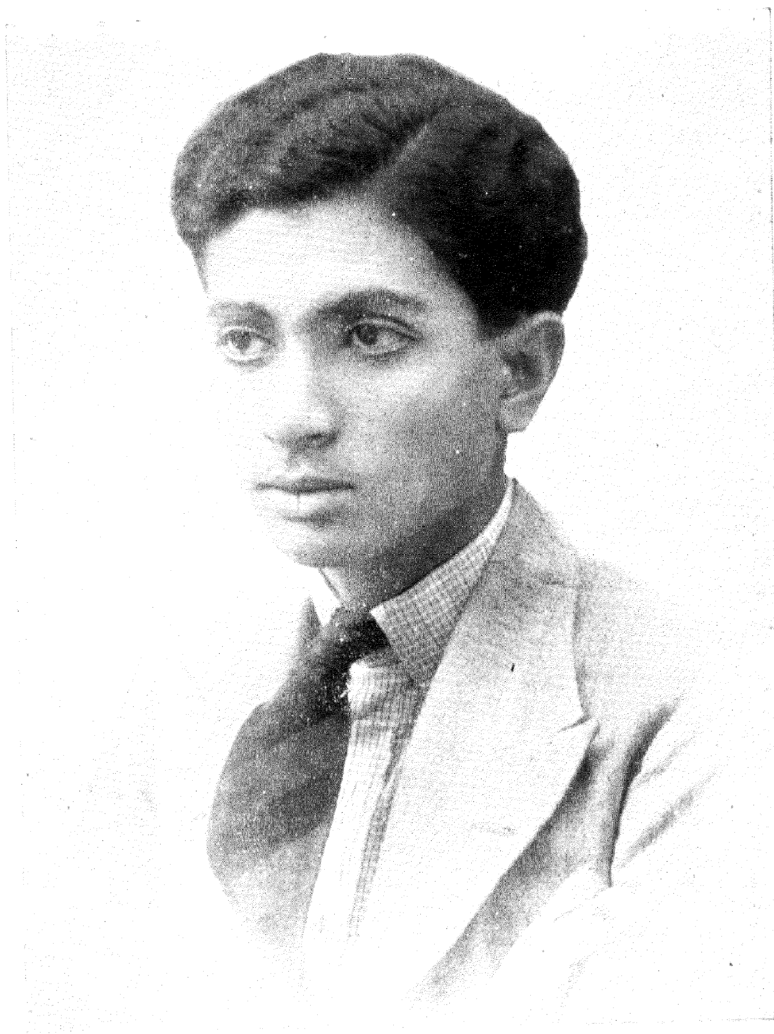
Owing to the lamentable death of the Registrar the work of the movement was very much hindered and the societies could not make much progress. At first our Government could not get a proper man to fill the vacancy, but after a lapse of six months Mr. Khan Abdul Majeed Khan of the Punjab was appointed as Registrar. The result was that during the next year the number of societies and of members and the capital increased. Soon after coming over here the Registrar showed a great interest in the movement and established all the societies on the basis of the Luzzatic system with the share capital payable by instalments. Three inspectors were appointed for three circles of Telangana, Marhatwadi and Kannadi, and their headquarters were at Hyderabad. In the same year assistant registrars were also appointed. The year 1326, was a very good one for the movement. In this year made great progress in spite of war and the plague which was prevalent at that time. The societies increased from 295 to 616 and their membership also increased from 6255 to 15186 ; the working capital amounted to 28.58 lakhs as against 12 lakhs in the previous year. The number of central banks increased from two to seven. The following year was also a year of great distress and anxiety for influenza broke out and lasted for two months. Not only this, but the rains also failed and the scarcity of rain brought famine, and the abnormal rates of exchange between O.S. and B.G. rupees made money scarcer and dearer. The influenza took away hundreds of thousands of human lives, and the business of the societies seemed to be going down. In spite of this the movement made marked progress. This shows that the agricultural population received this movement with open hands and began to think that the Govern-

The Hyderabad Co-operative Credit Societies' Act No. 2, received the assent of the Government on the 27th day of Mehar 1323 F. Its main object was: "to facilitate the formation of co-operative credit societies for the promotion of thrift and self-help among agriculturists, artisans and persons of limited means." The Government helped a great deal those who were desirous of starting societies in the Dominions. Mr. John Kenny, Director of Agriculture, was entrusted with the work of preliminary enquiries. The Government had to apply the British India Act to Hyderabad. Soon a few experimental rural societies were started, and the central society was also planned. When the Government saw that this movement was likely to be a success in Hyderabad, it decided to encourage it and at the same time appointed a whole time Registrar. The Government of Madras helped a great deal in this respect and lent the services of Rao Sahib K. V. Vijaya Raghavachariar Averghal, M. A. He took charge on the 15th of Bahman 1324 F. He exerted himself very much and was able to constitute twenty four societies on the Raffeisan model. These societies had no share capital, except in the Central Bank, and they all accepted the principal of unlimited liability. At the end of the first year the total number of members was 608. At first the Registrar himself audited, but for an inspection staff the central bank had to set apart one eighth of its net profit and the rural societies had to set apart 5 per cent for the same purpose. The Registrar in his first report said "The members of the Managing Committees, though illiterate and ignorant, seem to be honest, and the Panchayats of some villages have begun to make careful enquiries as to the character of applicants and they have some times also rejected applications from persons in whom they found no confidence." This clearly shows that the agricultural population received this movement favourably, but the local sahukars were much alarmed by this and

indebtedness, it has not produced the desired result. A government may help its people by its laws or it may create facilities; it may control the finances, but it is not required that the State control should uphold those who act like mendicants or encourage mendicancy. We must not depend entirely upon the support of the State which involves us in the risk of being in perpetual beggary and bondage and at the same time losing the virtue of self-reliance, the very life of co-operation. The blame does not rest exclusively on the uneducated masses, but it also rests up on the educated classes who exist by the toil of the agriculturists, and for whom they do nothing in return. It must be noted that the German Government did not help the Germans in making the co-operative movement a success. All the Germans do help, and essentially it is the people's movement. In Europe the co-operative movement is recognized as an important factor in nation-building. Every educated man knows that the Indians are not contributing to the welfare of our agriculturists in spite of knowing that they are living a hand to mouth life. All these things apply also to Hyderabad, and, as in India, the co-operative movement here too has to play an important part. This movement in Hyderabad also owes its origin to the State, not as in other countries where the people realizing their economic weakness, associated themselves into organizations and adopted the principles of co-operation for their economic uplift. Here the people, illiterate, ignorant and steeped in debt, were unable to evolve measures for their own betterment. At first our Government showed little interest in this movement, but our kind king and benefactor, seeing that of the many movements in Hyderabad, for the advancement of the people in matters, political, economic, religious and social, there can be no doubt that the co-operative movement occupies the most important place, has at last ordered that the co-operative movement should also be established in Hyderabad.

the nature of the soil and above all by climate tend to the production of a certain class of agriculture under certain conditions. Cultivation at its best is distinctly good, but in the greater part of the country there is plenty of room for improvement. Agriculture suffers through lack of organisation and equipment. Two economic factors tend to keep down the standard of cultivation. Holdings are not only small but fragmentary and the Indian laws of inheritance both perpetuate and intensify this evil. Attempts are being made to amend matters, but progress is slow. The chief trouble of a peasant is the lack of capital. With greater capital he would be able to spend more on manures ; he would purchase better cattle; and he would be able to supply his land with the required amount of water. He also lacks knowledge of improved methods of cultivation. To remedy this defect, agricultural education is essential, but agricultural education must be accompanied by general education, so that the peasants may feel their rights and responsibilities. The practice of borrowing money is almost universal. The money-lenders supply them with money at high rates of interest. Co-operation is the only thing that can remedy these defects and this is the only movement that can improve the condition of our peasants and can place our country in the rank of the civilized countries.

"Co-operation," says Mr. Hubert Calvert "is a form of organization wherein persons voluntarily associate together as human beings on a basis of equality for the promotion of the economic interests of themselves." Mr. L. P. Jacks has called co-operation, "the most difficult and beautiful art in the world." In its broadest sense, cooperation may be defined simply as voluntary association in a joint undertaking for mutual benefit. Co-operation is essential for agricultural countries like India. But in spite of the strenuous efforts of the Government, who took the initiative in attempting a practical solution for the removal of rural



Mirza Zafrul Hasan, B. A., (Osmania) President, Student's Union.

The Co-operative Movement in Hyderabad

A Chinese philosopher has been quoted as saying : "The well being of a people is like a tree ; agriculture is its root, manufacture and commerce are its branches and its life ; if the root is injured the leaves fall, the branches break away, and the tree dies". This applies pre-eminently to India where over 70% of the people live by agriculture and this majority of the people are in a very deplorable condition. If we do not try to support and strengthen their condition, the Indian nation is sure to die an unnatural death. Many nations are progressing but India is at a stand still. The eyes of the world are upon India to-day. The problems of her position in the British Empire and of internal politics press hard for solution. Even more dangerous to the country's well-being, however, is the existing weakness in the economic structure of India which must hamper and obstruct her development whatever her political status.

The total population of India is 318.94 millions. But the distribution of the people is not even throughout the country. The density of population depends on several factors, the most important among them being rain-fall, climate, soil, the configuration of the surface, and the state of civilization. As a rule the population is densest in those parts in which there is abundant supply of water either natural or artificial, where the primary requirements of human life are satisfied with the greatest ease. As crops depend on the existence of plant-food and moisture in the soil, so the character of the agriculture of a country depends largely on its soil and climate. It is true that the character of the people and other considerations have their influence which is not inconsiderable, but the limitations imposed by

be the most useful and beneficial to you. Do not in the least be discouraged by the keenness of the struggle ahead of you. You are going out into the world at large, fully equipped with intellectual attainments. Your future success will depend entirely on your own endeavour, integrity, and character. Your *Alma Mater* expects you to remain loyal to her, and you should continue to maintain the highest traditions of this great Institution, and to prove fully worthy of the degrees that have been conferred upon you as a well-deserved recognition of your merit, and prove worthy citizens of the Hyderabad Dominions, so that your University may be proud of you.

May the Osmania University long enjoy the beneficent patronage of its Founder!

resorting to adaptation or translation. Translation in the beginning has its rightful value, but is not to be regarded as an end in itself. You, the graduates of this University, should consider it a part of your imperative duty, no matter where you are employed, to enrich the Urdu language, through which you have acquired the highest education. In this way alone you can be of real service to the literature of your country.

No doubt as you pass out from this University, some of you may have to face a world of keen competition and a period of long waiting before success is achieved; but do not despair of the future. Be firm and resolute, full of hope and inspired with ambition, and above all have confidence in yourselves, and faith in your capacity. Do not forget that there are millions of people in this country in all grades of society, ranging from the high to the low, and everyone cannot expect equal prosperity. Happiness lies in contentment with one's lot, enlivened by an unsubdued ambition to improve one's conditions. Comfort lies in living within one's means, howsoever meagre they may be. For real success in life economy is a necessary condition, which will always be found indispensable. While in the University, your governing idea should be to acquire knowledge with the least possible expense, as high living and extravagant habits are not necessary accompaniments of a devoted scholar; and after you have completed your academic career, thrift and frugality will stand you in good stead.

You young men are in a sense the custodians of the destiny of India, for the youths of to-day will be the leaders of to-morrow and will be called upon to guide their country. It is you who will make or mar its future. The Osmania University has provided you with the best education and training that could be imparted anywhere in India, and has enabled you to acquire knowledge which you considered to

personal inconvenience. The students therefore owe a duty, not only to those on whom they depend but also to themselves, to devote the short time at their disposal to the pursuit of knowledge. At this most impressionable period of their life, they should cultivate the habit of assimilating sound and sober ideas and cherishing high ideals. If they turn their minds away from their proper pursuits, they will be unfair to those who maintain them and will be unfair to their own selves. As soon as they pass out of the University portals, they will have to enter into a world full of competition and hard struggle. It behoves them to be as well-equipped as they can possibly be within the short interval of time, so that they may be able to withstand the strain and stress of life.

I should now like to address a few words to the new graduates, who have come out successful at the last University examination. I offer you my heartiest congratulations, and wish you happy and prosperous careers in life. My sincere and earnest appeal to you is that you should endeavour to acquire a right judgment to view the various problems facing your country with wisdom and foresight. If you take any rash and hasty step, it may spell disaster to your career, perhaps to an extent not quite apprehended by you. Continue to fill up your minds with fresh knowledge, even though you have completed your University education, for there will always remain a great deal more still to be learnt. Never complain that you have no literary work to do. You have studied your subjects with care and thoroughness, and have been taught to think and write in Urdu. You are well-equipped for writing original books on your special subjects, as distinct from mere translation work. Remember that no national literature can ever grow to its full stature unless its literary men take to the habit of writing original, books on various topics instead of

if brought into living contact with practical problems, and industries will benefit by the improvements introduced in them by the University experts.

It is an undoubted fact that there is no break-neck competition between various communities in the Hyderabad State as there is in British India. The great scramble for a due share in the services, the bitter disappointment at failures, the grievances of inadequate representation in the semi-autonomous departments, in the universities, colleges and schools, and other aided institutions, create a peculiar bitterness in the Indian provinces, which is fortunately not present here. It is a misfortune that the various communities of India which have lived together as neighbours under the same sky for generations should have such marked differences. But the divergence seems to be accentuated because we live in a caste and community ridden country, where from our very childhood the outlook is narrow and limited. In reality the struggle is more economic than political or religious, and it lies with the Indian universities to ameliorate these conditions and bridge the gulf as far as possible. University centres, where youths of all communities are thrown together in a common atmosphere, should inculcate a spirit of mutual tolerance and friendly cooperation and create a common national feeling. It is the duty of the educated classes to change the mentality of the masses, who are usually carried away by immediate disappointments and disadvantages, and teach them the benefits of peaceful living and mutual goodwill, and create a new bond of union.

I may remind the students who are still in the University that the duration of their academic career is short as compared to the life of an individual. There is therefore all the more urgent need for turning that period to the greatest possible utility. Parents and guardians of most of the students maintain them at great sacrifice and

this type, the problem of unemployment will have an easy solution and prevent the unemployment question from becoming acute in the future. With the increase in the output of the schools there must be provision for absorbing the number of students into agricultural, industrial and commercial activities. To bring this about, a transformation of literary schools into semi-vocational institutions, where semi-industrial education is imparted, is the only remedy.

Advanced theoretical knowledge is meant for scholars who are likely to prosecute their research work and make contributions for the advancement of the arts and the sciences. The large majority should be encouraged to study practical subjects like applied chemistry, engineering, agriculture and commerce. With the growth of new factories, the electrification of towns, the expansion of water-works, the enlargement of the professions of engineering and medicine and the growth of agricultural pursuits and the development of trade and commerce, all such occupations would provide employment for an increasing number of educated young men and women.

Education should be looked at not only from its cultural aspect, but from an economic point of view as well; and the educational institutions should not content themselves with imparting merely cultural education, but should regard it as a part of their duty to befit the students for some vocation or other, and even help them in settling down in life after they have passed out.

Unfortunately in British India Universities and industrial institutions do not go hand in hand with one another. Each set lives its own independant existence and seems to ignore the other, whereas the Universities ought to be in the closest touch with the industries of the country, and the industries ought to get the utmost possible help from the Universities. The University atmosphere will be invigorated

with the technique of vocational occupations within a short time. It is recognised that mere literary education has for most students ceased to be of practical utility. Hyderabad now possesses industrial schools at various centres under the control of the Commerce and Industries Department of the Education Department. There is also a Central Technical Institute, in which practical training in the different sections of the Workshop and Industries Department is given, and students are taught how to erect machines and apparatus in mechanical and electrical engineering laboratories. Then there are also commercial classes attached to collegiate schools. The University education includes Teaching, Medicine, and Engineering. The Department of Agriculture is doing considerable useful work in all its sections—Botany, Chemistry, Entomology and Animal Husbandry, with the object of putting scientific theories into actual practice.

For sons of agriculturists and workmen even a rudimentary knowledge of agriculture or arts and crafts would prove to be far more beneficial than a mere perfunctory literary education. Handicrafts and arts may well be made compulsory in primary schools, and young childern trained in handwork while receiving instruction in the three R's. Early knowledge of some village industries would prevent any feeling of aversion from such pursuits, and raise the dignity of labour in the young impressionable minds. When side by side with the literary education imparted, the secondary schools give such vocational training as well, the students, if they cannot gain admission into the services, will have at least a chance to fall back upon their training for earning a living for themselves. The need for really qualified and skilled craftsmen and artisans is great, and these humble occupations can still provide means of maintenance for a fairly large number of young men who would, when equipped with literary education, be able to improve their ancestral callings. With a widespread network of vocational schools of

unemployment assumes an acute form. As a last resort, they fall back on one or the other of the independent professions, particularly Law, which becomes more and more overcrowded. The brilliant success of a few men at the top is a misleading lure, inducing an unjustifiable optimism for a similar attainment. But the few who have risen to the top had to fight their way up, out of thousands who have lagged behind, and the proportion of these who are successful at the Bar is lamentably low as compared with those who have failed. A sound system of University education must foresee such an inevitable result. University education should be broadbased on a new system of secondary education which, in addition to giving students a literary and cultural education, should also qualify them for particular callings and professions, so that instead of unnecessarily prosecuting their studies further they may early direct their energies to commercial and industrial pursuits with a better chance of earning a decent livelihood.

There need not be any demarcation between ordinary secondary schools on the one hand and technical schools on the other, as both cultural and technical education can with a proper organisation of the secondary education system, be more usefully combined together. In England and France they have a wide-spread system of polytechniques, preparing students for various industries and trades and giving them training as skilled workmen. Students receive intellectual training and are simultaneously prepared for occupational life, which helps to secure suitable employment for them when they pass out of the schools.

The advantage which Hyderabad possesses in having the Urdu language as the medium of instruction, can be utilised in saving the time of students from devoting too much attention to the study of the English language, and, therefore, giving them a larger facility to get acquainted

indiscriminate admissions. There ought to be no obstacle whatsoever in the way of the deserving, and no undue facility to the undeserving, for prosecuting their studies up to the University standard. The system should be so modelled that only talented students, who are likely to benefit most from University education, should continue their studies up to the highest classes, while those not so gifted should leave off earlier to follow other pursuits.

With the growth of primary and secondary education it is but inevitable that the University education must in its turn expand as well. No matter what strictness be introduced, restrictions placed on the admission of students or a check imposed as to the class which they must secure before entering the University, the number must continually increase. Unfortunately the ambition of most of the students seeking higher education is to enter the State services. Everything is sacrificed for the fulfilment of that aim. Up to a certain extent the services can absorb the output of the University, but there is a limit to the employment of University graduates in the State departments. The natural growth of the departments can never keep pace with the supply of educated men; and the ordinary output of matriculates and graduates must eventually outrun the demand for them. The position in British India has already reached a critical stage, and it is feared that it may become more chronic in the future. The overgrowth is swelling the ranks of the educated unemployed and causes dissatisfaction with the existing order of things, and thus engenders discontent. The universities concentrate exclusively on imparting cultural education which does not benefit their *alumni* for anything except the Government services and the teaching and the legal professions. After receiving University education graduates find it difficult to go back to their ancestral occupations, and as the majority cannot succeed in obtaining appointments, the problem of

wanted is a re-orientation of the academic policy. Every university has not the good fortune of the Osmania University in getting a plentiful supply of funds due to the generosity of its benevolent Patron. It is, therefore, useless to expect that in the face of the growing need of the other public departments, State aid will be more and more generous. It is still more futile to hope that with the general apathy of the Indian people and the indifference of the wealthier classes towards University education and their utter lack of appreciation of the need of co-operation between University Research departments and great industrial concerns, any hearty response to an appeal for financial help would be forthcoming. With the paucity of funds, the only effective method for national institutions to meet the crisis seems to be to grade down the salaries of the teaching staff and grade up the fees charged from scholars, so as to make the two commensurable with one another, as is the case of British universities, which have the experience of centuries behind them.

One way of bringing about such a result would be to rearrange the scale of University fees charged. Every student who passes an entrance examination in the first division should be admitted into the higher class free of University fees altogether, and also helped with scholarships. The existing fees may be retained for students passing in the second division; and to increase the University revenues, about double the amount of the fees may be fixed for those who come with a poor third. Such a graduated scale of fees, without closing the door to less qualified students, would put some restriction on them, and at the same time offer an additional encouragement to the better class of students. There will, on the one hand, be a saving of money for development of the departments and the improvement of the ill-equipped laboratories and libraries, and on the other hand it will increase the revenue and put an indirect check on

by the contribution it makes to the advancement of human knowledge.

Universities in British India suffer from one serious drawback. They were started on the model of the London University. In order to import scholars of high academic qualifications it was considered necessary in the past to prescribe grades of salaries markedly superior even to those prevailing in Great Britain. But the poverty of the people made it necessary that the fees charged from University students should be kept down. There has accordingly arisen an incongruous disproportion between the scale of teachers' salaries, which are fairly high, and the students' fees, which are comparatively low. The salaried establishments absorb the bulk of the University revenues, leaving little for the development of the departments themselves, which remain half-starved. The low fees reduce the permanent incomes of the universities, making them dependent for their poor equipment on State aid or meagre private donations. The universities are vying with one another in producing graduates, regardless of efficiency.

There are two diametrically opposed opinions that are frequently expressed. One is that having regard to the enormous population of India only about a score of universities, with less than 1¼ lakhs of University students, are still grossly inadequate, and so expansion must go ahead. The other is that there is already a surfeit of universities and more graduates are turned out than there is work for them, and the only course left for relieving unemployment among the educated classes is to restrict the number of University students by placing some restriction on admissions. But the immediate need of the hour is neither any rapid multiplication of universities, coupled with a sudden increase in the number of scholars attending such institutions, nor any drastic restriction on admissions. What is

towards a fresh discovery of the vast knowledge lying buried in the records of the past and an exploration of a vaster store hidden in the womb of the future should be the principal feature of the modern University life. The great arts and sciences that were developed by our ancestors must be recovered from the oblivion into which they have sunk, and an increased endeavour has to be made to enlarge the stock of human knowledge by fresh acquisitions. It should be the aim of a university to interpret the philosophy of the past to the modern mind, and also enrich the store of learning by new discoveries and inventions. A university must be a fountain-head of knowledge, from which the thirst for truth can be quenched, and a source from which the light of learning must radiate. It has to be an institution both for the acquisition of knowledge and for its diffusion and distribution. And it ought to fulfil the twofold purpose of being a training-ground for the development of intellect and reason, and also a cultural institution for the perfection of more refined feelings. The object of University education is not only to make its *alumni* intelligent and well-informed, but also to produce capable young men and women qualified to take their due share in the activities of worldly life. Throughout the world universities have stimulated the latent talents of the younger generations, and helped to shape their character. A university is not a factory for manufacturing graduates, or a big machine for producing diplomas to serve as passports to the various services. The utility of a university is not to be measured by the quantitative annual output, the number of graduates it turns out, but by the cultural education it can impart, the sense of discipline it can infuse and the spirit of service it can inculcate. The reputation of a university depends on the devotion of its teachers and scholars to study, literary achievements and scientific researches. The worth of a university will be judged not by the number of departments it has opened, but

not exactly the same as those used in printing. And they have unnecessarily different forms for capital letters, thus almost doubling the number for the compositor. The Urdu *Shikast* is in itself different from the Urdu *Nastaliq*, and it is therefore quite feasible, if one were compelled, by necessity, to adopt different letters for the purpose of printing while maintaining the existing semi-shorthand forms for ordinary writing with hand.

The Arabic characters contain in themselves the inherent capability of being used as separate letters like the Roman characters. Indeed in many towns in the United Provinces, forms of writing commonly known as *Istilahi* are already in vogue, in which correspondence is freely carried on by means of isolated and independent letters. One such simplified form of alphabet is here suggested:

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ

ف ق ک گ ل م ن و ہ ء ي

Only 36 signs suffice to incorporate all the single letters, 29 for Arabic, 4 more for Persian and 3 more for Nagari, compound letters being excluded. These include all the English letters. If the Urdu script were driven to its last resources and were compelled, from the exigencies of the situation, to adopt the non-Arabic system of forming words by means of separate letters, an *Istilahi* system similar to the one indicated above would serve the purpose. But really no such immediate need has yet arisen; nor is there any fear of any such need arising in the near future as the existing forms adequately meet the requirements.

With the decay of the old system of free religious education and a gradual introduction of Western forms of educational institution, universities are occupying a position of increasing importance in our national life. An effort

language and the greater convenience of a common script, there may perhaps be some international agreement under the auspices of the League of Nations for adopting a new system of phonetic characters, based exclusively on a scientific analysis of sounds and their accurate and exact representation, somewhat on the lines of the shorthand system. But any such contingency is remote and not within the range of possibility in the near future. Meanwhile the various scripts can develop separately and independently on individualistic lines.

Human ingenuity always overcomes all difficulties. The Arabic letters, which on account of their very structure easily lend themselves to any required adaptability, were found suitable for printing, and were universally adopted as types; so much so that even Urdu typewriting machines have been invented and are now freely in use. The apparent difficulty of having so many different parts has been minimised, as there is no duplication on account of capital letters as in English, nor are there any *matras* as in Devanagari.

Lately, even with greater ingenuity, types have been invented for Persian letters, and printing in *Nastaliq* is becoming common. His Exalted Highness the Nizam has given his patronage to the adoption of the *Nastaliq* forms, and Hyderabad can proudly boast of having taken the distinctive lead in producing books neatly printed in beautiful *Nastaliq*, which have won the admiration of the Urdu-loving public. As such printing becomes more and more popular, the initial handicap that was experienced will disappear, and one may confidently look forward to the time when books will be printed in *Nastaliq* with the same ease and facility as in English types.

With many foreign languages, particularly German, the letters used for printing are quite different from those used in writing. Even the English letters as used in writing are

of a unification of the Indian languages. But it is not beyond the range of possibility that at some distant future there may be a unanimity in adopting the Roman characters as the common script for all the Indian vernaculars. Were it possible to bring about such a compromise, all difficulties in the way of a single script for the whole of India would be completely removed and even a common language could develop in a few generations, by the ordinary evolutionary process. If only all the newspapers, journals, magazines and books were printed in Latin characters, the necessary result would be to make the various provincial languages to conform ultimately to a common standard and make literature printed in one province accessible to the reading public of the others, though even such a process would take many decades before it could yield any appreciable result. But the advance towards a common language would be certain, and the process of unifying the diverse languages would be systematic and sure. The adoption of Latin characters as a compromise solution would simultaneously remove much bitterness and misunderstanding. But there can be no hope whatsoever of any such course being adopted in the near future, as political considerations stand in the way and are an insuperable obstacle to any such concerted action. Nor can there ever be unanimity on such a drastic measure. In the present rage of heated controversies when unnecessary linguistic rivalry is being preached, even a suggestion that books in vernaculars be printed in Roman characters would be repugnant to most people, and is sure to be severely condemned and vehemently opposed on religious or sentimental grounds. The idea is at present certainly permature; nor has any pressing need for it yet actually arisen. But the need of a common script for the whole of India may hereafter be felt more keenly, particularly for inter-provincial and official correspondence. Indeed, when the whole world comes to realise better the needs of mankind for a common

picturesque, and involved a saving of space and time as well. The Arabs were very proud of their new system, which was claimed to be a distinct improvement on the systems prevailing outside Arabia. For centuries this new method remained supreme and dominated calligraphy throughout Northern Africa, Western and Central Asia, and a great part of India. Its popularity remained unshaken so long as litho-printing was in vogue.

It is an irony of fate that the very feature, which at one time was considered to be a distinct improvement, should now come to be regarded as a handicap. With the advent of types the Arabic and Persian systems received a rude shock, as separate letters give a greater facility to compositors in having fewer letters to pick out from, and greater ease in setting them up. The shortening of letters necessitates the use of several distinct forms for each letter, according to the position, *i.e.*, beginning, middle or end of a word, which it has to occupy. The increased variety is undoubtedly a serious embarrassment to the compositor. Nevertheless it is a common error to suppose that the compositor's work in Urdu types is particularly tedious. In fact in most places the rate charged for composing one page in Urdu, which contains much more condensed matter, is only slightly more than that for English, and to the same extent less than that for Devanagari. So long however as calligraphy and litho-printing remained popular, no inconvenience was felt, and expert scribes who could write a beautiful hand abounded. But with type-printing, the position has been completely altered. It is now superseding the litho-printing because of the economy of cost, expedition of work and its suitability for larger outturn.

There is unfortunately a considerable controversy in India on account of the different scripts that are in use. This bewildering variety is the greatest impediment in the way

have always been written from right to left, and have never undergone a change in this respect. On the other hand, the Sanskrit language and its descendants have been written from left to right; but even Sanskrit when written in Kharoshti script used to be written from right to left. In early times the Greeks followed the Semitic method, and Greek was written from right to left; then a curious method was adopted of writing alternately from right to left and then from left to right, like the ploughing of a field by oxen, so that there might be continuity without a break. This obviously caused inconvenience in inverting the method from line to line, and had later to be changed to a uniform method of writing from left to right.

The most primitive idea that occurred to the human mind of reducing spoken words into writing was to indicate different words by means of different pictures; later it was simplified by having different symbols for different sounds. The Babylonians, the Egyptians and the Chinese used single isolated symbols standing for each sound. The easiest method was to have a separate symbol for each letter and to form a word by simply grouping the required letters into one whole. Letters, though written separately, were put close to one another to indicate one word. This was the ancient method adopted by the Hindus, the Greeks and the Romans, and indeed by other peoples as well, including the Hebrews. The Arabic system was in its time supposed to be an advance on the primitive method as it introduced a new scientific principle of combination. Letters when combining into a word were shortened in their structure so as to present a compact whole, each word having a new formation and a characteristic shape, easy to get fixed in the mind like a picture. A word could be spotted at once without the tediousness of deciphering every letter. The shortening of the letters helped to make the writing more artistic and

likely to act and react upon our own languages, and it may well be expected that there will be a mutual borrowing and lending of words and phrases. With better relations and intimate associations, the languages of countries in nearer contiguity are likely to be drawn closer to each other, and the future common language of India will be deeply affected by the influence of such countries as remain in close contact with her.

As distinct from the growth of a language, the adoption of a script has a certain arbitrariness in it, and is not altogether independent of political, religious, or, at any rate, sentimental considerations. A particular script can be invented afresh, borrowed from another country, modified as one likes, and changed or abandoned at will. Gradual changes are matters of history all over the world; but a quick transformation, as the result of a sudden change of policy, has manifested itself only in Turkey. Pressed with the need of closer contact with European countries, Turkey courageously decided to adopt the Roman characters as the recognised form of script for the Turkish language. A homogeneous political people can, by a stroke of the pen, substitute a new script for official correspondence and work.

The very variety of forms and methods that have prevailed in the various countries of the world, demonstrate the artificialness of writing, which is but a device of man for putting his thoughts into a permanent and enduring form, and on durable record. Almost every possible method of writing has been adopted at different times. The Mexican picture-writing was written from bottom to top; and to complete it one had to read and write upwards. As a marked contrast to this system, the Chinese characters are arranged in vertical columns, but they read from top to bottom. Letters are written one below the other. The Hebrew and Arabic languages, with all their branches,

Modern Urdu prose is the outcome of the contact of three great civilisations, the Hindu, the Muslim and the British. It is still undergoing a rapid transformation by discarding the old high-flown language and adopting a simple and rational style. The process of evolution, being slow, may be indiscernible, but that the process is going on continuously is undeniable. It is the necessary result of the impact of different cultures on one another. Rapid development is taking place by the incorporation of foreign words needed for the new discoveries of Science and Art. The effect produced by the English language on the Urdu vocabulary, its phrases, idioms and style is far-reaching and immense. It has been impressed with an indelible character by the translations into Urdu of English classics and masterpieces of English literature, reproduced almost verbatim, sometimes keeping intact even the actual construction of the sentences. The influence of English, which is unquestionably a world-wide language now, is a great boon to the country. It abounds in literary and scientific contributions made by men of genius and talent, and has become a mighty literature, embodying the product of all the researches made during the past centuries, from which much can be drawn by the Indian vernaculars. The English language has thrown open fresh branches of study, and its close association must continue to exercise a paramount influence over the Indian vernaculars and dominate Indian thought.

Living languages have a much greater facility in influencing the dialect of a neighbouring country than mere old classics. With the advance of international relations and with the continual removal of geographical barriers, there is bound to be a closer intercourse between countries in close proximity to India. With a greater frequency in intercommunication and an increase in the exchange of social intercourse, even the neighbouring Asiatic countries are

a whole country could suddenly be made to change its language. The growth of a language is a slow process requiring ages for its full development.

Now there is undoubtedly at least one vernacular language, which is tolerably understood in all the principal towns of India, known to the largest section of the people and spoken over the greatest area in the country. Even without the help of the English, one can make oneself understood through it in almost every important place. To avoid all controversies as to its nomenclature, it is now generally called Hindustani, rather than Urdu or Western Hindi. It is really a new growth, which is an evolutionary product of the Hindu and Muslim cultures, combining with each other for centuries. The close association of these two great communities of India was bound to bring about a fusion of the two currents of language. As a result of their mutual contact in the Hindustan proper, a common language developed naturally, based on Arabic, Persian, Sanskrit and Bhasha vocabularies. It was the happy mean between two extreme forms, one with high-flown Arabic and Persian words, and the other with similar Sanskrit expressions. The new language attempted to avoid the use of unfamiliar words, no matter what their origin, and adopted the simple vernacular, which was actually spoken, as its basic foundation. With the lapse of centuries and the labour of eminent scholars and writers, it has acquired a high degree of polish and refinement, and has undoubtedly come to occupy a premier position among the languages of India. It has been enriched to a very large extent by classical works in prose and poetry, and by journals and periodicals. It can certainly boast of a wealth of high-class poetry which compares very favourably with the poetic literature of any other country. In exquisiteness of language, sweetness of melody and simplicity of idioms, it yet remains unexcelled.

reproduced modern thought and scientific knowledge in an Indian language, which can be made accessible to a far larger number of people than can ever be accommodated in the universities of India. It is a matter of intense gratification that rapid progress is being kept up without a break, and there is an uninterrupted development all round. Human knowledge is an international asset to be found in the languages and literatures of all the peoples and all the countries of the world. The Osmania University by its literary and scientific work has opened up new avenues for the Urdu-knowing public.

India is a sub-continent with a large population of about 320 millions, and it is no wonder that the various provinces and States are like so many countries possessing different languages. If Europe without Russia, which is two-thirds of India, must have so many different languages which are distinct, separate and independent from one another, it is not at all surprising that there should be a diversity of provincial languages in this country. Although in size an Indian province is comparable to a country of Europe, there is in fact a far greater affinity among the Indian languages than among the European. Owing to the fact that the whole of India is one single political unit, there is a process of linguistic unification already in partial operation.

From the national point of view it would be an ideal thing if there could be one single language and one script for the whole of India; but such an ideal is not capable of attainment within a few centuries. A language is a spoken dialect and cannot be made at one's bidding. Politicians cannot create it. It cannot even be made by a whole people or a whole nation all at once. It is something akin to a natural organism, which grows and flourishes of itself, though it can be nursed and tended so as to promote its growth. It is impossible to conceive of a contingency where

of a new educational policy, being the only university where an Indian language has been made the medium of instruction up to the highest stage. Knowledge is imparted here in a language of the country so as to be easy of acquisition. The Urdu language will ever remain deeply indebted to the munificence and generosity of His Exalted Highness, who has conferred a permanent benefit on it by founding this great educational institution.

As a large number of Convocation addresses are delivered every year, really very little remains to be said anew. If one were to cover the entire ground, old ideas would necessarily have to be expressed afresh in different words. I myself have previously had occasion to deliver Convocation addresses, and so would like to avoid repetition by confining myself on this occasion mainly to the unique features of the Osmania University.

Your University has solved the greatest problem which had faced University education in India. It could hardly be expected that without strong patronage and support Urdu would ever prove adequate to meet the demand made upon it for imparting higher education. With the help however of the University Academic bodies and the Translation Bureau our language has been considerably developed and enormously enriched, and shown to be fully capable of reproducing Western modes of expression, and incorporating Western ideas and thought. The Translation Bureau, with single-minded devotion and strenuous effort, has produced wonderful results in a remarkably short time. Classical and standard books of English and other languages have been translated into Urdu and made available to the reading public, involving a considerable saving of time, energy and expense. The University has been able to carry the torch of learning far beyond its bounds, and convey its message across its borders to distant provinces, as it has

CONVOCATION ADDRESS

BY THE

HON'BLE Dr. SIR SHAH MUHAMMED SULAIMAN, LL. D.

Chief Justice, Allahabad High Court

MR. CHANCELLOR, FELLOWS AND GRADUATES OF THE OSMANIA UNIVERSITY, LADIES AND GENTLEMEN.

It is my first duty to express my grateful thanks to His Exalted Highness the Patron of the Osmania University, who is the greatest benefactor of education in India, for having been pleased to order that I might be asked to deliver the Convocation Address this year. It was with great regret that last year owing to an impending engagement I could not accept the invitation sent by the late Dr. Mackenzie, whose passing away we all mourn so deeply. I am, therefore, doubly thankful to the University authorities for their asking me a second time to address the Convocation, and thus affording to me an opportunity afresh of which I could not avail myself previously.

Hyderabad occupies a unique position as the capital of the premier independent State in India, the largest in area and population, and the richest in resources. In olden days Delhi and Lucknow were the centres of Muslim culture, but now the ancient and historic town of Hyderabad is inferior to none as a great seat of learning, and a great centre of Oriental culture.

Every province in India has one or more universities of its own, but of all these universities the Osmania University has a unique and outstanding feature. It is the forerunner

joy at our country — the only place in India where communalism has no meaning due to the excellence of its benignant ruler and the healthy sense of religious tolerance of the people. But of recent years alarming divergences of opinion have been in the air. Students free from bias, brought up in a spirit of natural friendship and regard in schools and colleges, and imbued with tolerance and nationalism, can not only set things right in our own country but can also create a feeling of amity amongst the different communities of the countries by their worthy example and disinterested endeavours.

The Silver Jubilee of H. E. H. the Nizam marks a new era in the life of our country. The Government instead of lavishing money on ephemeral decorations, as is generally the case on such occasions, is spending largely on useful schemes. Now, it is up to the young men to realise their own responsibilities and the sacred duty which they owe to their country in contributing their best towards the real advancement and progress of Hyderabad.

Mohd. Bin Omer,

Senior B. A.

of fabulous sums inconsistent with principles of morality, religion and common sense on a simple holy alliance—the various ludicrous rites and rituals scrupulously observed during the ceremony, plaintively appeal for redress to enlightened and cultured students. The birth of a child in other countries is a matter of rejoicing but in our country it is a matter of grave concern to the unhappy father—for expensive conventional practices are in vogue. Henceforward the child falls a victim to ridiculous customs continuing till death. Even death will not relieve him. The most tragic incident of human life is solemnised with the most pompous celebration.

From early stages we are forced into unauthorised submission. The abnormal fear of parents is deeply rooted in tender hearts, the terror of the rod of some 'school master on half-pay', the unbearable condescension of elders, the extraordinary and misplaced reverence for ignorant priestcraft and the absence of occasions of self-determination tinge our life with a worthless feeling of servility and inferiority conspicuous by their absence amongst the independent nations of the world. The result is that our outlook on life is naturally narrowed. We do not see things for ourselves. We are too often cowed by the haughty presumption of others. These things must disappear if we are to proceed further. Here is an opportunity for young men to work out the emancipation of their country, the salvation of the society in which they move, live and think, by dauntlessly exposing its absurdities and modelling their lives to serve as beacons to others.

India is a home of forgotten principles and lost causes. The demon of communalism has spread havoc and the flood of bigotism and prejudice has inundated the soil. Amidst all the sorrowful scenes of the past and distressing sights of the present, one is forced to look with a feeling of relief and

mother-land. These associations should conduct debates on public hygiene, economical, agricultural, industrial, social and political subjects, and (if conditions permit) writing competitions; and they should arrange for enlightened lectures on contemporary useful topics and convene social gatherings to diffuse life and vigour into their phlegmatic surroundings. A library equipped with a few interesting books and newspapers will prove a strong inducement to enlist the neighbours. A nominal fee levied on regular members will not only defray the expense involved but will also directly bring into contact the organisers with the members of the association. Such associations can conveniently arrange for country excursions, during the vacations, resulting in rural uplift and mass contact. The humanitarian efforts should be centralised by coordinating the committees into a central Hyderabad Students' Federation with representatives from each association and a strong governing democratic body. An organised effort of the kind would prove a fountain of strength to the student community itself, and a source of inspiration to others. It will influence the various walks of life and eradicate their inherent evils. It is a clarion call to young men's sense of organisation and joint action.

It goes without saying that the improper handling of social problems is the fundamental cause of our backwardness. Society is the centre of blessings and evils, joys and sorrows. Good and evil emanate from its bosom to envelope mankind in general. The emergence of individuals into society cannot be utilised unless the relations of man to man, his family, country and nation are regulated on principles of morality, justice and common sense. But unfortunately little attention is bestowed on these relations. The high-handed policy of parents in arranging marriages to the entire exclusion of the tastes, feelings, education and status in society of the contracting parties — the expenditure

Absence of political consciousness among the young men is a folly which cannot be sufficiently repudiated. Their blessed ignorance of things taking place on earth is highly proverbial. Their indifference towards the methods and forms of Government abroad, the scientific industrialisation of the West, the wonderful tactics and bewildering diplomacy of the ruling nations, is really reprehensible, for we cannot afford to live in seclusion, isolated from international contact.

There is a tendency, which characterises the present leaders in certain parts of the world, to keep the young men out of the field of politics as from forbidden fruit. This is generally advocated by our so-called leaders, who have brought the country to ruin by building up their own fortunes. They are dogged with a harrowing dread of young men turning the scales against them and exposing their nefarious activities and weaknesses to the public eye. They poison the ear by sympathetically maintaining that students' time should be solely spent in academical pursuits. The absurdity of their contention is so palpable that it scarcely needs refutation. Every country in the world where 'honesty and sense are no disgrace,' strongly and unequivocally emphasises the necessity of young men participating in politics--for the very simple reason that the young men of today are the rulers of tomorrow ; and certainly none would like to be ruled by unprepared minds, empty brains and inexperienced hands. It is for this reason that the United States of America, France and Russia have ceaselessly worked for the political consciousness of the young men and it is for this reason that Turkey sets apart certain days in the year for the juvenile Government of students!

Under present circumstances there is a pressing need of students forming themselves into associations all over the country to attain unity of methods for adequately serving the

The Challenge to Students

Students have been always regarded as the strongholds of national freedom and custodians of national rights and privileges. They have richly justified the claim by unflinching adherence to ideals and inestimable sacrifices in the cause of honour, truth and justice. The rise of the Egyptian youths for deliverance from alien domination, the heroic attempts of the youths of Damascus and Syria to shake off the galling yoke of foreign supremacy, and the successful struggles of the French and Russian Youth Movements in ending their former regimes of oppression and tyranny, vividly bring home to our minds their importance and significance in the building of Nations. Filled with bubbling energy, enriched with new hopes, exalted with ardent enthusiasm and unfettered by racialism, they can bring into the field dynamic potentialities to fulfil unfledged national aspirations.

The problem of the youths of Hyderabad is part and parcel of the Youths' problem of the world. Hyderabad today is passing through a transitory period. The responsibility more or less rests with the spirit of the age. The problems that confront the youth of our country are the same that have engrossed the attention of the young men of other countries, if we except governmental differences and constitutional discrimination. The illiteracy and ignorance of the masses, their poverty and misery, the web of grossest superstitions accompanied with degrading tradition and customs entangling the people, the callousness of the upper classes, the inactivity of the bourgeoisie and the more dangerous evils of social life eating into the vitals of society, are a challenge to students to take up the gauntlet.



Prof. Wahidur Rahman, B. Sc., Our Hon : Treasurer and Chairman of Physics Department.



Professor E. E. Speight, B. A. (London.) Advisor of English Section.

DEAR CHILD

Never again, never again, laid on my heart's glad
beating,
Those tiny fingers, ah ! such loveliness,
Shall stir in their slumber, buds of dreaming blossom,
Trembling with wonder at the wind's caress.

Gone is my darling, gone is my little one, borne on a
stream of silence
As I am borne, and every living thing,
Circling for ever through the infinite glory,
Lonely and loveless in our wandering.

Here we are not, there we are not, everywhere is our
homeland,
One moment only can our spirits meet;
Our wistful eyes hold all the host of planets,
The Sun is in our heart at every beat.

Whilom I feel death may reveal what means this
endless passing
Through life beyond the senses, near or far;
And by what firman we are sent in exile,
Nor ever learn whose bonded souls we are.

E. E. S.

was from a Shesh family in Nanded. He has written many other essays of historical importance.

A great deal of literary service is rendered by the journals and periodicals. There were two Marathi journals, *Nagrik* and *Nizamvijay*. Now the latter is the only one.

This journal is edited and published by L. B. Phatak. He has been doing this work for nearly 18 years without any substantial help or remuneration, for which he deserves congratulation. *Arunodyamala, Akhyanratna-mala, Wihangamala* and *Rajhansa* are our only four periodicals. *Arunodya-mala* was edited by B. G. Pargaonkar and Shankerlao Sadawarte, at Aurangabad.

Akhyaratna-Mala was edited by D. L. Mahajan. In this periodical only lives and stories of the sages and great men, in verse, were published. *Wihangamala* was edited by W. R. Kant and J. V. Deshpande. This was published at Nanded. These periodicals were published at intervals of two months. *Rajhansa*, a monthly magazine, was published at Hyderabad. These periodicals brought many writers and poets into light. But now none of them is in existence, which is a matter of disgrace to us.

There is a great deal of literary work hidden from the public, which necessarily should be brought into light and published.

On the whole the literary condition in the Nizam Maharashtra is not very satisfactory: yet we hope that we shall attain, under the glorious reign of H. E. H. The Nizam, one of the greatest literary patrons, that place which we had in the 13th century. The poet Vinayak says: "Those who had a glorious past have a pleasant future."

These stories are in no way inferior to the stories published in British India.

Mrs. Sushila Bai Phatak, Balashanker Deshpande and many other writers contribute stories to magazines. As these stories are not collected in books it is impossible to pass remarks on them.

This is an age of story-writing. In British India stories are published in great number, but in comparison Nizam Maharashtrain story writers have produced very few collections of stories.

The life of Justice Keshava Rao Koratka has been written by Kashinath Rao Vaidya (Hyderabad).

Mrs. Ahilyabai Kirloskar has also written a biography of her brother, entitled *Mazabhai*.

A biography of Guru Govind Singh has been written by V. A. Kanole.

These three biographies are very small. They can in no way be compared with biographies written by N. C. Kelker and others, but are only short sketches.

There are very few essay-writers. Prof. C. N. Joshi is one of them. He is a renowned Marathi scholar and an able critic. He has written many critical essays and reviews, many of them in books such as *Niranjan Madhavachi Kavit*. These essays show his scholarly wisdom and mastery over language.

R. M. Joshi M. A. is a Marathi scholar and research scholar in H. E. H. the Nizam's Archaeological Department. He has beautifully translated the book written on the caves of Ajanta by Mr. Ghulam Yazdani.

V. A. Kanole is also a research scholar in history and a resident of Nanded. He has found out that Waman Pandit

then tried to establish another school, but was a failure. He has published his poetic work in a book entitled *Bag-Shahi*. He is also an essayist. His ballads are very inspiring and thrilling.

There are many other poets whose poems are published in magazines but because of straitened circumstances they have not been able to publish in book form. Such as Krishna-Mitra, Krishnadas, B. G. Harsulkar, B.R. Kulkarni (Fulari), L. G. Ade, and Vinayak Boa Topre.

Our poets possess imagination, power of expression and also poetic genius. But because this is an age of advertisement and we do not like self-applause, they are for the present overshadowed.

Among our famous prose writers are Divakar Krishna Kelkar, Atre, Miss Yamunabai Kelkar, Kashinathrao Vaidya, V. A. Kande, Mrs. Ahilyabai Kirloskar, Prof. C. N. Joshi, R. M. Joshi, G. P. Brahmapurkar, S. N. Bende, Roykinikar, and Mrs. Sushila Bai Phatak.

Baby and Panchali are dramas written by S. N. Bende. These are written in new style and are extremely famous and popular. *Tod-hi-mal* is a drama written by Divakar Krishna Kelkar. In it he has painted a realiatic picture of local conditions. But it has never been performed on the stage. Roy Kinikar has also written a drama, *Mangal Sutra*.

Divakar Krishna Kelkar has carved for himself a great reputation among the story-writers. *Samadhi and Six Other Stories* is his only published book. Though these stories are only seven in number yet they are attractive and appealing. Moreover the plots are realistic and moving.

Miss Yamunabai Kelkar has published a book of short stories entitled *Chitrapat*. The language is lucid and attractive, and the plots are interesting and appealing.

more than seven hundred metres. So he is called Kavya Koustubha (Poetic-Jewel) and Vritta-Samrat (Master of Metres.)

S. W. Gadgil resides at Hyderabad. He has published his work in a book entitled *Mazin fulen* (My flowers). This book contains verses on various subjects which will amuse all readers. There are philosophic, romantic, humorous and inspiring poems. In short, these poetic flowers are of various colours and of different scents. I may be excused for calling some of them odourless.

'Mukund' B. A. (Keshavrao Biderkar, B. A.) is a teacher in the Governmant City College, Hyderabad. He has published a book *Premanjalli* which is an elegy on the death of a lady. The poetic element, no doubt, shines in it here and there. There are flights of imagination. Some of the similes are very charming.

V. M. Datar B. A. Deputy Secretary to the Financial Department. He has translated the Rubaiyat of Omar Khayyam in a book named *Shri Guru Karunamrit* and has added a scholarly introduction to it. There are many other translations of it rendered by different writers. But Datar's translation is one of the more beautiful ones.

S. G. Manathkar, a lecturer in the Government City College, is a poet of fame. He has written that rare thing, a tragic narrative poem. He has written many lyrics and much romantic poetry also.

G. H. Hingnekar, is a pleader from Bir. He has compiled in two parts all his works, entitled *Abhangarupi Hari Vijaya*. This can be called religious poetry. The language used in it is simple and full of emotion.

N. S. Pohanerkar is from Purbhani district. He worked for a time as a teacher in a private school at Hipparge and

D. L. Mahajan tried for it and the fruit of that effort is the translation of *Gitanjali*. As no other poet took part in it the prize was awarded to none.

Being a Haridas, Mahajan has composed many stories and lives of saints, which were published in Akhyan - Ratna - Mala edited by himself.

Dasganu is a very famous poet. He is also a Haridas. Though he is from Nagar most of his life has been lived in Nanded by the holy Godaveri river. He compiled a great book named *Santakathamrita,* which contains the biographies of the saints and sages of the Maharashtra. He has also written a commentry on *Amritanubhav* a philosophical book by Dnyaneshwar, and many other lives and stories about great personages. Though the language is not refined and style and subject matter seem to be old, his poetry is marked with poetic touches. He seems to have poured his heart and experience into his poetry. Even Mr. N. C. Kelkar, who is an authority on Marathi literature, admired his poetry and said that the poems of Dasganu were equal in every aspect to those of Mahipati, the author of *Bhaktalilamrita.* Kant, Parthiva and Krishna Kumar, these three poets were members of the Shardashrama, Nanded. They have published their works in two books, entitled *Pahat-tara* and *Phatatkar.* The poems included in them are lyrical. Though they are few in number, yet there is life and vigour in them: it is like lightning which shines brightly for a moment, dazzling the eyes and disappearing. It is not like the star which shines for hours together with a frail twinkling light.

Yeshwantrao Korekal, a genuine poet, is a resident of Hyderabad. He is well-versed in many arts. He has published his poetic work in three big volumes entitled *Kavyakusum Kalika.* These poems are on various subjects, most of them of philosophic nature. He has composed verses in

In every literature poetry precedes prose first. So we shall review the poetry first.

Among our many poets are D. B. Padmakar, N. G. Nandapurkar, D. L. Mahajan, Dasganu, 'Kant,' 'Parthiva,' 'Krishna Kumar,' D. A. Saraf, Yeshwant Rao Korekal, S. W. Gadgil, 'Mukund' B. A., V. M. Datar N. S. Pohanerkar, S. G. Manathakar, and Kate.

D. B. Padmakar, who resides at Aurangabad, has published a book entitled *Prafulla - Padmakar.* His poems are lyrical. He possesses a natural gift of poetic ingenuity and power of expression. There is a sort of tragic tone in his lyrics which probably are reflections of his own life.

N. G. Nandapurkar, M. A., who is from Nandapur in Purbhani district, is an Osmania graduate. He has been appointed as a lecturer on Marathi in our University. He is an outstanding figure in Marathi literature of the Nizam's Dominions. He has published his poems in a book entitled *Wagvilas.* They have been praised by critics like S. M. Paranjape, Prof. Behere and Prof. Khaparde. Being a student of ancient Marathi poetry he has an exquisitely refined style and a great command over language. He has studied the various aspects of human life and his poems exhibit the versatality of his genius and his minuteness of observation.

D. L. Mahajan, a poet of renown, is from Nanded. Though he is scantily equipped with higher scholastic education, he is gifted with poetic power. His work is published in two volumes, *Mahajananchi Kavita*, a short narrative poem named *Matri Haridya* and a translation of *Gitanjali.* There are vigour, imagination and liveliness in his work. His *Matri-Haridya* is a vivid and realistic picture of merciless society and the miseries that a widow has to undergo. It was declared by a Mandal that a prize would be awarded to the poet who should compose a poem of more than a thousand lines.

A Glimpse at the Marathi literature In the Nizam Maharashtra

(From 1911 to 1937)

(B. S. Joshi Kahalekar III Year.)

Availing myself of this auspicious occasion of the Silver Jubilee, I propose, in this article, to take a cursory survey of the Marathi literature that has been produced in the Nizam Maharashtra during the last twenty-five years (1911 - 1937).

The Nizam-Maharashtra is that part of our State, where the Marathi language is generally spoken: that is, Aurangabad, Bir, Purbhani, Nanded and Osmanabad districts and some part of the Bidar district.

This part of our country has been famous from the 13th century for producing lively literature and establishing new schools of thoughts. The first great poet Kawishwar Bhaskar Bhatta, who wrote an epic poem named *Shishupal - Wadha,* was from Kasar Bori in the Purbhani district. In spite of the violent opposition of the learned Pandits of the age, who thought it below their dignity to read and write in Prakrit or Marathi, Dnyaneshwar wrote a great commentary on the Bhagwatgita and showed them that the Marathi language also is capable of expressing thoughts in emphatic and impressive tones. He was from Apegaon. Eknath, who wrote a commentary on *Bhagwat,* was from Paithan in Aurangabad district. There were many other great poets such as Ramdas, Dasopant, Mukteshwar, Waman Pandit, Hansa Raj etc. from the Nizam Maharashtra only. Thus our State is the birthplace of Marathi literature.

To the guests he was known as a man of winning smiles, charming manners, and a warm hand-shake. He spent many a laborious day and a sleepless night in order to make the Congress a success. That man is our Dr. Quraishi, the local secretary to whose unceasing efforts and indomitable will-power goes the crown of success of the Science Congress.

Khaja Nasrullah

M. Sc. (previous) (Botany)

trouble of depositing the money next day, realised from the members of the congress in connection with the sale of the meal coupons. We had to shell out coins whether ten, eleven or twelve in the night. We usually went to bed very late at night and had to get up early in the morning.

Do you know who came to our relief? Tea. Tea for teetotallers, for the exhausted and for the over - exerted. The volunteers, two or three in number, assembled at one place and then sent for tea. We revelled in Tea like Omar Khayyam whose whole life was centred on wine and women. Who is great ? Omar Khayyam or volunteers Decide for yourself.

I have no notion of course what the 'wooden soldiers', I mean the U. T. C., did at nights when the cold wind raced about. I am never inclined to think fortune had been more favourable to them. This much I can say: they combined work with play. But Blue-Shirwanis..........Ah ! your fate is the common fate of all. One thing I can say, the Blue colour has been universally liked and if there is an exception to the rule, I shall feel sorry for him.

All the delegates were very kind to us. Most of them extended invitations to their own places. Our U. T. C. member of the Mukerjic fame told me that he has been invited by the psychologist to Calcutta next year to attend The World Science Congress. It is my firm belief that most of the delegates left the hostels with a heavy heart and with the Paradise Lost feeling. Their compliments to us—the volunteers—prove nothing but their greatness. We earnestly wish such golden opportunity may be afforded to us many a time in days to come.

This article will surely be incomplete if I fail to mention the personality that was behind this massive work. He is a man of iron will and something of super-human power.

side and closed the top. He apologised if the water had flowed over me, "So", he said, "the shower is there" (pointing to it above his head).

A 'Nabab' Himself.

On a happy occasion when Dr. Birbal Sahni, F. R. S., was congratulated by many scientists, including Professor Md. Sayeeduddin, the only Indian representative, (the head of our Botany Department and Vice-President of the Faculty of Science) on his being elected a member of the Royal Society – a rare distinction for an Indian, Dr. Sahni reciprocated the good feelings of the gathering and thanked them for the traditional hospitality of Hyderabad. He then observed that the city is a "city of Nawabs and Kababs." You will excuse me when I will say that he looks more like a Nawab himself than an intellectual giant in his white, narrow pyjamas, long well-tailored shirwani and an Indian chadawa with a long upturned 'nose'. Every inch he alone is Nabab, Nabab, Nabab.

Posted in the Post Box.

A kind of friendship, if the delegates allow me to call it so, seems to have grown among the volunteers and the scientists. A certain scientist met his volunteer - friend and wished to know as to where he was posted as a volunteer at that time. Immediately came the reply: "Sir, I am posted in the post box." (He was then posted in the post office which was temporarily set up in the college in connection with the Congress).

Tea as a tonic.

We had hard times at the volunteers' office. I can safely say we were subjected to a kind of Spartan treatment. By 'we', I do not mean the 'Royal We', but the volunteers in general. Our Task-Master, Professor Wahidur Rahman in the hostel (B), did not spare us the

Humble Cottage.

A part of the programme was to take all the delegates round the city and to various other places of historical and geological interest. Let me tell you at the outset that Hyderabad has slums as well as the most modern buildings.

One day on a tour to Himayat Sagar, the delegates took into their head to enquire to whom the 'palaces' belonged pointing to many of the stately buildings that lay on their way. The volunteer who was their guide in the Nizam's State Railway bus got tired of replies and said: "That, Sir, is my humble cottage."

Shower Bath.

There is an arrangement for hot and cold water in the shower. A certain delegate immediately emerged from the Bath Room with steam coming out from his clothes, and requested me to provide him with tubs as the water in the pipe was at the boiling point. I then explained to him that there is a cold water tap just by the side of the hot one, and............he at-once understood my point and proceeded: "You mean by opening the cold water tap, the water in the shower could be adjusted to the required temperature." I replied, "Exactly so."

Tap opened.

It was one of my pleasant duties to show the delegates, on their first day, the Dining Hall, Bath-room, etc. I, as usual, took a scientist to a bath-room and standing myself just underneath the shower, pointed to the letter "H" on the tap, and then told him that hot water runs day and night through this particular tap.

Suddenly he opened it while I was still underneath the shower explaining it. What delay was there for the water to "shower like mercy upon me"? I then dashed to one

I had the honour to serve the scientists in the capacity of a volunteer (a Blue-Shirwani). Fortunately or unfortunately I was made the governor of the Madras Presidency, I mean, I was in charge of all the scientists from the Madras district. The authorities handed over to me four types of coupons, namely European, non-vegetarian, north Indian vegetarian and south Indian vegetarian.

Believe me no scientist belonging to my zone went in for any style of meal other than his own. They felt quite at home and observed their own mulki khana, that is the South Indian vegetarian meal. Their menu included the famous Sambar and Idli with a slight tinge of assafoetida.

Scientists' Remarks.

From among the galaxy of scientists is a certain M. Sc., D. Sc., F. N. L. On being asked why he went to the temporary hostel when he was allotted a room in the permanent hostel (B) said: "Mister, as a matter of fact I did not take this building for a hostel. This is a palatial structure". He then wished to know whether the ceiling was made of cement or concrete. I apologised for my ignorance in that particular, as I did not like to be drawn into the technicalities of the subject.

The same scientist four days after his arrival desired to purchase a coupon for the non-vegetarian style of meals. I remarked that he was the only delegate in my block who wanted to go in for the above meals. He then turned round to his Brahmin room-mate and said: "How can he (my Brahmin friend) have any objection when I dine outside but stay with him?" His Brahmin room-mate replied: "Certainly I would not object." The question of my first delegate appeared rather strange to me. I burst into laughter. It was evident that his room-mate, most assuredly, would not object to the former's sitting with him with a non-vegetarian meal in his stomach.

A Word about Hostels.

Our hostel buildings are the last word in respect of architecture and modernity. These magnificent buildings which are unique in India impressed our distinguished guests very much. A scientist praised them in these befitting terms :

" I have yet to see a hostel like this in India." Another delegate kindly remarked : " It is an inspiration to live in here." And yet another well maintained that he would far rather have his child fail and live in the hostel than come out successful to face the grim realities of life outside. He further declared: "No parent, can obtain such a luxurious and comfortable life for their c h i l d r e n at so small a cost."

The long beautiful boulevards, the stately arches, the magnificent semicircular lounge rooms with polished floor, the excellent, up-to-date bath rooms with hot and cold water running in the showers, the well-ventilated spacious rooms with the necessary comfortable furniture, are some of the many blessings that an Osmanian alone enjoys in these hectic days of unemployment and economic depression.

The material side of life wedded with soul-elevating surroundings have enabled us to live a really happy life. "Beauty is a quality of Divinity and to live much with the beautiful is to live close to the Divine." The sons of the Alma Mater have always derived inspiration from every inch of this Holy Land.

The Humorous Side of the Congress.

Our hostels with the most up-to-date electric and sanitary fittings seem to have become a source of trouble to some of our delegates. The cause of it is as follows.

The Nizam's State Broadcasting Service Bus was installed to broadcast the speeches. The demonstration of the magic lantern slides was a delightful feature of the lectures. Illustrations and slide demonstration coupled with masterly delivery gave a distinctive charm to the speeches. We are very much indebted to the distinguished guests for having added much to our fund of general knowledge.

As a Volunteer.

The closing day of the year 1936 saw the mustering of the congress Volunteers to steel themselves for the sacred service of the scientists who were drawn up from the remotest corners of India, with the exception of certain foreign members, such as Sir John Russell and Dr. Emeneau and Dr. Mandelbaum from Yale University.

The Volunteers, divided as they were into two main groups, The University Training Corps and the Blue - Sherwanis, saw the massive work through in a fine spirit of service and responsibility. A major portion of manual labour was performed by the U. T. C. members, while all that demanded intellectual consideration was done by the Blue - Sherwanis. This happy division of labour alone was responsible for the success of the Congress.

Letters have been pouring in from members of the Congress as to how very grateful they are to the volunteers, specially to the U. T. C. members for having made their short stay most pleasant and comfortable. Sir Akbar Hydari, I am told, expressed great satisfaction at the volunteers' pleasing conduct. It was Sir Akbar who felt and rightly felt that the group photo of the members of the congress would be incomplete without the volunteers. We are grateful to him.

themselves in agriculture." He met some of the educated young men who have received education in colleges conducting farms most successfully. 'They are able,' he said, "to adjust their agricultural activities to the needs and possibilities of the market, which they study and try to understand............that is the advantage of education. In connection with subsidiary occupation for the cultivators during the months when they have no work to do in the fields, he observed: " Efforts should be made to devise methods with a view to giving them work in the fields all the year round." He said: "Steps should also be taken to provide work for them through the promotion of cottage industries such as bee-keeping, spinning, weaving and basket-making. "It is important," Sir John said, "that the cultivator has regular work all the year round; for if he has long periods of idleness, he is bound to develop idle habits."

It is understood that he will complete his inquiry in March before leaving for London. His report will be drawn up in England and then submitted to the Government of India.

There is a special application and advice to us in the words of Sir John. When the Hyderabad Government is contemplating a scheme to absorb the educated unemployed youths in agriculture, it is time for us to urbanise our villages and give serious thought to agriculture. India is essentially an agricultural country. We must turn to our fields now.

The Popular Lectures.

All the popular lectures that were held at the Town Hall between 6 p. m. and 8 p. m. were well attended. The Hall was packed by the enthusiastic audiences. The public is very much benefited by these lectures.

to each other as the two sides of a coin: they are interdependent. We should not miss the wood in search of trees. The university stands for physical and mental perfection.

Rao Bahadur B. Viswanath, Imperial Agricultural Chemist and officiating Director, Imperial Agricultural Research Institute, New Delhi, presided over the Agricultural Section. The subject was, "The Science and Practice of Agriculture in India". Indian soils and agricultural practices, he said, were several centuries old and research should be and was concerning itself more with the details of existing practices than with the evolution of wholly new methods, whose success was doubtful. The research should aim at building up agricultural practices based on the existing system, and suited to the soil and the cultivator. The cultivator is always ready to welcome improvements suited to the conditions he is face to face with."

Regarding Fertilisers he said that organic manures are the most suitable to Indian soils. Pointed attention was drawn to the " evil consequence of the intensive cultivation and the intensive use of fertilisers" without the accompaniment of organic matter and organic manure.

Among the many eminent scientists at the Congress, Sir John Russell, the Agricultural expert, was one worthy of mention. He has been deputed by the Government of India to review the progress of Agriculture in India with special reference to the work of the Imperial Council of Agricultural Research. He has visited many villages, farms and plantations.

In an interview with the Representative of **The Hindu** he said: "It will be a very good thing indeed if educated young men take to Agriculture. It was educated youths that made English agriculture and I hope that more and more educated young men will settle in villages and engage

He further maintained that the public should be educated "as to the essential importance to health of an adequate and sound supply of milk and other stuffs of animal origin and in providing better facilities for their production, transportation and marketing, so that village cultivators and stock-owners may be able to produce more fodder crops to supplement the grazing available, more and better farmyard manure or compost, and better stock: thereby increasing their nutrition of the family while maintaining the fertility of their holdings and making a substantial contribution to our maintenance of public health."

I have no notion of a more pitiable plight than that of the students in respect of diet. It will be a criminal waste, if we do not benefit ourselves by the exhaustive investigations carried out by the scientists in the matter of human nutrition. A step forward in this field will not be a step too early. We know already how apparently incurable diseases are cured by the mere correction of diet.

Lord Linlithgow's earnest desire to improve the national health marks a new era in the history of the nation building. Col. Oliver's appeal to improve health by the addition of milk along with adequate amounts of green leaf, vegetables and fruits to our daily diet must not be ignored.

At a time when Japan in the East and European nations in the West have already adopted improved diet for the welfare of their nations my humble suggestion in this connection is that a 'University Diet' should be prescribed for my narrow-chested, short-sighted, and physically unfit brethren, (I don't exclude myself). I confidently believe that no amount of strenuous exercise by way of U. T. C. training or Muller's famous exercises, either in sunlight or moonlight can improve our health. Diet and exercise are as closely attached

was himself fascinated by the charming manners of the Bengali psychologist and he was only too pleased to hear this remark from him.

Colonel Oliver presided over the Medical and Veterinary Research Section. In his address he dealt with the relation of 'animal nutrition to public health in India'. In the course of his address he said " Researches seem to indicate quite clearly that the milk from cows fed almost exclusively on the dry food materials on which cows are usually fed in city dairies in India and during the dry season in many parts of India is very lacking in Vitamin A. It is rational therefore to assume that the milk of cows maintained in city dairies where adequate supplies of green fodder are costly and difficult to obtain cannot usually be considered a satisfactory food, particularly for children. This is a point which I am sure deserves much greater attention than it has hitherto received from the general public."

" Regarding nutrition and Public Health," he said "Dr. Akroyd and others have on other hand recently demonstrated that striking improvement in the health and devélopment of school children in India can rapidly be effected by the addition of small quantities of cow's milk to their diet and it is a matter of very considerable importance to human dieticians in India that in the course of the observations it has been shown that skimmed or separated or reconstituted milk made with skimmed milk-powder......... are very valuable foods when taken along with adequate exposure to sunlight. Great improvement in health and physique could therefore, be effected, at comparatively small cost, if the consumption could be increased of skimmed or separated milk or milk-powder........ in which all the proteins and mineral salts of whole milk are preserved almost intact.

Bengal are noted for their 'national outbursts'. These can be attributed to their remarkable joint family system.

Speaking on the Crossing of Stocks he declared that crossing of closely allied stocks is conducive to increased vigour, and energy of mind and body. The crossing of variable stock produces persons of exceptional gift. "But the crossing of widely different stocks is supposed to produce an inferior race."

As for social or racial prejudices, the psychologist maintained that according to Semmer, it is based on recognition of differences, but prejudices simply because of differences do not exist. "There is no feeling of hatred between the Spaniards and the Indians in spite of differences in colour, speech, habits and dress. The difference is only an element in the total situation; sometimes it may be the symptom and not the disease. The main determinant consists in the baulked impulses of the politically, economically, and culturally dominated group. Differences are emphasised because of the readiest rationalisation for defence against real or fancied dangers. It is for the accentuation of the dynamic relation that the Hindu-Muslim tension exists. The policy to multiply such relations of a group with different groups is destructive of its vitality. When any tension occurs, the reaction may aim at the immediate extermination of the inter-group equilibrium, but history shows that men cannot be made to change their opinion by direct coercion. This is an instinctive mode of reaction in which the end is directly aimed at and is characteristic of lower orders of animal behaviour."

Mr. Mukerjee is a man of amiable nature. Our U. T. C. member who was appointed to be almost like a 'keeper of his conscience' seems to have created a happy impression on our distinguished psychologist. He said: "I very much like the volunteers, especially you." The U. T. C. member

He gave a demonstration of magic-lantern slides of the devastated Quetta. Some of the scenes were too tragic for words. "Knowledge is power," he said, "and if the knowledge that we are accumulating may ultimately give us complete means of combating the evils of the destructive forces of nature, it will provide yet one more example of the great benefits that may be contributed by science to the cause of human welfare." From his last sentence we can gather how great is Mr. West's ambition to help humanity in distress and how confident he feels that science alone can do it. He is a short-statured, energetic young man with eyes beaming with intelligence, every inch a scientist.

For want of space I shall give only the gist of a few of the many interesting topics. Mr. K. C. Mukerjee delivered a lecture on "The Social Mind of the Individual," and he pointedly remarked how the hearts of females could be won over by discussion.

Speaking on the failure of Gandhiji's Satyagraha movement to stop the drinking habit of the masses, he observed that the attack was clear and direct upon the end. A greater and farther reacting effect would have been produced if Gandhiji had gradually tried to improve the conditions, introduced good music, drama, education etc. Social amelioration could never be effected by legislation.

"In flattening a warped iron-plate strokes are to be judiciously given outside the warped-plate, otherwise new defects will be produced. Should we think humanity can be more readily straightened than even an iron-plate?"

Mr. Mukerjee, speaking on 'Family and group-sentiment' observed that a wider group - sentiment is developed in a child's mind because of its consciousness of the family group. He said that the Japanese are noted for family sentiment and national spirit. The people of the East-

centred to the disadvantage of the former. The town should extend its greater knowledge, quicker living, and the manifold amenities of the modern age". He then summed up as follows : "Our duty then is clear : Namely to improve the Village, the nucleus of our country life, and inject its chief Agent, the Villager, with a chosen culture of the virus of the modern age through Education and Industrialisation".

Mr. W. D. West presiding over the Geology and Geography section and speaking on 'Earthquake Toll in India', stressed the importance of safe building, specially in the Danger Zone. He observed that means should be adopted to forestall and ameliorate the worst earthquakes in India. "India," the speaker maintained, "is at present passing through a period of marked earthquake activity and there is no reason to suppose that this activity has yet died down." He deplored that no steps have been taken in India to combat it.

Referring to the origin of earthquakes he said it was significant that "they were mainly confined to areas of recent or present day mountain formation, when the rocks of the crust fractured as they were compressed to form the mountains." Mountain formation in India has long since ceased. The Aravalli, Vindhya and Sathpura mountains are in the last stages of decay and so free from earthquakes. The recent formation of the Himalayas and the mountains of Baluchistan are "still throbbing in the later stages of their growth, with a result that earthquakes are occurring only in the vicinity of those mountains. They are intact, almost entirely confined to the north of a line joining Bombay to Delhi, and Delhi to Calcutta, and this area could be termed the danger zone of India."

In another speech delivered in the Town Hall he declared that "The Deccan specially is more stable than the rest of India." This is good news for us.

This is, indeed, a scientific age. Science is omnipresent and omnipotent. The time is not far when we shall build castles in the air, and come down upon the earth on Sundays for recreation. We have already Air-Ministers, and soon we shall have yet Airlords as we have Landlords. I am doubtful whether the advance in Science will not ultimately end in our abandoning the Mother-lands. Present day Europe is at its wit's end to find a radical remedy for Divorces. But in what higher court could our Mother-Land possibly file a suit against us for having divorced her, deserted her? Will that court be the Supreme Court of the Being Supreme!

The presidential address of Rao Bahadur T. S. Venkatraman, on 'The Indian Village............its Past, Present and Future' was highly interesting and instructive. It was an appeal for "no mean citizen of a mean city." He pleaded in his address for improvement of the primitive methods of cultivation with the aid of science.

The speaker asked: "Does the future lie in a greater and further development of urban life, taking pleasures that would somewhat mitigate the inevitable disadvantage associated with it, or does the situation need radical changes in the village and village life, importing into it certain characteristics of the town?".

He then continued:—"The clearly indicated line of advance for the future lies in improving rural conditions and rendering our villages better and more efficient in the discharge of duties set to them by the country as a whole, viz.:

(1) The proper and adequate feeding of the steadily increasing population, and (2) rearing a healthy stock of men and cattle and maintaining them in a fit condition.

Further he observed: "Life activities that were village-centred in the Past are increasingly becoming town-

branches of science is, indeed, a welcome sign. Your Congress may take legitimate pride in what it has done in recent years to foster the spirit of scientific inquiry and research in India. Though comparatively young the Osmania University has been preparing to make its contribution to research in science. It is my earnest desire that it should co-operate with other Indian universities in preparing the way for a Scientific Renaissance which will contribute to the material progress and prosperity of India and at the same time secure for her an honoured place in the ranks of the nations who lead in enlightenment and culture. I wish your Congress success in its labours."

The Science Congress commenced its session under the presidency of Rao Bahadur T. S. Venkatraman. Sectional meetings relating to Agriculture, Geology, Geography, Medicine, Veterinary Practice, Botany, Zoology, Mathematics, Physics, Chemistry and Psychology, were held during the day in the sectional meeting rooms of the Osmania University.

Sir Akbar Hydari, in his inaugural address at the Conference, felicitiously brought out the cultural value of Science in the following words: "While the critics of a materialistic conception of life and scientific achievement may minimise the sum - total of their efforts on human happiness, who shall deny the universal service rendered by Science in liberating mankind from the trammels of blind superstition and barren dogma, and higher, better, and more correct sense of value? Besides there is value in scientific inquiry as such; assiduous and patient collation of data, facts, and figures, training in observation and method and the spirit of verification, which induce precision, veracity, balance and fair judgement, are of superlative value to the administrator."

THE SCIENCE CONGRESS

The year 1937 dawned upon the citizens of Hyderabad with scientific hopes, scientific outlook, and scientific aspirations to keep pace with the rapid progress the world is making in Science. The need for scientific knowledge has never been so keenly felt as today.

The twenty-fourth Session of the All India Science Congress was held from the 2nd to the 8th of January 1937 in the University Town, — a function unique of its kind in the history of Hyderabad.

Our beloved Ruler, who is the patron of the Osmania University most graciously sent a message to the Science Congress in which he pleaded for a genuine Scientific Renaissance. The plea is most timely.

The Message from His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad and Berar to the All India Science Congress which was read by Sir Akbar Hydari, the Finance Member, at the Congress, runs as follows :—

"I rejoice to hear that, in response to the invitation extended by my Osmania University, you are holding the 24th session of the Indian Science Congress in the capital city of my Dominions. As the Prince of Berar, owing to his absence from Hyderabad cannot have the pleasure of opening the Congress and welcoming you all personally, I send this message to bid you God-speed in your deliberations."

" The growing realization by Indian Universities of the need for providing adequate facilities for research in all

to study more minutely but the guide wished me to see the Abode of the Learned, which **Sultan-ul-Uloom**, the king, had ordered to be built. I left the city and within an hour saw some beautiful white-washed buildings emerging from the horizon. The driver told me that I was nearing the Abode of the Learned (The University Town). He stopped before one of the buildings. The lofty arch invited me to enter. I thought that this was my destination. Strange, that I found familiar faces. "What are they doing?" I thought. They were all busy. None seemed to notice me. A servant opened a room, furnished with a bed, a table, a lamp and a chair. I was tired. The bed was inviting. The servant had gone. I felt dizzy, and so I sat down in the chair in a reclining position. I do not know what happened afterwards. But suddenly I heard a melodious song, which was sung in chorus. It was not strange to me. I knew it, and so I joined the chorus.

> God bless our gracious Nizam,
> Long wisely may he reign,
> And bless his State and subject,
> Nor let his kingdom wane.
> May peace abide and wisdom guide,
> Our ruler ever more,
> God guard and guide our Nizam,
> And on him blessings pour.

The chorus stopped. I said, 'Amen', together with the others ; and then there was a loud clapping.

Suddenly I opened my eyes and found myself in the same arm-chair, with the History of the Deccan before me.

Mohd. Abdul Wahab Muslim.

Tired in mind and fatigued in body, I went to sleep. I saw a big city. The roads were broad and clean. The buildings were palatial. Strange vehicles were running to and fro at a tremendous speed. I went to one of these vehicle-drivers and asked him to show me the different sites of the city, which for its wealth and splendour deserved the name of the Abode of Fortune (Bhagnagar).

The morning I spent in seeing the massive, splendid buildings of the High Court and the Hospital. I had a little pain in my eyes. A doctor with a careful and smiling countenance applied some medicine to my eyes and asked me to close them for a moment. When I opened them again the pain had vanished. I thanked the doctor and left the hospital. It was Friday. The driver took me to a grand mosque. There were hundreds of people. Never in my life had I seen so large an assembly in a place of worship. Suddenly I heard several whistles. There was consternation among the congregation. Soon some people entered with one amongst them who was most simply clad. A man nearly whispered to a stranger: "The King. The King!" The prayer began and the king stood shoulder to shoulder with his subjects. I marvelled at the simplicity of his attire and the loving gaze which he threw upon the already assembled people. He seemed to say: **"Believe me, I am one of you, amongst you and for you."**

As I was coming back from the mosque I saw the river, once so terrible but now humiliated. Beautiful gardens bordered it; a charming library building was near by. As I felt hungry I dined in a large cafe and in the evening the driver took me into a large and beautiful garden, which not only contained a Zoo and a Museum but the Town Hall too. Fortunately I found a guide who showed me treasured arts and crafts of ancient, medieval, and modern India. I wished

" None survives whom you can kill with the sword of thy grace; now you will have to revive them, if you wish to kill them again ."

The tyrant said برش سفیدت بخشیدم

" I forgive them for the sake of thy white beard", (old age,) and ordered his troops to stop (Nadir Shah & Nizamul Mulk I)."

I accompanied the old Amir, when he left Delhi for the Deccan. There I saw a strange white people, buying the country's goods and selling the products of some foreign country. They spoke a foreign language. I lived with them for some time. They inhabited some ports on the eastern sea-coast. I also saw bands of marauders, harassing and plundering the peaceful population. The strange people often came to the only court remaining in the Deccan and begged for favours which were granted. Soon there broke out a civil war. I saw people of another white race, speaking a different language. I found the two strange races playing the potentates of the Deccan one against the other. They soon gained power for themselves. (The English and the French).

Leaving the country in this sad and chaotic condition I went on a pilgrimage to Mecca. Years passed by and when I came back to my beloved country, I found that there was only a small territory left for the successors of the Grand Old Man of the Deccan. There was a heavy downpour for some days. The whole city on the banks of the small yet terrible river was flooded. Thousands of people died, and more became homeless. Their houses were washed away. They were dying with hunger and shivering with cold. I saw the beloved (Mahbub) king addressing a meeting. His eyes were swollen as he wept bitterly at the calamity that had fallen upon his beloved people. He gave orders for their redress, and they were supplied with temporary homes and all possible help (The Musi flood, 1908).

prayers. A batch of soldiers stopped action and formed several rows, all facing the West. The Emperor stood amongst them. The Imam was soon killed by a cannon ball from the fort. Another stepped forth. He too shared the same fate. Another, and then no more. There was a silence and hesitation. Death was hovering and there was none so bold as to face it. And now I saw a strange sight; the Emperor stepped forward and lead the congregation! The cannon stopped and perfect peace prevailed (The Emperor Aurangzeb).

Suddenly some invisible being asked me to close my eyes, and when I opened them again I found myself in a splendid court. Two fierce-looking courtiers pulled away a frail-bodied Emperor from the throne and other courtiers were silent as death. There was an old, white-bearded, venerable Amir. Some of the terror-stricken courtiers looked at him in such a way that I thought they were imploring help from him. He seemed to promise it. (The Syed Brothers).

Some years passed away and then there was a rumour that the Capital was threatened with a Northern invasion. The invader had already occupied the town and demanded a large sum from the Emperor. One night I awoke from sleep and heard strange noises. Men were shouting and arms were clinking. People were running hither and thither in great confusion. They were panic-stricken. The town was being set on fire. In the morning one of my friends in the invader's army told me that some foolish, irresponsible people had attacked the invader' s army and killed some of his soldiers, and that he in his wrath had let loose the dogs of war. My friend took me to his Emperor so that my life, property and family might be spared. Before him I saw the same old, fatherly looking Amir, who entreated him for mercy.

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کي خلق را و باز کشي

one day, passing along the road, inspecting things, distributing alms to the poor and promising redress to the sufferers. People told me that he was the beloved and learned prime-minister, **a patron of learning** and a friend of the poor. One of them showed me a grand, spacious building. I heard a humming noise coming out from it. He told me that it was the Madrasah, the haunt of hundreds of students. All their necessities were supplied by the Vazir (Mahmood Gawan).

The black bird of night spread its raven wings and I went to bed. In my dream I saw five different royal courts, one excelling the other in grandeur. There was faction in the city and so I left it.

I am a wanderer. One day in my wanderings I heard the booming of cannon. Surely some city is being bombarded, I thought, and galloping my horse soon found myself before a strong citadel. There was a breach in the thick wall. The people on the parapets were terror - stricken. The besiegers were marching forward. Suddenly I saw a tall, veiled form clad in full armour, calling the panic-stricken people to rally. They did so and attacked the on-comers with such ferocity and recklessness that they had to fall back (Chand Sultana). The night fell and I spent it in a hospitable Hindu home in a neighbouring village. I lived there for three days, and then with great difficulty was able to persuade my hosts to let me re-start on my never-ending journey.

Years passed by and once more I heard the thundering of cannon near by. An hour's brisk walk brought the scene of the siege before me. Again I saw the desperately fighting besieged and a host of the besieging army. The cannon were pouring down their shots. I saw a veteran soldier, clad in simple garb, fully armed, with a white beard and a stately figure. One of the soldiers told me that he was the great Emperor of Hindustan. I heard the call for Asar

and sciences. There were poets, mathematicians, philosophers, divines, alchemists, logicians, sufis, yogis, and learned men in Arabic, Sanskrit and Persian. The court thus undoubtedly rivalled those of Al-Harun and Al-Mamun Abbasi. I lived with them for some time and saw the newly arrived caravan going back to the north. Still some people remained, specially the sufis and the war-like generals, of whom one wanted to conquer hearts and the other territories (Md. Tughlaq).

I remained with them and one day saw a great consternation among the people. It was Friday. I went to the Jumma Musjid, where I found all the notabilities. There was a saintly man who solemnly crowned a vereran general, who only a few months later offered it to a dashing youth, already known and loved by his comrades-in-arms. I served in his army and accompanied him wherever he went. I saw the splendour of his court. The King was a Musalman but his prime minister, whom he called his own master, was a Hindu. His successors too I had an opportunity to see. In their courts the northern invaders and the southern conquered people sat together side by side, performing their multifarious duties (Ismail Mukh and Hasan Gangu Bahmani).

I love travel. One day as I came back from some ancient caves, a marvel to the eye and mind, (Ajanta and Ellora) people told me that the king had gone to another place, had built a new city, and made it his capital. I decided to go there. Some of the distance I travelled on horseback, the remaining by bullock-cart.

The latter part of my journey was difficult and tiresome but full of thrills and romance. Starting and stopping, helter-skelter hurry and scurry, at last I reached the new city. All the way I saw perfect harmony and peace prevailing among the people. In the new capital I saw an officer

Centuries in Dream

Tired in body but rich in mind, I came back to the hostel from the University Library.. The Sun was slowly descending down the West. After my Zuhar prayers, I pulled a chair near the table and sat down in a reclining position. Suddenly my eyes caught sight of a yellow volume, lying just before me. It was a new abridged history of the Deccan, which I had received only the day before and a great part of which I had read in the night. I took it and began to read. I do not know how long I read. Words seemed blurred. Some invisible power was drawing a black curtain before me.

Suddenly I heared shouts of Allaho-Akbar and deafening sounds of drums. Soon I saw tall, sturdy long-bearded people with swords and spears in their hands. They wore long, loose garments, were riding Turkish horses, and every one of them carried a big shield. Immediately there appeared another party. They were neither so sturdy nor so fully clad. Thundering sounds were raised and the two parties fell upon each other. They shouted their different religious slogans but it was not a religious war, for the northern invader soon routed the rival party and I saw the conquerer and his comrades carrying heavy loads of riches (Sultan Allauddin Khilji).

This heavily-loaded caravan had just vanished, when I saw another host of people coming from the north. They carried not only arms but their bags and baggage too. I accompanied them and reached a strong fort, built upon the summit of a hill. There was their king, with his courtiers and accomplished representatives of all the then known arts

very good start and with its band of young and talented writers it has superseded some of the older papers. It was and continues to be organ of youth and a great champion of the Hyderabad cause. Some time after it was started it received a set-back, but it is now striving to regain its former position. The *Weekly Raiyyat* is devoted to the amelioration of the agricultural classes and is at the same time a national paper of Hyderabad. The daily *Payam* is of recent origin and is edited by the famous author of *Leila-kai-khutooth.* But according to G. B. Dibblee, 'sheer brilliancy with the pen is not the best quality of an editor,' and unless *Payam* identifies itself with the true and legitimate aspirations of the people and does not become the mouth-piece of an undesirable element in the country it will never be a welcome and a healthy addition to Hyderabad Journalism.

The *Hyderabad Bulletin* is the only daily paper in the English language. It is ably edited and has a sound policy. It is above party squabbles and does not dabble in the intricacies of State policy.

Mohd. Budruddin Khan (Shikayb) B. A.
(Osmania)

This article is a translation by the author of a short extract from his Urdu book " Principles of Journalism " which is in the press and is shortly to be published.

published for many days continuously, though the public no longer take any interest in it. At present news from the districts with lengthy and tedious descriptions is being given too much space. This could be compressed and reported in a brief way to serve a useful purpose.

Some of the other reasons for the backwardness of the Urdu Press in India is due to printing disabilities. The invention in Hyderabad of the Nastaliq type was no doubt undertaken with a view to overcome these impediments, but the daily press is not interested in it. Perhaps it is very expensive or quite unsuitable for the needs of a daily press.

The Press Act and the restrictions imposed on starting fresh newspapers might be relaxed according to our own conditions and requirements.

It is a pity that our local papers seem always at loggerheads with each other. Their petty differences in the matter of grants and in their methods, however unjournalistic, of gaining their own ends become topics of lively discussion in the editorial columns. A Press Association seems to be the urgent need of the hour for it is the only institution that can solve these problems. On the initiative of the *Manshur*, steps were taken to form such an organisation, and a meeting was also convened but nothing more has been heard of the Association or its activities.

Of the numerous papers in Hyderabad particular mention should be made of the daily *Rahber-e-Deccan* and the *Manshur* and the *Weekly Raiyyat*. The *Rahber* is the best organised paper of Hyderabad, popular, punctual, full of material, well-printed and up-to-date, and is well worthy of being included in the list of the first-rate dailies in Urdu. It is also a true mirror of public opinion and the greatest exponent of Hyderabad nationalism. The *Manshur* had a

an indigenous news-service, call themselves newspapers and great organs of public opinion. There is no endeavour on their part to collect news, nor dot hey care to keep any representatives or reporters of their own even in the capital city. The subscriptions, the advertisement charges and the aid they get from Government are sheer waste of public money. They have no policy, no ideals, no knowledge of the elementary principles of Journalism and yet they are free to form public opinion and misguide the judgement of their readers. It is time that these papers should adopt a higher code and deserve the patronage they receive from the Government and the people.

Perhaps this pathetic condition of some of our newspapers is to a great extent due to the spoon-feeding policy of the Government. There was a time when no encouragement was given to newspapers due to their readers' apathy and indifference towards them. The Government extended a helping hand and from that time this sort of aid seems to have become a general rule. Nowhere else in the world does this kind of spoon-feeding exist, nor are Reuter's telegrams supplied to papers free of cost. The Government is no doubt actuated by the best of motives, and it must be said to the credit of the Government that these grants or stipends in no way tend to the suppression of news or views of these newspapers. On the other hand Government encourages frank and healthy criticism of its policy. But these grants should be discontinued and the papers be left to support themselves.

As far as the selection of news is concerned a foreigner would be surprised to see in our local papers important news either treated as most trivial or neglected totally and prominence given to stale or second-rate matter. Abroad the news of the day ends with the day, but here the rule is just the reverse. At times the news of a particular day is

for those who with small capital and no academic qualifications whatsoever want to make a fortune with the least possible trouble. But the rank and file have no prospects at all; and they either drift away into some other profession for better prospects in life, or become a prey to the questionable whims and fancies of the proprietors of their papers. Urdu journalism is no exception to this rule. Frankness and truthfulness, which ought to be the chief characteristic features of the daily press are conspicuous by their absence in Urdu Journalism.

A newspaper is first and foremost a disseminator of news and its views have only a secondary importance. It is by the wealth and plenty of its news columns that a newspaper can not only justify its existence and guide public opinion but is enabled also to thrive financially. "The food of opinion," as President Wilson once remarked, "is the news of the day." But what then is news? "By news, I mean," said Ralph D. Blumenfeld, Chairman of the *Daily Express* of London, "actualities, things that have happened or are about to happen, facts and occurrences which are likely to interest newspaper readers, or about which they want to be, or ought to be informed. It may be anything from an epoch-making event to an interesting triviality of the moment, but it is always a happening, a fact. It may even be a rumour or conjecture, provided that such rumour or conjecture is well authenticated and not mere gossip or wild guess-work, for that is sham news and a good editor will have none of it."

Very few papers in Hyderabad possess this news value or have even independent views of their own. Their policy changes according to the needs of the time. Some, with their four sheets and with one-half of their columns filled with advertisements, with foreign news copied and translated from English papers, and with local news supplied by

In his famous book 'Through Thirty Years' Wickham Steed, the late talented editor of the London *Times*, has observed:

> "If my view of journalism is singular, it is at least sincere. From the first I conceived it as something larger than the getting and the publication of news. ....I looked for and found in it means for working out and applying a philosophy of life, a chance to help things forward on the road I thought right, a quest taxing to the point of exhaustion every energy of heart and brain, but having in it the true secret of happiness—constant striving towards ends which, even if they recede upon approach, yet reveal themselves, in receding, as truly worthy of pursuit."

Regarding the characteristics of a newspaper, it is sufficient to say that it is both a commercial proposition and a quasi-public institution. As an institution the Press has been spoken of as "parent, school, college, pulpit, theatre, example and counsellor, all in one", and its function is to inform, to instruct, to entertain and to serve as an advertising medium.

Judged by this criterion the daily Press of Hyderabad leaves much to be desired. Very few papers in India, whether in the English language or the vernaculars, satisfy all the conditions enumerated above. The Press of India as a whole is in a very backward condition, and the repressive measures adopted by the Government have made development impossible. The English papers, to some extent, try to emulate the example set by their Anglo-Indian brethern but the vernacular papers are a law unto themselves.

In India the profession of Journalism has become the refuge of the unemployed. It can be a very lucrative business

JOURNALISM IN HYDERABAD

The twenty five years of the reign of our beloved sovereign, whose Silver Jubilee we are now celebrating, have ushered in a new era of prosperity. There has been great progress in every sphere of activity, and one significant feature of these eventful years in the history of Hyderabad has been that parallel to material advancement there has also been a kind of intellectual regeneration. The thoughts and aspirations of the people have changed imperceptibly—their outlook has become wider. The systematic campaign against illiteracy, the spread of education and the inauguration of the Osmania University are some of the factors that have prepared the ground for this intellectual awakening. A thirst for knowledge has been created in the people which the schools and the colleges do not seem in a position entirely to satisfy.

It is no wonder therefore that the people of Hyderabad discuss current topics and give their judgement on questions of such constitutional importance as Federation. They take a keen and intelligent interest in the economic, social and political problems of the day.

This awakening has been partly the outcome of the growth of journalism in Hyderabad, which has been a useful vehicle for the dissemination of knowledge and the creation of public opinion. But the question arises whether the newspapers of Hyderabad satisfy all the conditions that a newspaper in the West implies. Before answering this question we must know what is meant by journalism, and secondly what are the characteristic features of a newspaper. In the light of these definitions we must find out where journalism in Hyderabad stands.

all that was possible in the span of twenty-five years has been done, and we take the opportunity of congratulating the architect of modern Hyderabad upon his unprecedented success, which has been possible only through the existence of those rare qualities of head and heart, the combination of which has made him an embodiment of all regal virtues His poetic genius of the highest order, his zeal for the welfare of his subjects, his ascetic and proverbial simplicity, his unparellelled religious tolerance, and his sympathetic nature are some of the most eminent factors which have set him apart from his illustrious ancestors. He is the greatest living princely force in India of today, the symbol of our past glory, the pioneer of our present progress and the custodian of our the future happiness.

From the inmost recesses of our hearts overwhelmed by a keen sense of deep gratitude comes the spontaneous prayer: May our Poet Ruler live and rule over us for many years to come, in peace and prosperity. May the coming generations find themselves at the highest pinnacle of material happiness and inward calm, under the magnificent canopy of his unbounded love for his fellow-beings, and may this well-founded State retain its position in the eyes of the world, exalting and being exalted ever-more.

D. M. MUNGIKAR, B.A. (Osmania).

given a fresh impetus by the establishment of a sales depot where articles from the Govt. institutions are sold.

Arrangement has been made for industrial and technical training. The cooperative movement started here just when the public needed it, and has by this time taken deep root in the State, and it is a matter of gratification that the people are being largely benefitted thereby.

Hyderabad has been spending liberally on public utility purposes also. Its roads have received due attention and have been widened and improved to suit modern requirements. This has gone a long way in contributing to the promotion of agriculture, trade, and other business activities and has greatly added to our material prosperity.

In the matter of irrigation Hyderabad stands second to none among native States. Many irrigation reservoirs and canals have been provided on a very large scale and this has been of special help to the poor agriculturists in the State by fertilising their lands and averting famine. The Nizam Sagar which is the second largest dam in India, and one of the largest dams in the whole world, has been constructed at the enormous cost of nearly 5 crores. This stands as an unique illustration of His Exalted Highness's sympathy with the poor among his subjects. The Railway which was formerly under the possession of a foreign company has been bought by the Government and every thing has been and is being done to facilitate travel. Another recent and conspicuous achievement is the establishment of a new Department of Broad-casting which it is hoped will bring the villages into close contact with the towns and cities in this State, and in this way will be of paramount importance to the nation-building work of rural reconstruction. It was not meant in this brief out-line to give a detailed account of the work done by every branch of public service, but only to give a general idea of all-round progress. In short

to the history of any language. A Translation Bureau has been established at great cost which translates the best works on art and science and thus enriching the language does signal service to the State. The Department of Education is gradually but steadily developing and there has been a remarkable advance made in the spread of literacy. The Hyderabad government have been fully sensible of their responsibilities in the matter of mass-education and have started imparting free primary education, and there has been spread a net-work of schools open to all classes without distinction. The matter of female education also is not lost sight of and there has been considerable advance made in that direction.

But this is not all. Although remarkable progress has been made the people are not quite satisfied, for the purely literary education that has been imparted has here, as everywhere in India, led to wide-spread unemployment of literates, and a change in the system is consequently advocated. The problem has been taken up for solution and it is hoped that in fulness of time all necessary measures will be succesfully carried out.

Government have admitted the need for a new system of education which will be, without doubt, ushered in in the nearest future. A Department of Agriculture was established a few years ago and it has been doing excellent service to the State since then. In order to expedite progress in the industrial field a Department of Commerce and Industries was established in 1921, and this has contributed substantially to the industrial development of the State.

The chief work of the department has been to assist small and large scale industries, to foster factory industries such as cement manufacture and cigarette making, and to develop cottage industries. The local works of art have been

need of the day and catching the spirit of the times in which he lives, started for the first time, the parliamentary system of administration in his State, and allowed it to grow to its full flowering, thus giving to his beloved subjects more and more direct representatives in the affairs of state, yet keeping his own rights unimpaired and beyond question. The financial policy of the State also has been initiated and developed on the most modern and scientific lines, recognising that finance is not mere arithmetic : it is a great policy. Without sound government no sound finance is possible. And the way in which the income and expenditure of the State is controlled amply proves this fact, and although Hyderabad has also suffered from the recent worldwide economic depression, today it can be said without the least fear of opposition that the present financial position of the State is entirely satisfactory.

The third important achievement in succession is the separation of the Judicial from the Executive, which has fully justified itself and stands as a model to be followed by other States.

But the unique work of our Ruler's precious life-time and his chief forte has been the spread of education. During the twenty five years of his fruitful reign the march of education has been steady, and remarkable progress has been made in many directions. For the first time the value of imparting knowledge in a vernacular was realised by him, and a university with Urdu, the language spoken and understood by the majority of the upper classes as its medium, was established, which marks the highest watermark of educational progress in the State and will go down in history as the greatest memorial of its august founder. The rapid progress which the Urdu language has made under his patronage and support in the short period of a quarter of a century is without a parallel

Hyderabad Under its Present Nizam.

(A Bird's eye-view)

It is with the greatest pleasure that we, the loyal subjects of the state, representing rich and poor, men of all classes, castes, creeds and colours, are today celebrating the most auspicious occasion of the Silver Jubilee of our gracious king, His Exalted Highness the Nizam, the faithful ally of the British Empire, who is undoubtedly one of the most enlightened and popular rulers of Indian native states and whose beneficient rule is marked with the most eventful record in the annals of modern Hyderabad. It is therefore in the fitness of things to make an attempt, however inadequate, to review through the esteemed pages of our popular Osmania Magazine, his wonderful achievements of which any ruler of his rank and dignity might well be proud. To take a stock of what has been done during the most glorious period of the last twenty-five years it is necessary to compare Hyderabad as it was before his accession to the throne with what it is now. Even a most superficial survey will reveal the miracles that have been performed by the magic touch of the august hand. Before his accession the state was almost on the verge of bankruptcy. The first thing therefore to which he devoted himself whole heartedly in the capacity of the first servant of the state was pulling his house in order and he did it so marvellously and with such a rare skill and wisdom that in only a remarkably short period of a few years the almost bankrupt house rose to the envied position of the possessor of a substantial reserve. His next important achievement lies in the field of constitutional reforms. He is the first dignified ruler of the Asafjahi Dynasty who, recognising the imperative

7. The lovely air breathes of Spring,
   The sweet birds chant
   Hymns of the University, a sacred thing,
   A royal grant.

8. With silver lakes and pearly domes
   Of the charming Orient
   With blooming lands and blissful homes
   Of love and sacrament.

9. Our holy city acclaims the praise
   And hails the charm,
   The resplendent fame, the historic grace
   Of our king the Nizam !

M. A. Qayyum Baqi, M. A.
(Osmania.)



Professor Hosain Ali Khan, B.A. (Oxon.) Our Vice Principal,
Chairman of The English Department.

Song of Silver Jubilee.

1. Behold the day that greets our King,
   With the sun at his door,
   Hear the song the flower-buds sing
   Scattered on the floor.

2. Drink to him who is our lord
   With a heart full of love,
   Hail him in rapture, like to the Bard
   In the blossoming grove.

3. Veiled beneath the pure and simple guise
   The royal genius shines
   Like to the star — the fair disguise
   Of sunny shrines.

4. Generous, loving, sagacious and gay
   Noble and sublime,
   The poet, the scholar — the glamorous ray
   Of the radiant Asifi line.

5. Beneath the cool shadows of his love
   And his high munificence,
   Our motherland like a brooding dove
   Rests in innocence.

6. His magic note of the luring East
   His Urdu and Persian song
   Fair ministrels at the jubilee feast
   Sing in a throng.

मालिनीछन्दः ॥

स जयतु सुकवीशो मीर उस्मान् अलीखां
जयतु च महिषी सा सर्वमाता वरिष्ठा ।
जयतु जयतु वालाशान् सुतस्तत्सुतश्च
हरिहर इति नित्यं वष्टि पत्युर्भवान्याः ॥ १५ ॥

(15). Hail to H. E. H. the Nizam, the Lord of excellent poets. Hail to His crowned Queen, the most distinguished mother of the country. Hail to Walashan Nawab Azam Jah Bahadur and his son! Thus Hari Har prays to the supreme being.

त्रि ३ नव ९ निधि ९ धरित्रीसम्मिते १ वैक्रमे ब्दे
सितदलयुजि मासे माघनाम्नि प्रधाने ।
व्यधिषत नृपवर्यस्योत्सवं राजतस्त्वै
रवतति हृदयभावाः पूरुषाः साधुवादैः ॥ १६ ॥

(I6). The sujects of H. E. H. The Nizam celebrated, with full affection and amidst congratulation, His Silver Jubilee festival in the month of Magha of the year 1993 of Vikrama Samvat.

subjects, forgetting all kinds of difference enjoy peace! May His Exalted Highness's, enemies perish quickly! May His Exalted Highness obtain great prosperity.

मालिनी छन्द ॥

बुभुजरवनिमेनां यद्यपि प्राज्यभूपाः
प्रथममपि तथापि त्वत्समा नामवंस्ते ।
अतुलितनिजकृत्यैर्भूपतीन्द्र ! त्वया यत्
प्रकृतिजनहितैस्स्वं राज्यमातानि चित्रम् ॥ १२ ॥

(12) Foremost of Indian Princes! though many Kings have ruled over this Kingdom before, yet none of them is a match for you, as by means of your unequalled deeds beneficial to subjects you have made your Kingdom wonderful.

उपजातिच्छन्दः ॥

हिन्दूर्भवेद्वापि मुहम्मदीयः
सिक्खोऽथवा क्रिश्चियनोपि वास्यात् ।
नापश्यदेकोऽप्यसमानभाव
भवत्सुराज्ये नृपवर्य ! रम्ये ॥ १३ ॥

(13) Best of Princes! No subject, Hindu or Mohamedan, Sikh or Christian, finds any inequality in your beautiful good Kingdom.

पृथ्वीछन्दः ॥

नृपस्य बलशालिनः कविशिरोमणेः सम्भृतौ
न सन्ति कति मादृशा भवत एव सेवापराः ।
मम त्वभिमतो भवान् प्रभुरनन्यसाधारणो
रवेः कमलकोटयो न कमलस्य नैको रविः ॥ १४ ॥

(14). Thousands of men of my condition interested in service are not there under the protection of your Exalted Highness, a crest-jewel among poets But I regard you as my uncommon master. The sun has millions of lotuses; but the lotus has got only one sun.

शार्दूल विक्रीडितं छन्दः

दानाद्गौरवमाप्यते मनुभुवेत्युद्घोषितं यद्वचः
तच्छ्रीमद्भिरुदार मूर्तिभिरलं प्राकाशि विद्याचणैः।
का वर्वति कलासु कुशलाः। श्रीमद्भिराप्ता न या
ब्रह्मशौर्नयविद्भिरुज्यचार तैरुस्मानलीखां मिधैः॥ ९ ॥

(9) The saying that man attains to greatness by charity has been well illustrated by your Exalted Highness, an embodied benevolence (and) an expert in various sciences. Expert in arts! is there any art which has not been acquired by you a philosopher, a politician possessed of commendable conduct and bearing the name Osman Ali Khan Bahadur.

द्रुतविलम्बितं छन्दः ॥

चिरमुपैतु समेधनमत्रते
विविधशास्त्रचण! प्रतिमान्वित!
त्रिविधशक्तिसमुत्थमनुत्तमं
बलमथो सुखमात्मजकार्यजम् ॥ १० ॥

(10) Expert in various science! genius! May your matchless strength born of your three-fold Regal power (Majesty, power of good counsel and power of energy) increase! May your happiness resulting from the virtuous deeds of your sons increase for ever.

प्रहर्षिणी छन्दः

राजन्तामभितममा नृपेन्द्रवर्याः
शान्तास्तात् प्रकृतिरपेतभेदभावा!
ध्वंसन्तामरिनिवह अर लभन्तां
श्रीमन्तः समुदयमीश्वर प्रसादात् ॥ ११ ॥

(11) May His Exalted Highness the Nizam shine for many years by the grace of the supreme being! May his

of forces is assiduous in practising the merits of his illustrious father. Walashan Nawab Muazzam Jah Bahadur, who is at the head of various departments, is an expert in composing poetry.

गीति च्छंदः

स्वर्ण क्राति निज़नृपतेः
शासनकालस्य या स्मृतेमर्गिम् ।
आनंयते प्रजाभिः
रजत जयन्तीमुच्यते विबुधैः ॥ ६ ॥

(6) The wise call Silver Jubilee celebrations those very golden deeds of your Exalted Highness reign which are remembered by your subjects.

राजोत्तम ! परमेशो-
देयात्तुभ्यं सुख वयोवृद्धिम् ।
काञ्चनहीरजयन्त्या-
वपि सन्तनुयुः प्रजा मुदा येन ॥ ७ ॥

(7) Foremost of Kings! May the supreme being bless you with happiness and longevity, so that your subjects may celebrate your gold and diamond Jubilees too.

पृथ्वी छन्दः

गुणज्ञ नरपाग्रणीः कविमणे वदान्योत्तर !
त्वदन्य इह भूतले न वरिवर्ति दानी नृपः ।
अतो हरिहरोऽनिशं यदुपतिं वर याचते
करोतु ससुतं युतं सहि भवन्त मुख्यैर्गुणैः ॥ ८ ॥

(8) Most benevolent King! Best of poets! Virtue-appreciater! there is no King so generous as you in the world. So Hari Har beg a boon of the Lord of the Yadavas that He may endow you and your sons with great virtues.

(2) His Exalted Highness the Nizam has been ruling, for the last twenty five years with excellent state policy, over this country containing subjects of various castes and creeds. His subjects devoted to His feet and wellversed in their duty are celebrating properly this Silver Jubilee festival amidst great rejoicings.

शिखरिणी छन्दः ॥

सदा विद्यावृद्धौ विविधसरसां निर्मितिकृते
गृहाणां निर्माणे विनत बहुराजाध्वरचने ।
तथायुर्वेदौको निचयविनिधानादिकृतिषु
विसृष्टा स्सोत्साहं झटिति बहुकोट्योऽत्रभवता ॥ ३ ॥

(3) O King! your Honour has granted constantly, unhesitatingly and enthusiastically crores of rupees for the advancement of Education, for the construction of various reservoirs and buildings, for constructing various broad roads and for the establisment of innumerable hospitals.

महादस्मादन्यो न भवीत महो यो योऽधिकतरो-
ह्यतो भक्त्या देवोपम ! विरचयामः क्षणमिमम् !
चिरं जीव्यात्पौत्रः कविकुलमणे ? ते सजनकः
समृध्यात्सौराज्यं समदृगरयो यान्तु निधनम् ॥ ४ ॥

(4) Impartial Ruler! as there is no festival greater than this Silver Jubilee, we loyally celebrate this festival. God-like-King! Jewel of poets! May your grandson live for a long time with his parents! May your good Government prosper! May your enemies perish.

तथाज़म् जाहा बोभुवाति युवराजा अतिबला-
बलाध्यक्षा ये वै निज पितृगुणाचारकुशलाः ।
मुअज़म् जाहाख्या निपुणमतयः काव्यकृतिषु
द्वितीयास्सत्पुत्रा बहुविध विभागाधिपतयः ॥ ५ ॥

(5) Walashan Prince of Berar Nawab Azam Jah Bahadur, the Heir apparent and the powerful Commander



Princess Nelopher Farhat Begum Saheba.

Congratulatory Address.

श्री:

श्रीमतां हिज़ ऐग्ज़ाल्टेड हाइनैस महाराजाधिराज
सुल्तान-उल्-उलूम आसफ़जाह साबअ़ नव्वाब
मीर उस्मान अलीखां बहादुर महोदयानां
दक्षिण देश बरार प्रदेशाधीश्वराणां रजतजयन्ती-
महोत्सवाभिनन्दन पत्रमिदम् ।

Congratulatory Address to H. E. H. the Nizam Maharajadhiraj Sultan-ul-Uloom Asaf Jah Saba Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, King of the Deccan and Berar, on the occasion of his Silver Jubilee celebrations.

स्रग्धरा छन्दः ॥

ऐश्वर्यं यस्य शक्रप्रतिममनुपमा दानशक्तिर्यदीया
देशे देशे प्रतन्वन्त्यमलमथ यशो यस्य सिद्धाभिलाषाः।
आसफ़्जाहोपनामा जगति नृपवरो विश्वविद्यालयंशो-
ज़ीव्या दन्नप्रदाता स चिरमिनसमो मीर उस्मान् अलीखां ॥१॥

(1) May His Exalted Highness, Asafjah Saba Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur live for a long time in this world, giver of food, patron of the Universities, whose supremacy resembles that of Indra, who resembles the Sun, whose power of charity is matchless and whose spotless fame is spread in all countries by those who get their desires fulfilled at his hands.

शार्दूल विक्रीडितं छन्दः ॥

अब्दाः सम्प्रति पञ्चविंशतिरगुर्भूमण्डलं शासतो
नीत्यैतत्प्रतिवर्णमानवमथो प्रत्येक धर्म प्रजम् ।
श्रद्धालुः प्रकृतिर्नृपेन्द्र पदयोर्विस्तारयत्यञ्जना
जुब्लीसंज्ञमिमं महामहमतो मोदान्विता कार्यवित् ॥ २ ॥

With these recollections in our minds let us unitedly join together in celebrating the fact that our beloved Sovereign has been spared to reign over us for the past twenty five years and in praying to the Almighty that he may still live for many years more to guide our destinies and to promote peace and happiness in our land.

Long live our king the Nizam

M. A. Qayyum Baqi, M. A.
(Osmania).

front room of the King Koti palace where our monarch in ascetic simplicity sits contemplating schemes to place the rich resources of his heart and mind at the service of his country. These twenty five years of glorious light shed from the room have strengthened the manifold bonds of love and earned admiration the whole world over. Men of all ranks, all nationalities and creeds turn upon our sovereign, "He is the most glorious monarch of the Asafia line, the most remarkable man!" comes wholeheartedly from every one of them. I have heard this tribute in sophisticated aristocratic clubs, and in remote cottages tucked away in villages. I have heard it abroad and at home.

For surely of all the monarchs of this country, none has played a part more magnificent, none has contributed more to constructive progress along the quiet paths that lead to happiness at the core of the kingdom than His Exalted Highness. What is the secret of the spell he casts? Just his grand diplomacy, his great love and munificence, his sincere devotion as king, reformer, and patron; his complete understanding of everyday things of life, his great gift of making sympathetic contact, his sincerity, his humanity and his great foresight. Add to that the charming simplicity that is the hall mark of the truly great and the wellwishing and the spirit of even-handed justice.

H. E. H. is a great patron of art and learning and is himself a keen scholar in Arabic, Persian, Hindi and Urdu. He is no mean poet either. His ascetic simplicity, his devotion to work which occupies the best part of his day, his sense of even-handed justice, tolerance, and his wide sympathy and solicitude for his people and everything which belongs to the State have endeared him to his subjects who look upon him as a true embodiment of ideal kingship.

> authorities British and Hindu as well as Muslims, freely acknowledge this provision of a vernacular medium in other Universities of India the first of its kind is of the greatest importance. Its success should facilitate the introduction of the vernacular medium in other universities of India. Educational experts believe that the application of this principle will be of great value to the cultural development of the country as a whole. It will undoubtedly tend to break down the barrier between the educated classes of India who had received their university training through the medium of English and who are therefore able to lack an adequate vocabulary in their own language and those who have received a purely vernacular education," H. M. King George V in his speech at Calcutta in 1912 had said-" And it is my wish too that the homes of my Indian subjects may be brightened and their labour sweetened by the spread of knowledge and all that follows in its train, a higher level of thought, of comfort and of health. It is through education that my wish would be fulfilled."

With identical interest in Education, our Royal Master has through the Osmania University made educational reforms to embody themselves in the Osmania Scholars. As long as the Alma Mater and her sons live, our monarch will remain commemorated.

Now soaring a loft on the wings of fancy in the blue Deccan sky let us fly over the capital where our Sovereign resides, shedding the light of peace, love and culture. Enjoying an aeroplane view of the city with silvery lakes and pearly domes, we fly over an area of about 3000 miles of roads, of improved agriculture, of indigenous industries, a network of railways and bridges, of magnificent buildings, of hospitals, factories, on the treasures of preserved Arts.

This was the occasion which gave birth to the modern politics of Hyderabad. Moreover to assist him in his most responsible task of guiding the destinies of his kingdom and his beloved people he granted the establishment of an Executive Council consisting of seven members each controlling secretariats and departments on the lines of British Indian administration. Such a move was to give a greater fullness to the ambitions of the State toward healthy progress. It enhanced the dignity of the State and enlarged the scope and volume of work for public good. It was a charter of freedom under the Royal Seal. Now the onus lay upon the members to prove their work. Data of such reforms of administrative importance are put into a nutshell by the Times of India.

> "He is associated in the task of legislation by the legislative council, consisting of twenty members, each of whom is elected. The councils' underlying scheme is to extend franchise so as to make itself more representative in character. In 1921, the State took a great stride in separating the judiciory from the Executive, and this independent judicial machinery centres round the High Court governed by a charter from H. E. H. the Nizam and enjoys appellate Jurisdiction."

"Parliaments may come and go. Ministers are born to high places and pass. The throne is fixed and immutable and carries from generation to generation the principles which make the kingdom a marvel to the world," says Sir Stanley Reed. To realise this we must sweeten our memories with the great epoch-making firman which granted the establishment of the Osmania University. Says the Times again:—

> "Good progress has been made with various educational measures including the remarkable and interesting scheme of the Osmania University based on the use of Urdu as the medium of instruction. As many

bound with the iron force of old routine should have felt the need of a waking up—a widening of the intellectual and cultural horizon. Our country was to be dragged into the political arena—when the late Nizam had died before the issue had been settled. What was the new king's attitude to the matter?

A Prince who was in the prime of life and had an impulse to establish a cultural government and to forecast efficient administrative work in consonance with the prestige and traditions of the state, personally took upon himself the task of handling the affairs in his own way. What he first felt was that the country with a lethargic ease and contentment was under the yoke of an old fashioned administration. Having a stereotyped policy and an easy going bureaucracy she was like a brooding dove. There stretched forth the Royal hand in command and for help. All evils of extravagance, were abolished. With the great power to control, the Royal will prevailed. This in spirit was a groundwork upon which a little later was erected a more stable political institution in the form of a Council of State. His Exalted Highness in his eminent Firman explicitly stated the spirit of his action.

" The Government established through a Council has a manifold superiority over one which is under the thumb of a single officer............The legislature being an integral part of the Government should be more useful".

Referring to the past changes introduced in legislature the Royal firman says:

" They seem inadequate according to modern needs. They cannot be expected to fulfill all that I deem essential for the progress and welfare of my beloved people. "

Our Sovereign As the Nucleus of Cultural Light and Reform.

The message asking me to contribute a note on the reforms made by our beloved Sovereign was handed to me as I was first contemplating to write a song on the Silver Jubilee. It was natural enough that the letter should suggest to me, while I was in a musical mood, thoughts of days, twenty five years ago, when I was quite a boy. My immediate lot now lay to descend from a land of dreams to a realm of realities, and give a formal account of the stages by which we have arrived at our present cultural position. Naturally I was not inclined to do so, as I still wished to remain with the muses. To treat my readers with something light, I limit myself to catching in a few glimpses of reforms actually achieved.

Our Royal Master's auspicious Coronation must have beheld the whole city with unrivalled rejoicings and grandeur. What a great concourse of humanity, Muslims, Hindus, Sikhs and Parsees saluting with supreme confidence and praying for the king's long life and prosperity! Surely the pageantry must have been the golden dawn of glory—a piece of good augury for mankind.

Now, in a land where monarchy should be the sole guarantee for all forms of administrative and cultural advance, ascending a throne is a trying ordeal for a prince, and in the case of our king the circumstances must have been critical. There was dawning upon India a political consciousness and under the stress of an international awakening, our land

on the 1st of January 1300 would receive full obsolution. The result was an enormous influx pilgrims to Rome, which stirred the Pope's attention. Nothing was found in the archives, but an old peasant 107 years of age avowed that his father had been similarly benefited a century previously. The bull was then issued, and the pilgrims became even more numerous, to the profit of both clergy and citizens. At the request of the Roman people, which was supported by St. Bridget of Sweden and by Petrarch, clement VI. in 1343 appointed, by the full **Unigenitus Dei filius, (in initials)** that the Jubilee should recur every fifty years instead of every hundred years as had been originally contemplated in the constitution of Boniface, Urban VI., who was badly in need of money, by the full **Salvator noster (in initials)** in 1389 reduced the interval still further to 33 years (the supposed duration of the earthly life of Christ); and Paul II. by the bull **ineffabilis (in initials)** (April 19, 1470) finally fixed it at 25 years.

(Encyclopaedia Britannica)

Abdul Qadir Jilani,
B. A. (Osmania)

the law as to property in slaves, especially as this affected Hebrews who had sold themselves into slavery. It should be noted that these enactments are found only in the latest legal code of the Hexatench. They can only be understood in the light of the previous enactments regarding the sabbatical year.

The book of the covenant enjoined that the land should lie fallow and Hebrew slaves be liberated in the seventh year; Denteromony required also the remission of debts. It is evident that these enactments proved impracticable, and so it became necessary in the later legislation of P., represented in the present form of Lev. XXV., to relegate them to the fiftieth year, the year of Jubilee. This, however, was a purely theoretical development, which never could have been actually carried out. Further, according to Rabbinical tradition the Jubilee years though reckoned were not observed.

The conjecturė of knenen that originally Lev. XXV. 8 Seq; had reference to the seventh year is a highly probable one. This may also be the case with Ezek XI vi, 16-18 (cf. yer. XXIV 14). A later Rabbinical device for evading the provisions of the law was the prosbul (ascribed to Hillel).

Jubilee year:—An institution in the Roman Catholic church, observed every twenty-fifth year, from Christmas to Christmas. During its continance plenary indulgence is obtainable by all the faithful, no condition of their penitently confessing their sins and visiting certain churches a stated number of times, or doing an equivalent amount of meritorious work. The institution dates from the time of Boniface VIII., whose bulk (in initials) **Antiquorum habet fidem** is dated the 22nd of February 1300. According to contemporary statements, a rumour spread through Rome at the close of 1299 that every one visiting St. Peter's



Her Highneess, The Princess, Dureshawar Durdana Begum Saheba,
Princess of Berar.

HISTORY OF THE JUBILEE

BY

ABDUL QADIR JILANI, B. A., (OSMANIA.)

Jubilee................in the Bible the name is applied in the Holiness section of the priestly code of the Hexatench to the observance of every fiftieth year (determined by the lapse of seven seven-year periods) as a year of perfect rest, when there was to be no sowing, nor even gathering of the natural products of the field and the vine.

At the beginning of the Jubilee year the liberation of all Israelitish slaves and the restoration of ancestral possessions was to be proclaimed. Modern schools agree that the name 'Heb. Yobel' signifies "ram" or "ram's horn;" year of jubilee would mean, therefore, the year that is inaugurated by the blowing of the ram's horn.

At the completion of seven sabbaths of years (i. e., 7x7= 49 years) the trumpet of the jubilee is to be sounded through the land on the tenth day of the seventh month, the grand day of Atonement. The fiftieth year thus announced is to be hallowed, i. e., liberty is to be proclaimed every where to every one, and the people are to return "every man unto his possession and unto his family". The conditions of the sabbatical year are repeated as regards the law of real property in relation to the jubilee.

The tendency to impose checks upon the alienation of landed property was exceptionally strong in Israel. The fundamental principle is that the land is a sacred possession belonging to Yahweh, and as such it is not to be alienated from Yahweh's people to whom it was originally assigned. For

A lasting monument to fame
In memory of our Founder's name.

Osmania bade me thus indite
His praise we honour with delight.
O Master of our heart's elation,
Receive our loyal salutation!

Leave all they have, foregathering here;
From Kondapalli to Yadgir
They hasten hither, having heard
The good news of a saving word,-
A royal order that they turn
From things outworn to things being born,
From hidden villages to towns
The world has made its lasting shrines,
Athens, Oxford, Padua,
Cordova, Baghdad, Nishapur,
Cairo, Paris and many more
Cities of poets and divines,
And later haunts of things that are
Beyond the wildest dreams of yore.

And in this caravanserai,
Memorial of your majesty,
Whose weather-beaten rocks have stood
Sentinel to the passing by
Of countless ages, they are free
To linger in those far-off days
Of human glory, free to gaze
Into the future, free to banish
Time and place and all they would,
Till the bounds of being vanish
And they are one with that which was
And is and ever will be, one
With the fulfilment and the cause,
The haven of our union.

And they are free to choose a ground
Of search and struggle, to engage
With hand and eye, that eye and hand
May be the trustier, war to wage
With every foeman of their land,
Seen or hidden, thus to found

Slowly your timely-wise decree,
Your unforgettable firman,
Builds up on aristocracy
Of mind's alertness, richer than
The aristocracies of old.
Towers of understanding rise
Above dead cities: wizard eyes
Of magic insight opening
On Earth's old manuscripts unfold
New meaning; pioneers bring
Tales of the outer regions far
Beyond our fathers' furthest ken;
The inmost depths of Earth and star,
The atom's tiniest denizen,
We calmly measure; tongues unknown
When we were children yield their sense.
The footpaths of our countrymen
Lead everywhere, to every land,
Seek Knowledge was the old command,
When half the world was yet immense;
Seek Wisdom is the cry today
To use that knowledge every way
Ensuring welfare; and we strive,
Whom you have placed, each at his post,
To find the best, and keep alive
The great traditions, thinking most
Of men and minds whose labours lead
To human thought and ready deed.

And those we try to teach, but who
Are teaching us as much as we
Are teaching them, they build for you
A realm of wider sympathy.
From Kopbal, Paithan, Bhir, Armur,
Mahbubabad and Devanur,
The rich, the pitiably poor,

With ever - widening unities
And openings of unseen doors
Leading to new ascendancies
For human spirit to attain
Else life for them were vain.

You saw the dearth that sent the aid
Into your heart; you knew the need
All through your land of man and maid
Whose prayers were rising to be freed
From ignorance and servitude
Unto the hosts of darkness; and
You gave to every eager hand
The key of knowledge, that your folk
May face the world, may yet evoke
Their words of welcome, they who stand
Supreme in learning in each land.

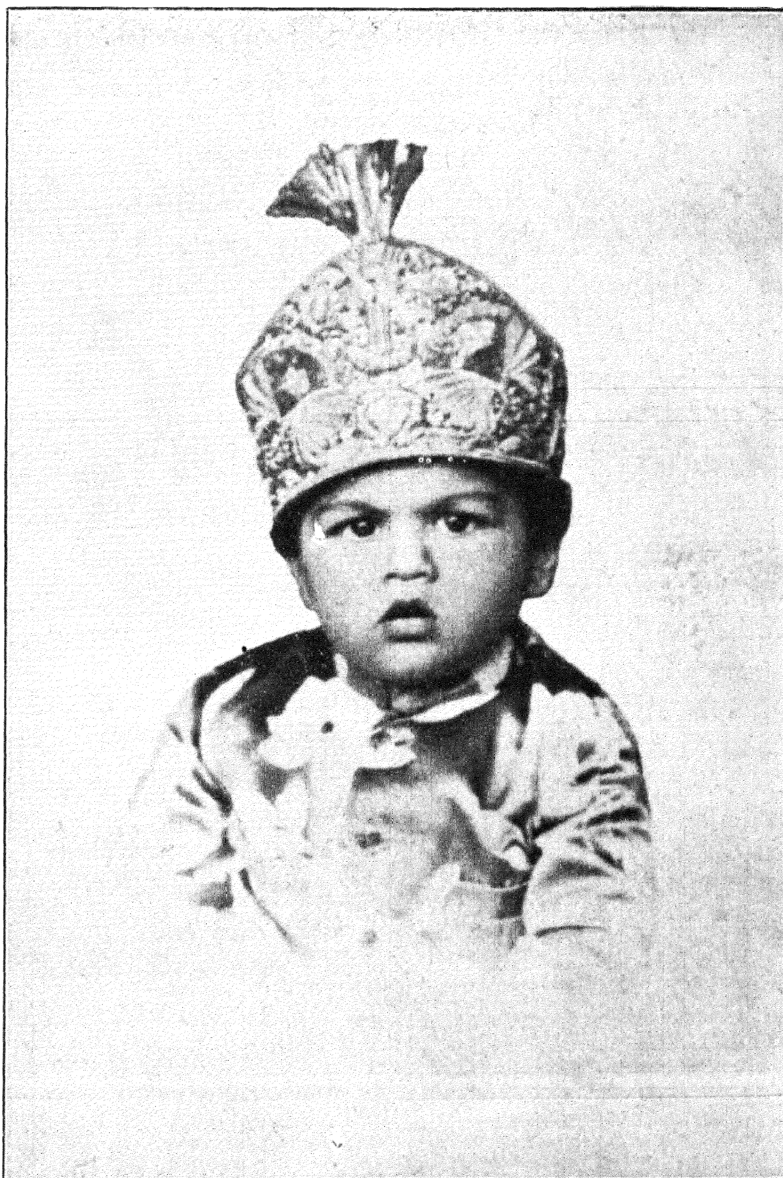
Amid the grandeur they create
To memorise your happy reign,
There are that make your bounty great
Things seldom seen, a noble twain,
Sincerest of simplicity
The show of splendour cannot hide,
Untiring toil that ceaselessly
You give to be your people's guide.

A king today is one who stands
Above his vassals, not in wealth
Nor power not pomp, nor teeming lands,
But in the thoughts that make for health
Of those who serve him, in the love
Of those who love him, in the will
To work their good who countless move
About the duties they fulfil.

SALUTATION
TO THE
ILLUSTRIOUS FOUNDER
OF
THE OSMANIA UNIVERSITY

O Master of our heart's elation,
In gratitude, our salutation!
Osmanians from far and near
Lay their loyal tribute here.

Teachers, taught, ripe years and youth,
Seeking naught but to be wise,
Careful, strict, devoted to
Our high endeavour to be true,
We would not hide the simple truth
With gorgeous language, nor disguise
A natural reverence with a flow
Of borrowed eloquence, instead
Of grave assurance. We would show
Allegiances of heart and head
And loyalties of spirit too,
Unto the Mercy that has wrought
And sent this fortune unto you,
O Master, at whose happy thought
And swift command a noble quest
Was instituted, and your rule
Garlanded with gratitude
Of youth aspiring to the test
Of wisdom and the common good,
Sane living and a life more full
Of worthier duties, dangers, wars,



Lt.-Colonel, Nawab Mukaramjah Bahadur.

to increase and improve the yield of the soil, and exact from the mines the tribute of minerals and ores, precious metals and stones. Engineering skill should harness the power, which streams waste, and slopes of earth dissipate, to productive purposes. Giants of the forest should be attacked, and transformed into articles of human use, and swamps and wildernesses should be rendered fit for human habitation and cultivation. All this can be brought about by such practical work as dynamic minds trained in the University may plan for the benefit of mankind.

This, in brief, is my message not only to the youth of the Osmania University but to the youth of India. The world is your heritage, you may squander it and pass into oblivion, as countless others have done before you, or you may treat it as a sacred trust for generations to come, and when your time comes, leave this world richer, happier, and nobler than you found it.

M. Asif Ali,
Barrister-at-Law.
Kucha Chelan, Delhi.

VIII

My most devoted prayers for the continued good health, ever-increasing happiness and unabated prosperity of the greatest Indian Ruler in India. May God ever shower his choicest blessings on him and may He so guide the inclinations of the students of the Osmania University as to create healthy rivalry among them in taking pride to offer unstinted and loyal services to their Master and Ruler.

Azizuddin Ahmed,
Prime Minister, Datia. C. I.

failed to stimulate creative faculties. For centuries past India's creative genius has hovered between sterlity and stagnation. Like a giant in the grip of senility India has been content with exaggerating the significance of her long-past achievements, which have been left for behind in the march of progress. If there is any lesson which deserves the attention of the youth of our country, it is that there is *no finality* to the progress of thought or achievement. Human mind is dowered with limitless treasures, which lie hidden round some insignificant corner, for any one to discover. Those who venture find them, and advance the whole race of mankind by leagues. Respect for those who have shown the way up to the point we have reached, should not dwarf our capacity to penetrate further and further, or induce in us contentment with what has been attained. If sailors had kept the old highway of the sea, the world would not have been knit together as we find it today. Daring in thought and deed is the threshold of the paradise which mankind is looking for. But every inch of the path by which man is to travel must be carefully marked on the charts. Thousands must drudge before one inch of new ground can be won from the silent, sullen, and soulless custodians of Nature's closely guarded secrets. All this means patient practical work, discipline and organisation. It also demands strength of character, high resolve, and noble ideals. If intellect is wedded to practical work, howsoever paltry and insignificant, your steps will move in the right direction. The resources of our earth are colossal, in fact limitless. Every pinch of dust hides enough energy to move a mountain. It only awaits the skill that will transform it, and harness it to some useful purpose. Let the alumni of the Osmania University translate man's dreams into Reality, and enrich not only the Nizam's kingdom, but India, with the practical results of their intellectual development. Not sterile erudition, but creative scientific training should help

V

I wish every success to the Osmania University. The experiment of imparting University education in a vernacular language is being watched with great interest by educationists all over India. The success of the experiment will depend on the success of the students in life.

Ziauddin Ahmad,
Vice-Chancellor, Muslim University, Aligarh.

VI

I wish your Magazine every success. It is more true today than ever that the pen is stronger than the sword. I whole-heartedly wish that your Magazine may flourish and carry the torch of learning which is the foundation of all universities, and so be it with the Osmania University.

M. A. Jinnah,
Mount Pleasant Road,
Malabar Hill, Bombay.

VII

The Osmania University is a great landmark in the history of India's educational and cultural development, and such of its achievements as have come to my notice should be a matter of legitimate pride to those who have contributed to the success of the University. The Osmania University has made it possible for those whose mother-tongue is Urdu to reach the uttermost confines of the intellectual realm, and to sweep the horizon of cultural possiblities without any waste of energy and time, and without losing the driving power which the difficulties of mastering a foreign language inevitably entail.

I must, however, sound a note of warning. Intellectual and cultural development would be perfectly sterile, if it

Hyderabad has made rapid strides in many directions, but in none so markedly as in education. The institution of the Osmania University is a great experiment, and while I have my own honest doubts about the ultimate effects of the vernacularisation of our higher education, I cannot fail to appreciate the fact that Urdu is an all-India Language, and not merely a provincial one. If vernacularisation of University Education had to begin at all, it stands to reason that it should have begun with a language like Urdu, and that it should have begun in Hyderabad. The experiment has proved a success and one can but hope that it may grow into a fountain from which Urdu and Hindi may emerge as Hindustani: the cultural language of India. It speaks again a great deal for the deep statesmanship of His Exalted Highness and his advisers that while willing to make a new experiment they have not departed from the old moorings, and that the Nizam's College continues to exist to cater to the needs of those of His Exalted Highness's subjects who still feel the need of University Education through the medium of English. My best wishes go to the Osmania University, which in the ages to come will - I am sure - rank as the greatest achievement of the reign of His Exalted Highness, whose honoured name the University will continue to immortalise. May the products of the University both by their intellectual attainment and character ever play a great and worthy part in the evolution of new India.

A. R. Wadia, B. A. (Cantab.),
Bar-at-Law,
Professor of Philosophy,
The University, Mysore.

9th February 1937.

III

The Osmania University was a notable experiment; it is now a living monument of the fine faith in the educational possibilities of the mother-tongue. I visited the University a few years ago as a member of the Inter-University Board, full of misgiving and doubt, sceptical about the value of the work that could be done in Urdu. I attended some lectures, went round the laboratories, and met some students. I who had gone to scoff remained to pray. I have acted as examiner to the Osmania University and have been very favourably impressed with the general standard of attainment. In English, the average Osmania Graduate's command over language is less sure than that of the graduates of other Universities, but he has more originality of thought and greater freshness of out-look.

The founders of the University may justifiably feel proud of it. May its members, the teachers and the students and all others associated with it, continue to prosper exceedingly, and may the enlightened munificence of His Exalted Highness the Nizam enable it to occupy a foremost place among the seats of learning in the land!

Professor Amaranatha Jha, M A.,
University of Allahabad.

IV

I have paid more than one visit to the great State of Hyderabad. I was first there in 1915 and I was there last in I933. It may be said without any exaggeration that this period, synchronising with the reign of His Exalted Highness the Nizam, truly marks an epoch in the history of the great State of Hyderabad. It marks a transition from benevolent mediaevalism to the efficiency and smartness of the present age. During the 25 years of His Exalted Highness's reign

Letters of Congratulation

The Osmania Magazine, and through it the whole University, have been greatly honoured by receiving the following letters from eminent friends in various parts of India, and it is with real pride and gratitude that we publish them here.

I

Osmania University is an outstanding and unique centre of Islamic and Oriental culture and will remain an imperishable monument of His Exalted Highness's beneficent rule. Indians take legitimate pride in this progressive institution which is making a valuable contribution in the sphere of learning and research. I have been asked to send a message for the students of the Osmania University on the auspicious occasion of the Silver Jubilee. I do so with pleasure and it is this:-

Live up to this Divine injunction.

Sir Sikander Hayath Khan.

10th February 1937.

Zafar Ali Khan Road,
Lahore.

II

I have always admired the Osmania University for its bold lead in making an Indian Language the medium of higher education. I congratulate the students on their good fortune in having such a wise patron of learning as their Royal Master.

Rabindranath Tagore

February 8, 1937.

Uttarayan
Santiniketan, Bengal.

II

JESUS, in sooth, God's message to proclaim,
Died on the Cross, the symbol of his name.

He brought the Book by which mankind was taught;
His was the voice with pregnant meaning fraught:

With art supreme revealing wisdom's lore;
In words of grace, the good life has in store.

The Seer hails the marvels of this morn:
The Man has come - he's of no father born:

Life's garden blooms - its mystic blossoms shine:
To OSMAN'S heart a mystery divine!

Translated by
Sir Nizamat Jung Bahadur

Two Poems

by

H. E. H. the Nizam

Lieutenant-General Asaf Jah,
Muzaffar-ul-Mulk Wal Mumalik, Nizam-ul-Mulk,
Nizam-ud-Doula,
Nawab Sir Mir Osman Ali Khan Bahadur, Fateh Jung
G. C. S. I., G. C. B. E.,

I

BLEST in his birth the son of Mariam came,
Heaven's secret - and man's glory at its height!
Auspicious fate! the Magic of his name
Fills votaries' hearts with love, their eyes with light.

Auspicious hour that to the Temple brought
The living Word, the Messenger ordained,
As though the breath of Morn life's garden sought
And Rose and Nightingale in love enchained!

Spring blew its breath into the crystal bowl
To give a brighter colour to the Wine;
And that December for the World's dead soul
Held in the Cup of Life a draught divine!

OSMAN! He came as Prophet and as Guide
To lead the nations on the Righteous Way.
The Faith was firmly planted ere he died,
His destined task completed in his day.

Translated by
Sir Nizamat Jung Bahadur

Editorial

The year 1937 dawned with the news of the Silver Jubilee celebrations of our benevolent and august Ruler. The noted fidelity, passionate love and king-worship of the East demanded that the Jubilee Issue of the Osmania Magazine should be worthy of these festive and majestic ceremonies of our Founder and Benefactor.

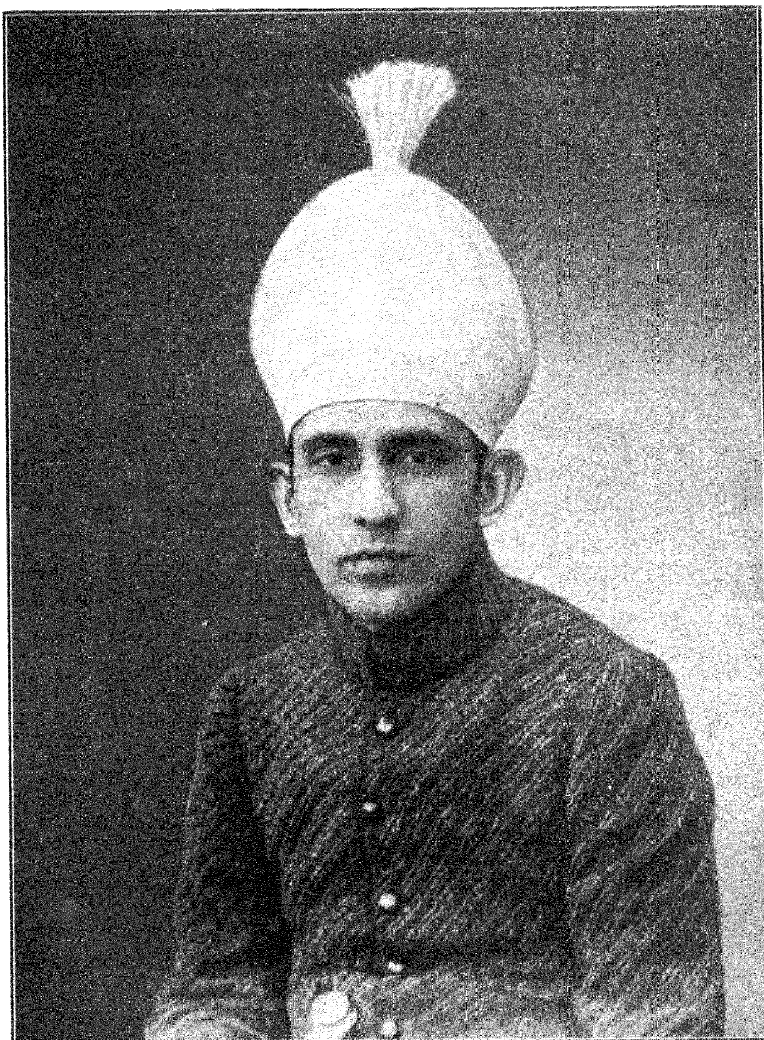
When we took charge of our duties, we had only three weeks for the preparation of this issue, and in this short period there has been much to do in the collection of material, at a time when, on account of the near approach of the annual examinations, only a few students were able to spare time for their magazine.

The special feature of this issue is that, for the very first time in our history, a translation of two of His Exalted Highness the Nizam's highly esteemed Persian poems is being published in our magazine. We are highly grateful for the gracious sanction of His Exalted Highness to publish English translations of his superb poems by Sir Nizamat Jung Bahadur.

Our readers will note that this is the first time that our magazine is publishing a painting. No more appropriate subject could be chosen for this occasion than this conception of the Birth of Ajanta, by a talented local artist. Mr. Qayum has depicted an ancient Indian sculptor sitting on a humble stone seat in the temple, apparently giving the finishing touches to his figure of an oriental water-carrier. Those who have visited those world-renowned caves will not fail to notice how well the artist has captured the atmosphere of the cave, the texture of the rocks, and the play of subdued light on a carved figure.

Editor

CONTENTS



Hon : General Walashan Prince Mozzam Jah Bahadur.

THE OSMANIA MAGAZINE

VOL. X. *Advisory Board.* NOS. 1 & 2.

Annual Subscription.

		Rs.
From Government.	...	12
„ Universities, other Institutions & State Officials	...	8
„ General Subscribers	...	6
„ Old Boys, Aided Societies & Reading Rooms	...	5
„ Present Students, Osmania University	...	4
„ Abroad	Fifteen Shillings.	
„ Old Students, Abroad	Ten Shillings.	
„ Single copy	Two Rupees.	

Note:—Registration & V. P. P. Charges extra.

Can be had of:—

OSMANIA MAGAZINE OFFICE,
OSMANIA UNIVERSITY,
HYDERABAD-DECCAN.

THE OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

THE OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD, (DECCAN).

EDITOR:

SYED MOHMAD AHSAN, B.A., LL.B. (Osmania)

JOINT EDITOR:

R. G. NANDA PURKAR, B.A., (Osmania).

Vol. X Nos. 1 & 2

MARCH 1937

PRINTED AT THE
LAKSHMI PRINTING WORKS,
STATION ROAD, SECUNDERABAD-DN.